حیاتِ ذاکر حسین

پیش لفظ: پروفیسر رشید احمد صدیقی

تالیف

خورشید مصطفیٰ رضوی

مکتبہ برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

اپنی والدہ

محترمہ بیگم صابرہ انیس

(اہلیہ صاحبہ سید انیس الدین احمد رضوی مرحوم)

کی خدمت میں

"عزیزو -! اس نئے ہندوستان کے بنانے کے
کام میں تم سے جہاں تک بن پڑے ہاتھ بٹانا مگر یاد رہے
کہ اگر مزاج میں بے صبری ہے تو تم اس کام کو اچھی طرح
نہیں کرسکتے، یہ بڑا دیر طلب کام ہے۔ اگر طبیعت میں
جلد بازی ہے تو بھی تم کام بگاڑ دوگے کہ یہ بڑا پِتّا مارنے
کا کام ہے۔ اگر جوش میں بہت سا کام کرنے کی عادت ہے
اور اس کے بعد ڈھیلے پڑ جاتے ہو تو بھی شاید یہ کٹھن کام
تم سے نہ بن پڑے گا، اس لیے کہ اس میں عرصے تک ایک سی
محنت اور توجہ درکار ہے۔ اگر ناکامی سے مایوس ہو جاتے
ہو تو اس کام کو نہ چھونا کہ اس میں ناکامیاں ضروری ہیں۔
—— بہت ناکامیاں اور بار بار ناکامیاں —— یہ
کام وہی کرسکتا ہے جسے ہر ناکامی اور زیادہ محنت کرنے پر
اُبھارتی ہو"۔

ذاکر حسین

پیش لفظ

پروفیسر رشید احمد صدیقی

اچھے اور بڑے آدمی ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ان پر اچھی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اور اچھے مصنفین سامنے آتے ہیں۔ ایسی کتابیں اور ایسے مصنف افراد کو نیکوکار، جماعت کو متحد اور صحت مند اور ملک کو ممتاز کرنے اور رکھنے میں بہت ہی معین ہوتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "حیات ذاکر حسین" یہ مقاصد پورے کرتی ہے اس لئے ہماری توجہ اور تہنیت کی بیش از بیش مستحق ہے۔

آج کل ماضی میں تحریف کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ جب حال کو سدھارنے اور مستقبل کو سنوارنے کی توفیق نہیں رہ جاتی تو ناسمجھ یا نالائق، اکثر دونوں، ماضی کو مسخ کرنے میں تسکین تلاش کرتے ہیں۔ ماضی پوری تہذیب کا ترکہ ہوتا ہے۔ اس میں سچی تنبیہہ اور صحیح ترغیب ملتی ہے۔ اس لئے اس کی اس حیثیت کو بگاڑنا شرم اور خطرے کی بات ہے۔

ذاکر صاحب کی اعلیٰ سیرت و شخصیت اور قیمتی خدمات اتنی کھری اور کھلی ہوئی ہیں اور ہم میں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں نے ان کو ہر حال میں اس کثرت سے دیکھا ہے اور دیکھتے رہتے ہیں کہ اُن کے ماضی سے بدگمان ہو کر اپنے ضمیر سے شرمندہ ہونے کے لئے کوئی بھی آسانی سے تیار نہ ہوگا۔ قائم گنج سے قیام راشٹرپتی بھون تک ذاکر صاحب کو ذاکر صاحب بنانے میں جن اسباب و علل کو دخل رہا ہے اُن کا ذکر مستند حوالوں سے اس کتاب میں نہایت ترتیب اور وضاحت سے ملے گا۔ "حیات ذاکر حسین" سے اُن مصنفوں کو خاص طور پر بڑی مدد ملے گی جو ذاکر صاحب پر آیندہ کوئی مطالعہ پیش کرنا چاہیں گے۔

رضوی صاحب ابھی نوعمر ہیں لیکن اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ جس لیاقت سے انھوں نے اسے مرتب کیا ہے وہ معاصر مصنفین کے لیے باعث رشک اور رضوی صاحب کے بزرگوں اور دوستوں کے لئے باعث امتنان ہو تو حیرت نہ ہوگی۔ دعا ہے کہ اس کتاب کے مصنف کو پڑھنے والوں کا وہ اعتبار نصیب ہو جس کی ہر مصنف کو تمنا ہوتی ہے لیکن کم کو میسر آتی ہے۔ ذاکر صاحب خود اس نامۂ اعمال[۵] کی دل آویزی محسوس کریں تو عجب نہیں اور یہ مصنف کے لئے بڑی قیمتی تحسین ہوگی۔

اگلے وقتوں کے جو لوگ ہیں وہ لمبے و نغمہ کو چاہیے جو کہتے ہوں ہمارے آپ کے بارے میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو پہلے اس کی طرف سے اطمینان کر لینے کی

۵؎ نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی   تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

کوشش کرتے ہیں کہ آپ کا خاندان اور اس کی روایات کیا ہیں، کہاں کس سے کتنی اور کیسی تعلیم پائی، کیا خدمات ہیں، کیسے لوگوں کی صحبت اٹھائی اور کن محفلوں کے نکلے ہوئے ہیں وغیرہ۔ کڑی سے کڑی تفتیش کے بعد بھی ان تنقیحات سے جو تصویر بنے گی وہ بڑی دل کش اور پاکیزہ ہوگی۔ یعنی ہو بہو ذاکر صاحب کی۔

ہندوستان کے پچھلے پچاس ساٹھ سال بڑی آزمائش کے گذرے ہیں۔ اتنی بڑی، اتنی عجیب، اتنی پہلو دار اور نتائج و ممکنات سے اس درجہ لبریز تاریخ اتنے مختصر زمانے میں سموئی ہوئی شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس زمانہ میں جو ڈراما اسٹیج ہوا وہ اپنی فضا، پرداخت، اشخاص ڈرامہ، کشاکش کرائسس اور انجام کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے۔ کتنا بڑا ملک، کتنے بے شمار رہنے بسنے والے، کیسے کیسے مسائل، انگریزی حکومت کی گرفت، مغربی افکار کا نفوذ و نفاذ، سائنس اور ٹیکنالوجی کی فتوحات، صنعتی تہذیب کا غلبہ، قدیم و جدید کا تصادم، آزادی کی تحریک، بیک وقت غیر معمولی تعداد میں بے مثل عظیم شخصیتوں کا ظہور و قران جو شاید ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہو، اُن کے اپنے اپنے موقف اور سوچنے اور کام کرنے کے انداز، ہندو مسلم اتحاد پھر افتراق، آزادی کا حصول، ملک کی تقسیم اور اس کے ناگفتنی عواقب کتنے ناگفتنی، ذہن اور زندگی کو یکسر منقلب کردینے والے ان عوامل سے ذاکر صاحب کی جِنیس (Genius) اور شخصیت نے پورے طور پر جلا پائی اور ان کے تعلیمی، اخلاقی اور سماجی منصوبوں میں جلوہ گر

ہونے لگی۔

میرا خیال ہے کہ اس عہد میں شاید ہی کوئی اور مسلم یا غیر مسلم نوجوان ایسا تھا جس کی اعلیٰ تہذیبی صلاحیتوں نیز خاندانی اور نسلی روایات کو نو بیدار ہندوستان کے چیلنج کو قبول کرنے اور ملک و قوم کی ایک سے ایک گراں مایہ شخصیتوں سے براہ راست و مسلسل اکتساب فیض کرنے کا اتنا اور ایسا اتفاق ہوا ہو جتنا کہ ذاکر صاحب کو۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ موصوف کو ان تمام زعماء کا بلاقید ملت و مسلک یکساں اعتماد حاصل رہا جن کا اثر و اقتدار ملک میں مسلّم تھا۔ ملک کو آزاد کرانے کی جو لڑائی لڑی گئی اور جن بڑے آدمیوں نے بڑے سے بڑے آدرشوں کو سامنے رکھ کر لڑی تھی اُس روایت کو فعّال اور فروزاں رکھنے میں ذاکر صاحب کا جو قیمتی رول رہا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ذاکر صاحب جس زمانے میں علی گڈھ کے طالب علم رہے وہ کالج کا عہد زرّیں تھا۔ عہد زرّیں کا ایک خاصّہ یہ بھی ہے کہ وہ دوبارہ نہیں آتا۔ علی گڈھ کا وہ زمانہ آج ویسا ہی شاندار معلوم و محسوس ہوتا ہے جیسا کہ پریکلز، سقراط، سولن، سوفیکلز اور دوسرے مشاہیر و اکابرین کا تھا جن کے حیرت انگیز کارناموں کی شہرت آج بھی اتنی ہی مسلّم و معتبر ہے جتنی پہلے کبھی تھی۔ قدیم یونانیوں کا اعلیٰ اور بامقصد زندگی کا تصور انسان کی مثالی طاقت، خوبصورتی، ذہانت، دلیری، آزادی اور اقدار کا تھا۔ وہ ماورائی طاقتوں یا دیوتاؤں کے اتنے قائل نہ تھے جتنے اپنے ہیرو یا مرد کامل کے۔ علی گڈھ کا وہ عہد یونان نظیر

ہونے کے علاوہ بہت کچھ اور تھا یعنی علی گڑھ تھا۔ یہاں اُس تہذیب کا بھی چلن تھا جہاں انسان کو نیابت الٰہی کی ذمہ داری اور عظمت سونپی گئی تھی جس سے دنیا کو علم کی روشنی اور محبت و مساوات کی برکتیں نصیب ہوئیں۔ ذاکر صاحب کو قریب سے دیکھنے سے علی گڑھ کا یہ امتیاز واضح ہو جائے گا۔

علی گڑھ کی طالب علمی سے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری تک ہر معرکہ کا سامنا کرنے میں ذاکر صاحب نے Initiative (جرأتِ اقدام) ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس اعتماد اور حسنِ تدبّر سے رکھا جو ذاکر صاحب ہی کا حصّہ تھا۔ جس سے وہ اپنے ہی نہیں ہر قبیلے کی آنکھ کا تارا بنے رہے۔ اس کے بعد موصوف بہار کے گورنر، جمہوریہ ہند کے نائب صدر ہوئے اور اب صدر ہیں۔ ابتدائی سفر کی سمت و رفتار، غایت و نہایت، سفر کے ساتھی، بادہ پیمائی کے حوصلے اور آبلہ پائی کے مزے سب بدل گئے۔ نہ وہ "حضر بے برگ و ساماں" نہ وہ "سفر بے سنگ و میل"! پہلے کا Initiative معدوم نہیں تو معطل ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں۔

وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مُہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

رشید احمد صدیقی

ذاکر باغ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۷ مئی ۱۹۶۸ء

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اپریل و مئی ۶۷ء کی بات ہے کہ ہندوستان میں صدر جمہوریہ کے الکشن کا ہنگامہ بپا ہو رہا تھا اور بعض اپوزیشن پارٹیوں کے مخصوص ذہن اور نظریات کی بدولت اس الکشن میں نہ صرف ایک خاص رنگ پیدا ہوا بلکہ اس گہما گہمی نے عام لوگوں کی توجہ پہلے سے کہیں زیادہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کانگریس کے امیدوار یعنی ذاکر صاحب کے مقابلے میں مخالف پارٹیاں صرف کانگریس کو نیچا دکھانے کی فکر میں متفق ہو کر ایک امیدوار کو میدان میں لے آئیں۔ اب کیا تھا، ملک کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا لیڈر ایسا نہ تھا جس نے اُٹھ کر پریس کو اپنی رائے سے نہ نوازا ہو، کوئی معمولی سے معمولی اخبار نہ تھا جس نے صدارت کے الکشن کی ہنگامہ خیزیوں میں حصہ نہ لیا ہو۔ فرقہ وارانہ ذہن رکھنے والی پارٹیوں اور اخبارات

نے تو اُن کی ذات پر گندگی اُچھال کر وہ طوفان اُٹھایا کہ خدا کی پناہ ۔! مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے ذاکر صاحب کی ذات سے اپنے عقیدت مندانہ لگاؤ کی بنا پر ارادہ کیا کہ ایک مختصر کتاب لکھ کر ان کی درخشانہ زندگی، سیرت و کردار اور بے غرض خدمات کا تعارف کراؤں ۔ کتاب کا جو خاکہ ذہن میں تھا اس کے مطابق یہ ایک مختصر سی کتاب ہوتی، کام اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر شروع کر دیا گیا مگر پھر ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ ذاکر صاحب کی سوانح حیات پر اب تک کتابی صورت میں کچھ بھی نہیں لکھا گیا اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی سوانح حیات ایک مکمل اور مبسوط کتابی صورت میں قلم بند کی جائے ۔ جب انکی زندگی کے حالات پر نظر کی تو یہ ضرورت اور بھی شدت سے محسوس ہوئی کہ اہل نظر کے سامنے اس حسین زندگی کے نقوش کو اُجاگر کرنا چاہیئے ۔ جی میں آئی کہ کیوں نہ میں ہی یہ کام کروں اپنی علمی کم مائگی کی وجہ سے ڈرتا تھا کہ میں اس موضوع پر قلم اٹھانے کے قابل کسی طرح بھی نہیں ہوں، مکمل اور مبسوط سوانح حیات کے طور پر کتاب لکھنا بہت بڑا کام ہے مگر اپنے جذبات و احساسات کے ہاتھوں یہ کام شروع کر بیٹھا تو اسے پورا کرنا بھی ضروری ہو گیا ۔ اب میرا مقصد پہلے سے کچھ بدل چکا تھا یعنی پہلے اگر ایک مختصر کتاب ان کی زندگی اور خدمات کے تعارف کے طور پر لکھنا چاہتا تھا تو اب ایک پوری سوانح حیات لکھنے کا خیال در پیش تھا ۔ بہر حال کام شروع کیا، مواد جمع کیا اور اس سلسلے میں متعدد لوگوں سے پھر خود ذاکر صاحب سے ملاقاتیں کیں تو اب اتنا کچھ لکھنے کے لئے ہو گیا کہ اسے سمیٹنا دشوار تھا کیونکہ

بعض دوستوں نے مشورہ دیا اور خود میرا بھی جی یہ چاہا کہ اب جب یہ بیڑا اٹھایا ہی ہے تو کتاب کسی پہلو سے تشنہ نہ رہے اور سبھی کچھ اس کوزے میں آجائے۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال کہ کتاب حد سے آگے نہ بڑھے اور حتی الامکان زبان بھی آسان اور سلیس ہو۔ یہ سب شرائط ذہن میں رکھنا اور پورا کرنا بڑی دیدہ ریزی اور محنت کا کام بن گیا اور بعض موقعوں پر اس کوشش میں بڑی مشکل درپیش ہوئی کہ آسان زبان اور کم سے کم الفاظ میں ساری بات ادا کر دوں، اسی وجہ سے غیر معمولی دیر ہوتی چلی گئی لیکن خدا کا شکر و احسان ہے کہ یہ کام اب آخری منزلوں میں ہے اور میں اس سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ کتاب کوئی علمی و ادبی کارنامہ نہیں ہے۔ علم و ادب کی صفوں میں تو میرا شمار ممکن ہی نہیں۔ یہ صرف میرے دلی احساسات کا پرتو ہے جسے اس کتاب کا روپ ملا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ واقعات اور حالات کو پیش کرتا چلا جاؤں اور اپنے ذہنی رجحانات یا جذبات سے مطلق کام نہ لوں۔ اسی وجہ سے اکثر جگہ تنقیدوں اور اعتراضوں کو بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ الفاظ ضرور میرے ہیں لیکن رائے کہیں شاید ہی میری ہو کیونکہ یہ سب کچھ وہ ہے جو مختلف لوگوں نے ذاکر صاحب کی زندگی پر لکھا یا زبانی گفتگو میں اُن سے قرب رکھنے والے حضرات اور خود اُن سے بات چیت کے بعد اخذ کیا گیا۔

اس دوران میں چند کتابیں اس موضوع پر آئی ہیں۔ انگریزی میں مسٹر

اے۔ جی نورانی اور مسٹر انیس چشتی کی کتابیں گذشتہ سال میں شائع ہوئی ہیں جو اول تو موضوع کے اعتبار سے مختصر ہیں دوسرے سوانح حیات کے مقصد کو پورا نہیں کرتیں اور یہ ضرورت بدستور اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔ چنانچہ پرکاش نرائن جی نے بھی اپنے پیش لفظ میں مسٹر اے۔ جی نورانی کی کتاب پر یہ خیال ظاہر کیا ہے اور "ویک اینڈ ریویو" کے تبصرہ نگار نے بھی بعض پہلوؤں سے تشنہ رہ جانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اردو میں سرے سے کوئی کتاب ہے ہی نہیں سوائے چند مضامین، رشید صاحب کی مختلف تحریروں یا ان کے ایک طویل مضمون کے جو "ذاکر صاحب" کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی چھپا۔ "نذر ذاکر" کے عنوان سے جو اردو اور انگریزی کتابیں ذاکر صاحب کی اکھترویں سال گرہ پر پیش کی گئیں وہ بھی چند مضامین کا مجموعہ ہیں اور ان میں بھی شروع کے ایک یا دو کے علاوہ باقی مضامین بالکل مختلف ہیں

ذاکر صاحب کی زندگی کی داستان دو علمی تحریکوں یعنی جامعہ اور علی گڈھ کی کہانی ہے بلکہ ایک لحاظ سے تو علی گڈھ ہی کہنا چاہیئے کیونکہ جامعہ اس کے سدھار اور اصلاح کی تحریک بھی کہی جاسکتی ہے۔ علی گڈھ تحریک ایک پوری تاریخ اور پس منظر رکھتی ہے۔ اس تحریک کا جو شروع سے ماحول اور نظریہ ہے وہ برابر اس کے کیریکٹر میں جھلکتا نظر آیا اور یہ ہر تحریک کے ساتھ ہوتا ہے۔ جامعہ اور دیوبند کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں ان تحریکوں میں شروع ہی سے قومی رنگ کی جھلک ملتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ علی گڈھ میں نظریات کا دھارا صرف ایک ہی رُخ پر بہتا رہا۔ ۱۹۴۷ئ سے کچھ پہلے

کے دور میں بھی جو یہاں کا بدترین دور تھا اور جس کی وجہ سے علی گڈھ آج تک اپنی پیشانی کا داغ نہ دھو سکا، یہاں کے طلبار اور اسٹاف میں روشن خیال، وسیع النظر اور قومی نقطہ نظر رکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ چند مثالیں خود میرے ذہن میں بھی ہیں جن میں ایک تو مجھ ہی سے تھوڑا بہت تعلق رکھتی ہے اور وہ ہے میرے ایک محترم بزرگ سید محمد ٹونکی صاحب کی۔ میری امّی بتاتی ہیں کہ جب میں پیدا ہوا تو بیگم ٹونکی کے یہاں سے (جو میری والدہ محترمہ کی بچپن کی ساتھی اور عزیز سہیلی ہیں) میرے لئے نہایت شُدھ کھدّر کا جوڑا مع ٹوپی کے آیا تھا اور یہ اُن چند کپڑوں میں سے ایک تھا جو میں نے دنیا میں آنے کے بعد پہلے چند ماہ میں استعمال کئے۔ لیکن جب ان نظریات سے فائدہ اٹھانے کا وقت آیا تو ٹونکی صاحب اس راہ سے مُڑ کر دور جا چکے تھے۔ اگرچہ راہ یہ اُس سے بھی زیادہ دشوار گذار اور پُر از خطر تھی۔ خیالات کے انہی مختلف دھاروں سے تو علی گڈھ کی تاریخ بنی ہے مگر اصول سے وابستگی، عزم کی پختگی اور ارادوں میں اٹل رہنے کا ہنر کوئی ٹونکی صاحب سے سیکھے جنہوں نے ہر موقع پر زبان حال سے اس شعر کی تفسیر پیش کی ہے کہ

اِدھر آ ستم گر ہنر آزمائیں
تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

ان کی ثابت قدمی اور پختگی کی ایک مثال تو حال ہی میں اُس وقت سامنے آئی جب یونیورسٹی میں ونیا بھون کی کتاب "ریلیجس لیڈرز" پر ہنگامہ شروع کیا گیا تھا۔ ٹونکی صاحب اس وقت مسلم یونیورسٹی اسکول کے

ہیڈ ماسٹر تھے، وہیں سے یہ ہنگامہ شروع ہوا اور انھوں نے پوری قوت سے اس ہلڑ بازی کی مخالفت کی جس پر جو کچھ انہیں سہنا اور سننا پڑا وہ سب گوارا کیا اور پھر وہ وقت بھی جلد آیا جب ہنگامہ پسند لوگوں نے دیکھا کہ ٹونکی صاحب جو رائے رکھتے تھے وہی ٹھیک تھی۔ ٹونکی صاحب آج کل ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے ہیں اور اب ظاہر و باطن میں مسٹر نہیں بلکہ "مولانا محمد میاں ٹونکی" نظر آتے ہیں۔ وہ ذاکر صاحب سے بھی بہت قرب رکھتے ہیں اور اب سے نہیں بلکہ اٹاوہ کالج ہی کے زمانے سے۔ کیونکہ وہ خود بھی اسی اسکول میں ذاکر صاحب کے ہم زمانہ رہے ہیں۔ اُنہی کے زمانے (غالباً ۱۸-۱۹۱۷ء) میں ایم اے او کالج میں بھی داخلہ لیا، تحریک خلافت و جامعہ میں بھی حصہ لیا اور بعد میں قیام رہا علی گڈھ میں۔ آپ نے اپنی یادداشت اور ڈائری سے مجھے اس کتاب کے لکھنے میں کافی مدد بہم پہنچائی اور مفید مشورے بھی دیئے۔

ذاکر صاحب کا علی گڈھ میں قیام (بحیثیت وائس چانسلر) جامعہ کے مقابلے میں بہت مختصر ہے مگر اُس سے کہیں زیادہ اہم، نازک اور اختلافی ہے۔ جامعہ کی بنیاد تحریک خلافت کے زمانے میں اس دَور کے قومی راہ نماؤں نے رکھی تھی پھر، اُس کی ایک ڈگر تھی جو ذاکر صاحب نے بنائی اور اسی پر وہ چلتا رہا۔ وہاں ہر بڑا اور چھوٹا ان کا عقیدت مند، پرستار اور وارفتہ وشیدا رہا (اور اب بھی ہے)۔ وہاں وہ ہمت، لگن اور اُتساہ کے ساتھ کام کرتے اور دوسروں کو توفیق عمل دیتے رہے مگر علی گڈھ

کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ تحریک سے نظریاتی اختلاف تو خیر تھا ہی لیکن یہاں تاریخ کی گردشیں اُن زخم خوردہ نظریات کی راہ میں ایک نازک موڑ لے کر آگئی تھیں، اور اس پوری تاریخ کا رُخ پھیر کر راہ کو ہموار کرنا ضروری تھا۔ یہ کام انھوں نے کس طرح انجام دیا، یہ راز تو آگے چل کر ان صفحات پر کھلے گا لیکن ظاہر ہے کہ یہ راہ پہلے سے زیادہ دشوار گذار تھی۔ یہاں قدم قدم پر مخالفت تھی رکاوٹ تھی اور جا و بے جا تنقیدیں۔ سب سے زیادہ مخالفت (جو ابتک نہیں تھمی) شروع ہوئی تھی ۱۹۵۱ء کے ترمیمی ایکٹ پر، جس کی رُو سے مرکزی یونیورسٹیوں کے قوانین پہلی بار انقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوئے میں نے ان صفحات پر ذاکر صاحب کا دفاع نہیں کیا، نہ انھیں بَری کرنا چاہا یہ میرا کام بھی نہیں تھا۔ میں نے صرف مخالف اور موافق دلائل اور نظریات کو یا ان کے جوابات کو جو ذاکر صاحب کی طرف سے دیے گئے جوں کا توں پیش کر دیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مخالف دلائل کوشش کے باوجود مجھے کم ہی مل سکے ہیں۔ حال ہی میں مولانا عبدالماجد دریا بادی نے "صدق" (۱۷ رمئی ۱۹۶۰ء) میں لکھا تھا۔

> "ملت اسلامیہ کا وہ بدترین بدخواہ تھا جس نے ۱۹۵۱ء میں اس دیوارِ آہن میں رخنہ پیدا کر دیا"۔

میں نے یہ دیکھ کر مولانا کو ایک خط ارسال کیا جس میں اُن سے پوچھا کہ اُن کے خیال میں اس ایکٹ سے یونیورسٹی کو کیا نقصانات پہنچے، اس کے کیرکٹر یا کاز میں کہاں کہاں رخنے پیدا ہوئے اور ملت کا وہ "بدترین بدخواہ"

اگر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے تو یہ ملّت کا وہی تو "بد خواہ" ہے جس کی تعریف و توصیف کے گُن آپ کا قلم مئی ۱۹۶۷ء تک گاتا رہا ہے۔ مولانا نے "صدق" (۱۳ مئی ۱۹۶۸ء) میں اس کا بہت ہی مختصر اور مبہم جواب یہ دیا کہ

"اگر یہ قاعدہ بن جاتا ہے کہ مسلم تعلیم میں غیر مسلم بھی دخیل ہوا کریں گے اور کسی صاحب کے خیال میں اس سے ملّت کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچ رہا ہے تو ایسے صاحب سے کچھ عرض کرنے سے معذوری ہے۔ رہا یہ کہ ایسا قاعدہ کس شخص کی تحریک سے بنا تو اب اس شخصی بحث میں پڑنے سے حاصل کچھ بھی نہیں"۔

حالانکہ کچھ عجیب سی ہے یہ معذوری۔ ورنہ کہنا سننا تو مخالفوں ہی سے ہوتا ہے ہم خیالوں سے تو ویسے ہی عرض و معروض بے کار ہے۔

علی گڑھ میں جن مخالفتوں اور دقتوں کا سامنا ذاکر صاحب کو ہوا اور جو رکاوٹیں ان کی راہ میں آئیں وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ کچھ کہنے اور کچھ صرف سمجھنے کی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ مختصر طور پر ان میں سے کچھ حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے اور غالباً یہ پہلا موقعہ ہے کہ یونیورسٹی سے متعلق یہ واقعات روشنی میں آرہے ہیں جو علی گڑھ میں عہد ذاکر کی تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود انہوں نے علی گڑھ میں جو کچھ کیا وہ بھی خدمت، عمل اور ایثار کی ایک انمول کہانی ہے۔ اس پہلو پر اس کتاب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس لئے روشنی ڈالی گئی ہے کہ بعض حلقوں میں اس روشن پہلو کو دھندلکوں میں چھپانے کی کوشش کا مجھے سراغ ملا تھا چنانچہ

اس سلسلہ میں پوری محنت، توجہ اور احتیاطوں کے ساتھ کام کیا گیا۔ زبانی روایتوں پر اکتفا نہ کر کے یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹیں (۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۸ء) دیکھی گئیں اور متعلقہ ریکارڈ کی پوری طرح چھان بین کی گئی (جس کے لئے یونیورسٹی پریس آفس کے رحمت صاحب کا شکر گذار ہوں) اور ساتھ ہی متعدد ذمہ دار واقف کار حضرات سے معلومات حاصل کی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب پر مجھے سب سے زیادہ دل سوزی سے کام کرنا اور کئی بار از سر نو لکھنا پڑا۔

علی گڑھ کے بعد ذاکر صاحب کی زندگی میں ایک اہم موڑ ہے۔ یہاں حرکت، عمل اور خدمت و ایثار کا باب ختم ہوتا ہے۔ اب تک جہد و عمل سے بھرپور یہ زندگی صرف تعلیمی حلقوں اور دانش وروں کے کام آئی تھی، صرف تعلیم کے مسائل ان نگاہوں کا مرکز رہے تھے۔ اب پوری قوم اور سارے دیش کو ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا وقت آیا تھا۔ اس زندگی میں اگر درویشی کی جھلک تھی تو اس میں اندازِ خسروانہ کی جلوہ گری۔ چنانچہ بہار کی گورنرشپ اور نائب صدارت کے دس سالہ دور میں جامعہ اور علی گڑھ کے علمی میدانوں کی دل سوزیاں نظر نہ آئیں گی۔ ویسے بھی یہ میدان ہی دوسرا تھا اور یہاں کام ہی کیا تھا اُن جگرداریوں کا۔ دیکھنا صرف یہ چاہئے کہ انھوں نے ان کاموں کو کس طرح انجام دیا جو قوم و ملک نے ان کے سپرد کئے تھے۔

ان کی صدارت کا الیکشن چونکہ تاریخ ہند کا ایک اہم باب قرار پائے گا اس لئے اس پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر صدارت کا دور آتا

ہے اور یہ دور عہد حاضر ہے، ابھی تاریخ بن کر نہیں آیا۔ اس پر تو بعد میں ہی کچھ لکھا جاسکے گا۔ ہاں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے انتخاب کا اصل مقصد ہر طرح پورا ہوا اور وہ تھا ہندوستان کے سیکولرازم کو دنیا میں اُجاگر کرنا، چنانچہ اندر جو کچھ بھی ہو، باہر ہندوستان کا سیکولرازم ضرور روشن ہوا جو پنڈت نہرو کی موت کے بعد ناعاقبت اندیش اور ہلکی قیادت کے ہاتھوں دُھندلا پڑ گیا تھا۔

ذاکر صاحب پر سب سے زیادہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے اور اُس وقت سے لکھا ہے جب یہ دونوں ۱۹۱۸-۱۹ء میں بی۔ اے یا ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے رشید صاحب نے ابتدا ہی سے وہ نقوش اُن کی سیرت میں پڑھ لیے تھے جن کو اس ملک کے لئے مثال بنا کر اپنی تحریروں میں اُنہیں پیش کرنا تھا۔ ذاکر صاحب کی یہ انتہائی خوش نصیبی ہے کہ اُنھیں رشید صاحب کا سا سچّا اور مخلص دوست ملا جس نے اپنی تحریر کے ذریعے ان کی ہر ادا اور ہر انداز میں سیرت و کردار کے روشن پہلو ہزار رنگ سے نمایاں کیے اور ان کے ہر عمل کو زندہ جاوید کر دیا۔ غالباً اس کتاب کے پیش لفظ میں پہلی بار اُن کی تحریروں کا یہ رُخ سامنے آرہا ہے جس میں اُنھوں نے غایت ونہایت اور سمت و رفتار بدلنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالبؔ کا سہارا لے کر ذاکر صاحب سے کچھ کہا ہے۔ یہ بہرحال ایک دیرینہ ہمدم، پُرانے دوست اور مخلص ساتھی کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہے لیکن اہل دانش

کے لیئے ایک قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس سے پہلی تحریر جو اُن کے قلم سے نکلی وہ تقریباً سال بھر پہلے کا ایک مضمون ہے جو " نذرِ ذاکر " میں " موجِ گل سے چراغاں ہے گذر گاہِ خیال " کے عنوان سے شامل ہے اور جس کے آخر میں اُنہوں نے لکھا ہے :

" دیکھنا یہ ہے کہ اب کس کوہِ ندا کی آواز پر وہ کدھر اور کہاں جاتے ہیں ۔ "

ان دونوں تحریروں میں جو کچھ فرق ہے وہ گویا انہی چند ماہ کا ہے ، نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد ۔ یہ فرق آخر کیوں ہے ؟ " نذرِ ذاکر " والے مضمون کے وقت یہ امید کی کیفیت اور چند ماہ بعد قطعی فیصلہ آخر کن حالات کا آئینہ دار ہے یہ غور و فکر کا ایک اہم موضوع ہے ، خصوصاً اس لیئے بھی کہ یہ الفاظ کسی اور کے نہیں ، رشید صاحب کے قلم سے نکلے ہیں ۔

اس کتاب کی تیاری میں مجھے جن حضرات سے مدد ملی اور جو مشکلیں درپیش ہوئیں ان کا آخر میں تذکرہ ضروری ہے تاکہ کتاب جن مراحل سے گذری ان کا ایک ہلکا سا خاکہ ذہن میں آسکے ۔ سب سے پہلے تو خود ذاکر صاحب کا شکریہ مجھے ادا کرنا ہے جنہوں نے میرے اصرار پر اپنی مصروفیتوں میں نہ صرف میرا دخل انداز ہونا گوارا کیا بلکہ میرے سوالات کا جواب بھی دیا اور اکثر موقعوں پر رہنمائی کی ۔ پہلی بار میں اُن سے ۱۴ مارچ ۱۹۶۵ء کو ملا تھا ۔ دوران گفتگو میں جب اپنا مقصد میں نے ظاہر کیا تو کہنے لگے " میری کیا سوانح حیات آپ لکھیں گے ۔ میری تو کوئی سوانح حیات ہی نہیں ہے ۔ عمر کے ستر سال پہنچے

یونہی گذارتا چلا آیا ہوں اور باقی بھی اسی طرح گذار دوں گا۔ میں تو اپنے بارے میں کچھ جانتا نہیں۔ آپ کو مواد کہاں سے ملے گا"۔ میں نے عرض کیا "مواد تو میں جمع کر چکا۔ رشید صاحب نے اُس پر پیش لفظ بھی لکھنا منظور فرما لیا ہے آپ سے صرف چند موقعوں پر کچھ پوچھنا چاہتا ہوں" ہنسکر بولے "رشید صاحب تو اُن لکھنے والوں میں ہیں جو بغیر مواد کے بھی لکھ ڈالتے ہیں اور میں تو بس ان کے ہاتھ ایک بنا بنایا موضوع آگیا ہوں۔"

میں بے حد شکر گزار ہوں کرنل بشیر حسین صاحب زیدی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کا جنھوں نے مجھے تفصیلی گفت گو کے لیے وقت دیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا کہ اُنھوں نے نہ صرف پیش لفظ لکھ کر اس کتاب کو قابلِ ناز کیا بلکہ زبانی گفتگو کا بھی دو بار موقعہ عنایت فرمایا۔ آپ کے علاوہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، برادر محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر سید بشیر الدین (لائبریرین مسلم یونیورسٹی و سابق لائبریرین دہلی یونیورسٹی)، پنڈت سُندر لال جی نے بھی اس سلسلے میں چند ضروری معلومات اور مختلف پہلوؤں پر بات چیت کا موقعہ دیکر ممنون کیا۔ جامعہ ملیہ کی لائبریری میں مجھے مواد فراہم کرنے اور وہاں بعض حضرات سے جن میں ذاکر صاحب کے دیرینہ خادم مسٹر منظور احمد اور بتو خاں وغیرہ بھی شامل ہیں، معلومات حاصل کرنے میں جناب نظر برنی نے اپنا پورا تعاون پیش کیا۔ علی گڈھ یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی بعض دوستوں نے چند ضروری چیزیں فراہم کیں اور یونیورسٹی بربسر آفس کے رحمت صاحب نے سالانہ رپوٹیں اور ریکارڈ وغیرہ دیکھنے کا موقعہ دیا۔

میرے محترم کرم فرما جناب مغیث الدین فریدی (اُستاذ شعبۂ اُردو دھلی یونیورسٹی) نے اپنا بہت سا وقت اس کتاب کی نذر کیا، اپنے مشوروں سے مجھے نوازا اور تاریخ کہنے میں جو کمال اُنھیں حاصل ہے وہ بھی اپنے قطعۂ تاریخ میں پیش فرمایا۔ میرے چھوٹے بھائی عامر مصطفٰے نے انگریزی ترجمے کے کام میں مجھے مدد دی۔ دہلی یونیورسٹی لائبریری کے جن دوستوں نے اس کتاب میں پوری طرح مدد دی اُن میں مسٹر جنگ بہادر کھنہ قابل ذکر ہیں جنہوں نے اس کتاب کے ہندی ایڈیشن کو ضروری سمجھتے ہوئے اس کے لیے کوشش کی۔ ان کے علاوہ مسٹر رمیش چندر چھبر نے بعض اہم کتابیں میرے لیے بروقت فراہم کیں۔ چھبر صاحب خود بھی اسی قسم کا ایک کام کر رہے ہیں یعنی ذاکر صاحب کی تقریروں اور خطبوں کا اُردو ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میرے عزیز دوست رنجیت سنگھ سچدیو نے ہندی ترجمہ کے کام میں مدد دی۔ سید مرتضیٰ حسین صاحب بلگرامی نے علی گڑھ سے متعلق مواد وغیرہ جمع کرنے میں بڑا سہارا دیا، یہ کام ان کی مدد کے بغیر سخت دشوار ہو جاتا آپ ہی نے مجھے ذاکر صاحب کا یہ خط عنایت کیا جس کا فوٹو اس کتاب میں دیا جا رہا ہے اور جس میں اُنھوں نے اپنا کچھ حال اپنے قلم سے لکھا ہے۔ میں اس کرم فرمائی کے لیے بلگرامی صاحب کا بڑا شکر گذار ہوں۔

مجھے ذاکر صاحب کے زمانے میں علی گڑھ میں زیر تعلیم رہنے کی سعادت حاصل ہے چنانچہ اس دور کا حال لکھنے میں میں نے اپنی ذاتی ڈائری سے بھی مدد لی ہے اور اپنے ہم زمانہ ساتھیوں اور کچھ بعد میں آنے والے دوستوں کے خیالات اور تاثرات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اِن حضرات میں خصوصی طور

پر میرے کرم فرما اور دوست ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مجھے بڑی قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں ۔

سپرو ہاؤس (نئی دہلی) کی لائبریری کے بھی بعض ساتھیوں نے مجھے ضروری مواد فراہم کیا دنیا کے مختلف ممالک کے اخبارات نے، جو کچھ ذاکر صاحب پر لکھا ہے اس کے اکثر تراشے یہیں سے فراہم ہوئے اور اکثر مضامین بیلو گرافی میں کام آئے ۔

خیال تھا کہ آخری باب ' سیرت و کردار ' ذرا تفصیل کے ساتھ یکسوئی سے لکھا جائے گا اور لکھا بھی گیا مگر وقت آیا تو اُسی باب کو ملتوی کرنے کا ارادہ کرنا پڑا لیکن بعد میں دل پر جبر کر کے بہت کچھ کاٹ چھانٹ اور مختصر کرنے کے بعد شامل کرنے کا فیصلہ کیا بعض مجبوریوں کے تحت اسی طرح اشاعت کے لیے دیا جا رہا ہے اور اس خیال سے دل کو بہلا لیا گیا ہے کہ اگر آئندہ کبھی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پیش آئی تو اس باب کو مرضی کے مطابق ضروری اضافہ و ترتیب کے ساتھ ٹھیک کیا جا سکے گا ۔

آخر میں جناب مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے علمی ذوق و انہماک کو داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا جنھوں نے موجودہ غیر مطابق ماحول اور دل شکن حالات میں ایسی ایسی بلند پایہ تحقیقی کتابیں شایع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے کہ ان میں اکثر تو ایک محدود طبقے کے علمی و دینی ذوق کی تکمیل اور معلومات کا سامان فراہم کرتی ہیں اور ان کے لیے مالی فائدے کا خیال کبھی خواب میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔ پھر یہ کہ اُن کو ساتھی بھی کیسے پُرخلوص اور کتنے دیانت دار میسر آئے ہیں، اس کا

اندازہ مجھے اس کتاب کی اشاعت کے دوران میں ہوا۔ "برہان" کے پبلشر حکیم مولوی محمد ظفر صاحب کو میں نے جس طرح بیماری اور ناتوانی میں بھی اپنے کاموں کے لیے مستعد اور منہمک دیکھا اس کا مجھ پر بڑا اثر ہے۔

محترم مغیث الدین صاحب فریدی نے جن کا میں اوپر تذکرہ کر چکا ہوں اس کتاب کے لیے خاص توجہ اور تعاون فرمایا اور یہ تاریخ اشاعت بھی برآمد کی ہے:

اک مُرقّعِ حیاتِ ذاکر کا — آئے خورشید مصطفیٰ لے کر
اس کی تاریخ ہو نہیں سکتی — "ذکرِ ذاکر حسین" سے بہتر

۱۹۶۹ء

اس کتاب کی کتابت کا سہرا حافظ محمد یونس صاحب صدیقی مرغوب رقم کے سر ہے جنہوں نے بڑی محنت اور توجہ سے یہ کام کیا ہے مگر ایک بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ کتابت کا زیادہ تر کام رمضان میں مکمل ہوا ہے جو ہجری سن کے لحاظ سے ذاکر صاحب کی پیدائش کا مہینہ ہے اور ہوا بھی کہاں ہے ـــــ ریاست حیدر آباد (آندھرا پردیش) کی حدود میں، جو اُن کی جائے پیدائش ہے۔ چھپ رہی ہے یہ کتاب دہلی سے جہاں زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے گذارا ہے اور اہلِ نظر کے سامنے آرہی ہے ۸ر فروری ۱۹۶۹ء کو یعنی ان کی بہترویں (۷۲) سال گرہ کے موقع پر۔

آخری حصے یعنی کتابیات (ببلوگرافی) بنانے میں مسٹر انیس چشتی

اور اے ۔ جی نورانی کی کتابوں کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری
کی مرتب کردہ انگریزی ببلوگرافی اور "جامعہ" کے فائلوں
وغیرہ سے مدد لی گئی ہے ۔

خورشید مصطفیٰ رضوی

علی جان منزل امروہہ

۲۰ جنوری ۶۹ء

ترتیب

باب ۔ ۷

باب ۱

ابتدائی دور

آبائی وطن | یوپی میں ضلع فرخ آباد بہادر پٹھانوں کی مشہور و معروف بستی ہے جہاں خیبر اور کوہاٹ وغیرہ کے جنگ جو پٹھان قبیلے اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع میں آباد ہوئے۔ یہ علاقے پہلے سے بھی پٹھان آبادیوں کے مرکز تھے۔ یہاں سب سے پہلے سلطان غیاث الدین بلبن نے (۱۲۶۶ء - ۱۲۸۷ء) پٹیالی اور کمپل (ضلع ایٹہ اور فرخ آباد وغیرہ) میں افغانوں کی بستیاں آباد کی تھیں جو گنگا کے کنارے کنارے کمپل سے عطا پور تک پھیل گئی تھیں اور مغلوں سے پہلے ہی رفتہ رفتہ یہ افغانی قبیلوں کا گڑھ بن گیا تھا[1]

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا ہے کہ کمپل وہی مقام ہے جس کا ذکر مہابھارت میں

اس علاقے میں بنگش قبیلے کے ایک نوجوان محمد خاں نے بہادری اور جنگجوئی میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اس کی شہرت سنکر فرخ سیر نے اُسے تخت نشینی کی جنگ میں مدد کے لیے بلوایا۔ محمد خاں بنگش بارہ ہزار آدمی لے کر گیا اور آگرے کے قریب اس خوں ریز جنگ میں پٹھانوں نے اپنے نامور اجداد کی شان دکھادی۔ فرخ سیر فتح پاکر تخت پر بیٹھا تو محمد خاں کو نواب کا خطاب اور چار ہزاری منصب اور جاگیر عطا کی۔ محمد خاں بنگش نے ۱۷۱۳ء میں اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج اور فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد بسایا[1]۔ اس کے بعد پندرہ بیس سال تک سرحدی پٹھانوں کی آبادی کا سلسلہ جاری رہا۔ جن میں خیبر اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵)

ملتا ہے۔ یہ پانچال خاندان کا پایۂ تخت تھا اور راجہ دروپد یہاں حکمراں تھا۔ دروپدی کے سوئمبر کی تقریب یہیں منائی گئی تھی۔ قدیم تاریخ ہند میں یہ مقام خاص اہمیت رکھتا ہے مگر اب ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے۔ یہ ضلع فرخ آباد میں واقع ہے۔ ("یادوں کی دنیا" ۱۴-۷) یہ حالات زیادہ تر 'یادوں کی دنیا' اور امپیریل گزیٹر سے لیے گئے ہیں۔

[1] محمد خاں بنگش ایک زمانے میں الہ آباد اور مالوے کا گورنر بھی رہا۔ ۱۷۴۳ء یعنی اس کی موت تک موجودہ ضلع فرخ آباد کا زیادہ حصہ اس کے قبضہ میں تھا۔ مگر بعد میں اس کا بیٹا قائم خاں ایک جنگ میں بدایوں کے قریب مارا گیا (۱۷۴۹ء) اور فرخ آباد کو صفدر جنگ نے اپنی سلطنت (اودھ) میں ملا لیا لیکن محمد خاں کے دوسرے بیٹے احمد خاں بنگش نے اگلے ہی سال پھر واپس لے لیا تو صفدر جنگ نے مرہٹوں کو مداخلت کیلئے بلایا جنہوں نے احمد خاں کو فتح گڈھ کے قلعہ میں گھیر لیا، اسکو مجبوراً ہمالیہ کے دامن میں پناہ لینا پڑی اور ۱۷۵۲ء میں اپنے آدھے علاقے کو مرہٹوں کی (باقی اگلے صفحہ پر پڑھیے)

کوہاٹ سے آنیوالے آفریدی پٹھانوں نے قائم گنج میں اپنے محلے بسائے (۱۷۱۵ء) یہاں ان جنگجو پٹھان قبیلوں کی کثیر آبادی ہے جو اپنی سپاہیانہ آن بان کے لیے مشہور رہے ہیں اور آج تین صدی بعد بھی اپنے بزرگوں کی شجاعت وحمیت کے ورثے دار ہیں۔ ہاں، اکثر پرانی روایات اور زبان پشتو چھوڑ چکے ہیں۔ قائم گنج کا ایک گاؤں پتورہ بھی ہے، یہی ذاکر صاحب کے بزرگوں کا وطن ہے اور اسی کے ایک محلے مول خیل میں ان کا آبائی مکان ہے

خاندان

کوہاٹ کے آفریدی قبیلوں میں، جو محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں قائم گنج آئے حسین خاں بھی تھے جو اپنے بڑے بھائی حسن خاں کے ہمراہ لگ بھگ ۱۷۱۵ء میں یہاں آئے۔ حسین خاں یہاں آنے سے پہلے بچوں کی تعلیم وتربیت کے فرائض انجام دیتے تھے اور اپنے علم وفضل کی بنا پر 'مدہ آخون' یعنی بڑے استاد کہلاتے تھے۔ یہاں آکر بھی انہوں نے وہی معلمی

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۳۶)

نذر کرنے کی شرط پر واپس آسکا۔ غالباً اسی وقت سے وہ مرہٹوں کا دشمن ہوگیا۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی کو ۱۷۶۱ء میں پوری طاقت سے امداد دی اور کھوئے ہوئے علاقے پھر واپس لے لیئے نواب اودھ (شجاع الدولہ) نے پھر اس پر دست درازی کرنا چاہی لیکن احمد خاں کافی طاقت ور تھا۔ ۱۷۸۰ء کے بعد سے یہاں برطانوی رزیڈنٹ رہنے لگا اور آخر کار ۱۸۰۲ء میں نواب فرخ آباد خود مختاری سے محروم کر دیا گیا۔ بغاوت ۱۸۵۷ء کے دوران میں نواب کو باغیوں نے پھر تخت پر بٹھایا اور اس نے دسمبر ۱۸۵۷ء تک حکومت کی۔ ۲۰ر جنوری ۱۸۵۸ء کو فتح گڈھ پر انگریزی قبضے کے بعد وہ شہزادہ فیروز وغیرہ کے ساتھ بریلی چلا گیا۔

(امپریل گزیٹر آف انڈیا، جلد ۱۴)

کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ ایک نیک دل صوفی تھے۔ پٹھان اُن کی بڑی عزت کرتے اور اکثر نے اُن سے بیعت بھی کی چنانچہ آج بھی ان کے مزار پر جو قائم گنج کے قدیم قبرستان نندو خاں میں ہے عوام عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ ؎۱

ملہ آخون حسین خاں کے بیٹے احمد حسین خاں اور ان کے بیٹے محمد حسین خاں ہوئے جنہوں نے عام پٹھانوں کی طرح تلوار سنبھالی، سپہ گری کو پیشہ بنایا اور کھیتی باڑی کا مشغلہ اختیار کیا۔ اُن کی عمر کا بڑا حصہ رجواڑوں میں گزرا۔ محمد حسین خاں کے بیٹے غلام حسین خاں (عرف جھمن خاں) ہوئے جو ذاکر صاحب کے دادا تھے۔

غلام حسین خاں

غلام حسین خاں نے دکنی کنٹن جنٹ میں فوجی ملازمت کی۔ وہ افسر الملک کے ساتھیوں میں تھے جنہوں نے میر محبوب علی (نظام دکن) کے عہد میں بڑی ترقی کی لیکن غلام حسین خاں آزاد طبیعت انسان تھے، فوج میں تو آن بان سے دن گزار دیئے مگر درباری زندگی گوارا نہ تھی لہٰذا حیدر آباد میں رکنے کو تیار نہ ہوئے اور قائم گنج چلے آئے۔ وہ بڑے جری باوقار اور باہمت تھے۔ مزاجاً سخت مگر رحم دل، امیروں کے سامنے مغرور اور غریبوں کے آگے سراپا عجز و نیاز۔ درویش فقیروں کے بڑے عقیدت مند تھے خصوصاً دو بزرگوں کرم علی شاہ اور بنس بہاری سے عقیدت رکھتے تھے۔ بنس بہاری کا مسلک کبیر داس کی طرح صلح کل تھا۔ وہ بت پرستی اور ذات پات کو نہ مانتے، مسلمانوں کے ساتھ رہتے سہتے اور پٹھانوں میں بڑے مقبول تھے۔

؎۱ یادوں کی دنیا: ۲۱

غلام حسین خاں کی شادی موسیٰ خیل[1] میں ہوئی، شادی کے بعد وہ شکل خیل سے موسیٰ خیل یعنی اپنی سسرال کے گھر میں آگئے اور یہیں رہے۔ شکار کے شوقین تھے ایک بار شیر سے مقابلہ ہو گیا تو تلوار سے اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ اُن کے دو لڑکے عطا حسین اور فدا حسین ہوئے، عطا حسین فوج میں رسالدار تھے۔ انہوں نے کوئی اولاد نہ چھوڑی۔

فدا حسین خاں

چھوٹے بیٹے فدا حسین خاں جو ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے بیس سال کی عمر میں کچھ روپیہ لے کر تجارت کی غرض سے حیدرآباد سدھارے اور محلہ بیگم بازار میں مراد آبادی برتنوں کا کام شروع کیا۔ پڑھنے لکھنے کا بھی شوق تھا جس کی تکمیل کا سامان اس طرح ہو گیا کہ پڑوس کے ایک وکیل صاحب سے قانون کی کتابیں لے آتے اور خالی وقت میں پڑھتے۔ جب ان میں دل لگا تو اور کتابیں پڑھیں اور پھر احباب کے مشورے پر قانون کا امتحان دے ڈالا جس میں اوّل آئے۔ اب تجارت ختم کر کے ۱۸۹۰ء سے اورنگ آباد میں وکالت شروع کر دی، ساتھ ہی ایک رسالہ "آئین دکن" بھی نکالنا شروع کیا جس میں حیدرآباد ہائی کورٹ کے نظائر شائع ہوتے تھے۔ وکالت بھی کافی چمکی اور رسالہ بھی قانونی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا اور اسی نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ بعض دوستوں کی رائے پر وہ ۱۸۹۳ء میں حیدرآباد

---

[1] سرحدی افغانوں کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم کی اکائی "خیل" کہلاتی ہے۔ قائم گنج کے کچھ محلوں کے نام بھی اسی بنیاد پر ہیں۔

آگئے اور جس جگہ (بیگم بازار) پہلے تجارت شروع کی تھی اب وہاں دفتر بنایا۔ کچھ ہی عرصے بعد اسی جگہ زمین خرید کر مکان بنوایا جس میں اخبار کا پریس، اپنا دفتر، کتب خانہ اور رہائش گاہ سب ہی کچھ آگیا۔

فدا حسین خاں کی شادی قائم گنج ہی میں کلاں خیل کے ساکن بنی داد خاں کی چھوٹی لڑکی نازنین بیگم سے ہوئی۔ بنی داد خاں جن کا پیشہ حسب دستور سپہ گری تھا، بڑے حلیم اور بُردبار تھے کبھی کسی کا دل نہیں دُکھایا، جھگڑے فساد سے ہمیشہ دُور رہے اور کبھی غصہ نہیں کیا۔ نازنین بیگم سیرت وصورت میں اپنے باپ سے بہت ملتی جلتی تھیں، طبیعتاً سادہ و بُردبار، نیک دل اور خدا شناس، متواضع اور ملنسار، کسی کی بُرائی میں نہ بھلائی میں۔ طبیعت اور سیرت کی اکثر خاصیتیں اس طرح میاں اور بیوی دونوں میں یکساں اور یکجا ہوگئیں۔

فدا حسین خاں کے سات لڑکے ہوئے :

مظفر حسین - عابد حسین - ذاکر حسین - زاہد حسین - یوسف حسین - جعفر حسین اور محمود حسین۔ [۱]

---

[۱] ان میں مظفر حسین خاں نے جو حیدرآباد میں اسپیشل مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے صرف تیس سال عمر پائی۔ دو لڑکے امتیاز حسین، مسعود حسین اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے امتیاز حسین خاں عثمانیہ یونیورسٹی میں استاد تھے ۱۹۶۶ء میں انتقال کیا۔ مسعود حسین خاں کچھ دن علی گڈھ یونیورسٹی میں رہے آج کل عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ڈپارٹمنٹ کے صدر ہیں۔ عابد حسین اور زاہد حسین کا علی گڈھ میں دوران تعلیم میں انتقال ہوا۔ جعفر حسین بھی کم عمری میں سدھارے (باقی اگلے صفحہ پر)

اس تمام خاندان کا نقشہ یوں ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

حسن خاں ـــــ حسین خاں مدہ آخون

|

احمد حسین

|

محمد حسین

|

غلام حسین

عطا حسین ‏ ‏ ‏ ‏ فدا حسین

مظفر حسین، عابد حسین، ذاکر حسین، زاہد حسین، یوسف حسین، جعفر حسین، محمود حسین

خدیجہ بیگم ‏ امتیاز حسین ‏ مسعود حسین ‏ ‏ صفیہ ‏ سعیدہ ‏ ‏ راشدہ ‏ اجمل حسین ‏ مہرو ‏ ‏ انور حسین

ناظمہ ‏ عاصمہ ‏ عالیہ ‏ آصفیہ

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۴۰)

یوسف حسین خاں (جن کی متعدد تصانیف "روحِ اقبال"، "اردو غزل" اور تازہ ترین "یادوں کی دنیا" وغیرہ کافی معروف ہیں) عثمانیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر رہے۔ آج کل مرکزی حکومت کی ایک تعلیمی اسکیم کے سلسلے میں شملے میں ہیں محمود حسین خاں نے جرمنی سے تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ (باقی اگلے صفحے پر)

پیدائش سب بھائیوں میں بڑے یعنی مظفر حسین خاں (پیدائش ۱۸۹۳ء) کے علاوہ جو قائم گنج میں پیدا ہوئے، باقی سب حیدرآباد کی پیدائش ہیں۔ عمر کے لحاظ سے ذاکر صاحب کا نمبر تیسرا ہے۔ وہ ۸ فروری ۱۸۹۷ء (۶ رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ بروز پیر) کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔

والد کا انتقال وکالت کرتے ہوئے سولہ ہی سال ہوئے تھے کہ فدا حسین خاں سخت بیمار ہو کر قائم گنج آگئے جہاں ۱۹۰۷ء میں (عمر ۳۹ سال) انتقال کیا ان کے انتقال کے بعد بچوں کی سرپرستی عطا حسین خاں کے سپرد ہوئی جنہوں نے چار بھائیوں کو اٹاوے میں داخل کرایا اور تمام معاملات کی نگرانی کی لیکن ۱۹۱۱ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا تو پھر ان بچوں کے خالو حسن الدین خاں کے سپرد یہ سرپرستی اور نگرانی ہوئی۔

بچپن ذاکر صاحب بچپن ہی میں اپنے ہم عمروں میں امتیازی خصوصیات کے حامل تھے۔ حیدرآباد کی جاگیردارانہ فضا ان کی نظری سادگی اور نیک مزاجی پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا ہے کہ:

"سیرت کی چمک دمک اپنوں اور غیروں کے لیے جاذب نظر تھی"۔ [۱]

ماڈرن ہسٹری خصوصاً یورپین ہسٹری پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ سلطان ٹیپو کے فوجی نظام پر کتاب بھی لکھی ہے۔ اب وہابی تحریک پر کام کر رہے ہیں۔ آج کل کراچی میں ہیں۔

[۱] "یادوں کی دنیا" - ۴۰

بہن بھائیوں کا لڑنا جھگڑنا جیسا کہ ہر گھر میں ہوتا ہے، سو یہاں بھی تھا۔ زاہد حسین خاں کی سیرت و صورت دادا سے ملتی تھی۔ حُسن و صحت، مزاج و کردار ہر اعتبار سے مشابہ تھے۔ ذاکر صاحب سے ڈیڑھ سال چھوٹے تھے مگر دونوں میں ہمیشہ اَن بَن رہتی۔ یہ منظر بھی یوسف حسین صاحب کے الفاظ میں دیکھئے۔

"اُن کا مقابلہ ذاکر میاں سے رہتا تھا جو اگرچہ عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن جسمانی قوت میں کم تھے ..... معمولی معمولی باتوں پر اَن بَن ہو جاتی۔ اُس وقت یہ اور بھی ہوتا ہے جب بھائیوں کی عمر میں زیادہ فرق نہ ہو۔ جسمانی لحاظ سے زاہد میاں ذاکر میاں کو مار لیتے اس لیے کہ ان میں قوت و توانائی زیادہ تھی۔ اکثر اوقات مجھے اچھی طرح یاد ہے، ذاکر میاں اُن سے کتراتے اور منھ نہیں لگتے تھے۔ کبھی حکمت عملی سے قابو میں رکھتے تھے۔ بعض دفعہ جب دونوں میں کھٹ پٹ ہو جاتی تو کئی کئی دن تک بات چیت بند رہتی لیکن پھر خود ہی میل ہو جاتا۔ اِن دونوں کے جھگڑے کو بھائی جان (مظفر حسین خاں) چکایا کرتے .... زیادتی زاہد میاں کی طرف سے ہوتی تھی۔ اُن کی ذہنیت حاکمانہ تھی جو چاہتے تھے وہ اگر پورا نہ ہو تو لڑنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ذاکر میاں ویسے دیکھنے میں دُبلے پتلے نہیں تھے لیکن ان کا جسم پھُسپھُس اور نرم تھا، وہ زاہد میاں کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ذاکر میاں کے مزاج میں بھی ان کے جسم کی طرح نرمی اور ملائمت تھی وہ بچپن میں مرنجا مرنج اور صلح کل تھے۔ جسم سے زیادہ دماغ کو

استعمال کرنا جانتے تھے اور حکمت عملی سے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتے۔ وہ ہمیشہ زاہد میاں کی زیادتیوں کو بڑے صبر و تحمل سے برداشت کرتے تھے " [۱]

ابتدائی تعلیم

حیدرآباد میں ذاکر صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی شروع ہوئی، ماسٹر عبدالغنی، ایک نومسلم انگریز جو اُن کے والد کے پریس میں ترجمے کا کام کرتے تھے، اُن کے سب سے پہلے استاد تھے۔[۲] باپ کے انتقال کے بعد جب یہ سب قائم گنج آ گئے تو ۱۹۰۷ء میں اُنھیں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں بھیجا گیا جسے مولوی بشیر الدین نے ۱۸۸۹ء میں قائم کیا تھا۔[۳]

جب ذاکر صاحب یہاں داخل ہوئے تو سید الطاف حسین ہیڈ ماسٹر تھے۔ جن کا تقرر ۱۹۰۴ء میں بحیثیت ٹیچر ہوا تھا مگر کچھ ہی عرصے بعد ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیے گئے۔ اُن کا احترام طلبا کے دلوں میں نہ صرف ان کی علمیت بلکہ بلند کردار اور اصولوں

---

۱ ' یادوں کی دنیا '۔ ۴۴۔ ۲ حیدرآباد کے رزیڈنسی اسکول میں پڑھنے کی بات بالکل غلط ہے۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے ایک ملاقات کے دوران فرمایا کہ " میں حیدرآباد کے کسی اسکول میں نہیں پڑھا میں وہاں ایک ٹیوٹر سے پڑھتا تھا "

۳ بشیر الدین شروع میں سرسید اور ان کی تحریک کے سخت مخالف تھے۔ ذہن رسا پایا تھا۔ ' نجم الاخبار ' (اٹاوہ) کے ایڈیٹر تھے اور سرسید کی تحریک پر شدید تنقید کرتے تھے لیکن بعد میں حامی ہو گئے اور اخبار ' البشیر ' جاری کیا جسے آخر دم (۱۹۵۶ء) تک نکالتے رہے۔

کی بدولت بھی تھا۔ ان کی شخصیت طلبا پر جادو کا اثر رکھتی تھی۔ ان کا خلوص محبت دل جیت لیتا اور ان کا برتاؤ بچوں کو کردار کے سانچوں میں ڈھالتا تھا۔ ان کی شخصیت کی خوبیوں نے ذاکر صاحب کے کردار و سیرت کو بھی کافی متاثر کیا۔ اسکول کے دوسرے استادوں میں یہاں کے ہیڈ مولوی سید شرف الدین یاس بھی تھے جو ادب و شعر کی دل چسپی کے ساتھ ہی مذہبی عقائد کے بڑے پابند، با اصول اور نظریات کے اعتبار سے کٹر نیشنلسٹ تھے مولانا حامد حسن قادری اردو کے استاد تھے۔

اسکول کی زندگی

مولوی شرف الدین کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن اسکول میں قائم کی گئی جس میں یہ سب لوگ خصوصاً ذاکر صاحب بڑی دل چسپی لیتے اور انجمن کے جلسوں اور مباحثوں میں جو اکثر ہوتے رہتے بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔ علمی کاموں سے لگاؤ، تحریر و تقریر میں دل چسپی اور قومی مسائل پر غور و فکر کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

اُس زمانے میں جنگ طرابلس و بلقان نے مسلمانان ہند میں بیداری کی لہر دوڑا دی تھی۔ اس جنگ کے واقعات مسلمانوں کی توجہ کا مرکز تھے۔ ذاکر صاحب اس موضوع پر جوشیلی تقریریں کرتے اور ترکوں کے لئے چندہ جمع کرتے تھے۔ اسکول میں ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ انہی کی تحریک پر اکثر لڑکوں نے گوشت کھانا بند کر دیا تاکہ اس طرح روپیہ بچا کر ترکوں کی مدد کو بھیجا جائے۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہ مسجد میں نمازیوں کے سامنے تقریر کرتے اور چندہ کی اپیل کرتے اُسی وقت سے اُن کے الفاظ میں یہ اثر تھا کہ ایک بار ایک بزرگ چیخ کر رو پڑے

اور اپنا پورا بٹوہ ذاکر صاحب کی ٹوپی میں اُلٹ دیا ۔ جو چندے کے لیئے پھیلائی گئی تھی

اخبار پڑھنے اور حالات سے باخبر رہنے کا اس قدر انہیں چسکا تھا کہ 'پانیر'
خریدنے کے لیے روزانہ اسٹیشن جاتے اور ساتھیوں کو خبروں کا ترجمہ وغیرہ سناتے
تھے ۔ خالی وقت کا زیادہ حصہ سید الطاف حسین کے ساتھ گذرتا ۔ جہاں مختلف
سماجی اور سیاسی مسئلوں پر تبادلۂ خیال ہوتا ۔ ان صحبتوں میں اُنھیں موجودہ حالات
اور سیاسی اُلجھنوں کی پوری آگاہی حاصل ہو جاتی ۔

آزمائش جب میٹرک پاس کر کے اسکول سے رخصت ہو رہے تھے تو ایک
دن مولوی بشیر الدین نے کھانے پر بلایا ۔ کھانا سامنے آیا تو مولوی
صاحب نے ایک گلاس پانی سالن میں ڈال دیا ۔ ذاکر صاحب حیران تو ہوئے
مگر پاس ادب سے رہے خاموش اور اُسی سے چپ چاپ روٹی کھالی ۔ بعد میں
مولوی صاحب نے خود ہی فرمایا کہ "ذاکر سالن میں پانی میں نے اس لیئے ڈالا تھا
کہ میں دیکھ سکوں کہ تم کتنے پانی میں ہو ۔ اور اگر تم وہ سالن نہ کھاتے تو میں سمجھ لیتا
کہ تم کش مکش حیات کا مقابلہ نہ کر سکو گے مگر اب مجھے یقین ہے کہ تمہاری زندگی
انشاء اللہ کامیاب زندگی ہوگی"۔

ماں کی وفات ۱۹۱۰ء میں عطا حسین خاں نے وفات پائی اور اگلے
ہی سال طاعون کی وبا پھیلی جس نے بے شمار گھر ویران
کر دیئے ۔ اس لپیٹ میں یہ گھر بھی بُری طرح آیا ۔ ماں کے علاوہ ان کی نانی چھوٹے
بھائی (جعفر حسین) اور گھر کے نوکروں کو بھی وبا نے نشانہ بنالیا ۔ صرف ایک چھوٹا
بچہ (محمود حسین خاں) بچا تھا جس کو ان کی چچی اپنے ہمراہ لے گئیں والدہ نے بچوں کو

اپنی بیماری کی اطلاع نہ کی کہ یہ سب پریشان ہوں گے اور تعلیم میں خلل پڑے گا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تب خبر پہنچی [۱]

بیعت

کم عمری میں ہی ذاکر صاحب ایک بزرگ پیر حسن شاہ سے بیعت ہو گئے تھے۔ یہ بزرگ، اُن کے دادا کے دور کے عزیز بھی تھے اور شاہ طالب حسین مجیب فرخ آبادی کے خلیفہ تھے [۲]۔ پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ کپڑوں اور کتابوں کی گٹھری لیے پھرتے جو اُن کا سرمایہ تھا۔ گرمی کی تعطیل میں جب ذاکر صاحب قائم گنج آتے تو وہ ان کی ہدایت و تربیت کا کام یوں انجام دیتے کہ یا تو علم دین اور سلوک و معرفت کی کوئی کتاب نقل کراتے اور اس کے معنی بھی سمجھاتے جاتے اور یا ان کو روپے دیتے کہ محلے میں فلاں غریب کو یا فلاں بیوہ کو دے آؤ کبھی ان کے ہاتھ میں ایک روپیہ دیدیتے اور حاجت مندوں کو پیچھے لگا دیتے اور کہتے کہ بانٹو [۳]۔ ایک مرتبہ جب ذاکر صاحب بیمار ہوئے تو حسن شاہ روزانہ

---

[۱] 'پیام تعلیم' ذاکر نمبر' "یادوں کی دنیا" - ۵۳

[۲] حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادیؒ کے عقیدت مندوں میں کثرت سے ہندو بھی تھے ایک بار کسی ہندو بزرگ کے قشقے (تلک) پر پیر حسن شاہ اعتراض کر بیٹھے جس پر اُن کے پیر سخت برہم ہوئے اور حکم دیا کہ قشقہ لگا کر کشمیر اور دکن وغیرہ پیدل جاؤ اور وہاں کے پروہتوں کی چٹھیاں لا کر دو۔ انہوں نے تعمیل حکم کی گاڑی میں کتابیں اور کپڑے بھر لیے اور پیدل سفر کیا تین سال بعد واپس آئے، ۱۹۱۰ء میں متھرا کے قریب کسی گاؤں میں ان کا انتقال ہوا اسّی سے کچھ زیادہ عمر تھی۔

[۳] 'نقوش' (شخصیات نمبر) 'پیام تعلیم' (ذاکر نمبر)' "یادوں کی دنیا" - ۱۳۲

صبح آکر ان کا قارورہ خود حکیم صاحب کے یہاں کافی ڈور لے کر جاتے اور دوا وغیرہ لاتے تھے

علی گڈھ میں اٹاوہ اسکول سے فارغ ہونیکے بعد ۱۹۱۳ء میں ایم - اے - او کالج علی گڈھ میں داخلہ لیا - یہاں ان کے دو بڑے بھائی پہلے سے موجود تھے جو اپنی شرافت، قابلیت اور ذہانت کی بدولت نیکنامی حاصل کر چکے تھے -

لڑکپن کے اس دور میں علی گڈھ کالج میں پہلے پہل آمد اور وہاں کے کسی قدر اجنبی ماحول کی کہانی خود اُنہی کے الفاظ میں سنی جائے تو کیا خوب ہو - چنانچہ پہلے دن کی روئداد یہ ہے کہ " سہ پہر میں شہر سے ایک جوتا، کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خرید وادی تھی - شہر گئے تھے ہم پیدل، اُدھر سے آئے تھے اِکے میں، اس لیے کہ ہاتھ میں سامان اٹھا کر چلنا اُس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا![1] مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے اپنی کچی بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا - گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے - میں نے کہ ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور جرابَ اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق سولہ ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی، اور دیر کیسے نہ کرتا، جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا، اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں

---

[1] یہ کسرِ شان والی روایات آج بھی جوں کی توں ہیں -

بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرادی تھی وہ گھبراہٹ میں سب ذہن سے اتر گیا اور نئی بار کے بست وکشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا لیکن جب کس بدھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ چوکس ساتھی ڈائنگ ہال جا چکے تھے۔ راستہ معلوم نہ تھا، نہ جانے کتنی دیر اِدھر اُدھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں تلاشِ منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرے کے سامنے آن پہنچا، کمرہ بند تھا، دوسرے کمرے بھی سب بند تھے گھڑی دیکھی، یہ بھی اُسی دن نئی نئی بھائی صاحب نے دی تھی اس سے پہلے اسکول کے گھنٹے یا سورج کی مدد سے دن کی تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اسے گذرے صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں اور اس جانِ ناتواں نے اس آٹھ منٹ میں خود فراموشی، بازیافت، تلاش منزل، گم کردہ راہی اور ناکامیٔ سفر کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے! ...... خیر، تو ہم آٹھ منٹ بعد جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ چارپائیاں باہر نیم کے درختوں کے قریب پڑی تھیں وہاں بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے ساتھی کوئی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کوئی گنگناتا، کوئی ہنستا، کوئی ذرا چپ چپ واپس آنے لگے۔ یعنی جانا، کھانا آنا سب ۹ - ۱۰ منٹ میں ختم۔ اس زمانے میں اور چیزوں میں تو نہیں البتہ کھانے میں بہت ہی فوجی شان تھی اس پر زیادہ وقت صرف کرنا بدذوقی سمجھا جاتا تھا۔[۱]

شادی | علی گڈھ آنے کے کچھ عرصے بعد یعنی ۱۹۱۵ء میں

---

[۱] 'تعلیمی خطبات'، طبع ۱۹۶۱ء

اُن کی شادی اپنی برادری ہی میں ہوگئی تھی۔ لڑکی (شاہجہاں بیگم) کے والدین یا قریبی عزیز کوئی نہ تھا۔ دادا نے پرورش اور شادی وغیرہ کی۔ شادی کے وقت سہرا ان کے ایک بزرگ اسد علی خاں نے باندھا۔ [۵]

لکھنؤ اور پھر علی گڑھ

ایف اے میں ذاکر صاحب نے سائنس کے مضامین لیئے تھے۔ انٹر پاس کرنے کے بعد ۱۹۱۵ء میں بی ایس سی کا امتحان دینے کے لیئے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخل ہوئے تاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکیں لیکن سخت بیمار رہنے کی وجہ سے ارادہ بدلنا اور علی گڑھ واپس ہونا پڑا اس طرح ایک سال بیکار گیا۔

بی۔ اے میں انگریزی ادب، فلسفہ اور اقتصادیات لے کر ۱۹۱۶ء میں پوزیشن سے پاس کیا۔ ان سے پہلے اور بھی طلباء یوں پوزیشن سے پاس ہوتے آئے تھے مگر بقول رشید صاحب "جو بات ذاکر صاحب کو ممتاز کرتی وہ یہ تھی کہ یہ کورس کی کتابیں نہ خریدتے تھے نہ پڑھتے تھے زیادہ وقت اِدھر اُدھر گھومنے یا جہاں تہاں بیٹھ کر خوش گپّی میں گزار دیا کرتے تھے لیکن اس مدمیں لٹن لائبریری اور یونین کے دارالمطالعے کا روزانہ گشت ضرور شامل ہوتا۔ رات کو واپس آتے یا دن میں کہیں ملاقات ہوجاتی تو معلوم ہوتا کہ ہندوستان یا اس سے باہر کا کوئی علمی یا سیاسی مسئلہ اور کالج کا کوئی حادثہ پرائیویٹ یا پبلک یا ادبیات کا کوئی اشتہار

---

[۵] اسد علی خاں کو استاد دادا کہا جاتا تھا وہ ذاکر صاحب کے دادا کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اُس زمانے میں بزرگوں سے سہرا بندھوانے کا رواج تھا۔ ("یادوں کی دنیا" - ۲۱)

ایسا نہ تھا جس کی ان کو خبر نہ ہو...... ذاکر صاحب سے طالب علمی کے زمانے میں بھی ایسی کوئی لغزش سرزد نہ ہوئی جو طالب علموں سے اکثر ہو جایا کرتی ہے"[۱]

ڈیوٹی سوسائٹی کی قیادت

علی گڈھ میں ڈیوٹی سوسائٹی کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ طلبار کا ایک وفد دورہ کرنے جاتا ہے اور غریب طالب علموں کے لیئے صاحب خیر لوگوں اور اداروں سے چندہ یا عطیہ وصول کر کے لاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں بھی ایک وفد بھیجنا طے ہوا۔ اس کے حالات رشید صاحب نے "سیاحتِ برما" کے عنوان سے رسالہ 'علی گڈھ منتھلی' میں لکھے:

> " فروری کی شاید آخری تاریخیں تھیں، رات میں ڈائننگ ہال سے نکلا تو ذاکر صاحب کا کمرہ پاس ہی تھا۔ اندر داخل ہوا تو وہی معمولی نظارہ پیشِ نظر تھا جو ہمیشہ سے صاحب ممدوح کے امتیازِ خصوصی میں داخل ہے۔ ایک کرسی پر میز کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک مخصوص انداز میں کچھ متفرق اشعار کو اپنے لہجۂ خصوصی سے زیر بار احسان کر رہے تھے... ... مختصر یہ کہ پہلی نظر میں بمشکل اس بات کا پتہ لگ سکتا تھا کہ صاحب ممدوح کھانے کے ساتھ شرائط الطعام یا فلم بجالا چکے ہیں" [۲]

---

[۱] آشفتہ بیانی۔ [۲] 'علی گڈھ منتھلی' اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء

رسالہ 'علی گڈھ منتھلی' میں رشید صاحب کے اکثر مضامین شائع ہوتے تھے۔ مثلاً "سیاحت برما"، "خصوصیات گلِ منزل" (کجی بارک) وغیرہ ان مضامین میں ذاکر صاحب کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے

رشید صاحب کے اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ ذاکر صاحب اس وفد کے سکریٹری مقرر ہوئے اور اپریل کے پہلے ہفتے میں جانا طے ہوا مگر وہ اچانک سخت بیمار ہو گئے "حالت برابر تشویشناک ہوتی گئی لیکن خدا کا فضل شامل حال تھا۔ ایک عرصے کی خطرناک کیفیت بیم و رجا کے منازل سے گذرتی ہوئی آخر کار امید افزا حالات میں تبدیل ہو گئی" لیکن پھر بھی اس قابل نہ ہو سکے کہ وفد کے ہمراہ جا سکیں۔

یونین کے ہنگامے

رفتہ رفتہ علی گڑھ کے قیام میں بھی وہی علمی مصروفیتیں وہی تحریر و تقریر کی ہنگامہ آرائیاں اور وہی قومی کاموں کی دل سوزیاں شروع ہو گئیں چنانچہ یونین کے جلسوں میں ان کی تقریر سننے کے لیئے طلبا خاص طور سے جمع ہوتے تھے۔ ایک بار ۱۸-۱۹۱۷ء میں یونین کے وائس پریسیڈنٹ کے لیئے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے۔ رواج کے مطابق فریقین کے امیدواروں کے تقریر کرنے کا دن آیا۔ مخالفوں نے مشہور کیا تھا کہ ذاکر حسین کو فلاں پروفیسر نے تقریر لکھ دی ہے اور وہ اسے رٹنے میں مصروف ہیں۔ خیر، مباحثے کے وقت جب نام لیا گیا تو وہ ڈائس پر آکر صرف یہ بولے کہ "میں موضوع کو ایوان کے سامنے پیش کرتا ہوں اور جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ جوابی تقریر میں کہوں گا" ہال میں بڑا شور مچا، مخالفوں کی بن آئی تھی، حمایتی دم بخود تھے اور ان کا حال یہ تھا کہ ——— "کوئی غصے میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱)

انڈر ایم اے او کالج کا وہ ماحول سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے جب یہ سب وہاں تعلیم پا رہے تھے۔

کوئی مایوس ہوکر، کوئی اپنے آپ پر نفریں کرتا ہوا اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا مجمع سے جانے لگا۔ کچھ اس طور سے جم کر بیٹھ گئے کہ یا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اُٹھیں گے ..... صرف مخالفین نے تقریریں کیں اور جس کے دل میں جو آیا ذاکر صاحب اور ان کے حمائیتوں کو سنا ڈالا"[1] جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب نے، بجائے باقاعدہ تقریر کے صرف مخالفوں کے جواب دینا شروع کیے اور موقع محل کے لحاظ سے فقرے بھی چست کرتے گئے۔ تقریر ختم ہوئی تو سارا ہال انہی کی موافقت میں کھڑا ہو گیا اور مخالفوں کا حال اب بقول رشید صاحب وہ ہوا جو پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد مرہٹوں کا ہوا تھا۔

طلبار کی قیادت

طلبار کی تحریکوں یا مطالبوں کے سلسلے میں قیادت کے لیے ہر ایک کی نظر ایک ہی شخص ذاکر حسین پر پڑتی جو بذات خود کبھی کسی ہنگامہ آرائی یا فتنہ طرازی کا بانی نہ ہوا لیکن جس کی بات کالج کے ذمہ دار حلقوں میں بھی وقعت رکھتی اور اُنہیں طلبار کے حقوق تسلیم کرتے ہی بنتی۔ جتنا بھروسہ اُن پر ساتھی طلبار کو تھا اتنا ہی منتظمین کالج کو تھا۔ پھر یہ کہ اُن کے دور بڑے بھائیوں نے جو اچھی روایات چھوڑی تھیں ان کا چرچا عام تھا۔

یہاں ذاکر صاحب کے ساتھی اور قریبی دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی رہے ہیں لہٰذا اس دور میں پڑھائی اور دیگر تفریحات کا نظارہ کیوں نہ اُنہی کی زبان و بیان سے کرتے چلیں۔

---

[1] رشید احمد صدیقی: "ذاکر صاحب" [2] "آشفتہ بیانی میری"، ۶۰

"ہمارے کمرے صاحب باغ کی دوسری منزل پر مشرقی سمت میں واقع تھے سامنے برآمدہ تھا، برآمدے سے اتر کر لمبا پتلا صحن جہاں ہم سب بیٹھے پڑھنے میں مصروف تھے۔ رات زیادہ آچکی تھی ...... ذاکر صاحب کتاب پر جھکے ہوئے تھے دونوں کہنیاں میز پر تھیں اور ہاتھ کی دو دو انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے یوں کھولے ہوئے تھے جیسے "بادام" کے عوض آنکھیں نکال کر بھیجنے والے تھے۔

میں نے کہا "ذاکر صاحب یہ کیا؟ ذرا چاند کی طرف دیکھئے گا"۔ کہیں سے جنبش کھائے بغیر بولے:

"ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں"

ثاقب لکھنوی کی ایک غزل علی گڑھ کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا اور ہر شخص کی زبان پر تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابرِ بہار جانب کہسار دیکھ کر

سب ہنس پڑے اور منظر کا سحر کافور ہو گیا .... دوسرے ہی دن طالب علموں کا ایک ہجوم صاحب باغ پہنچا معلوم ہوا کہ طلباء نے طلباء نے اجتماعی طور پر احتجاج کیا ہے اور ذاکر صاحب سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ وہ اس کی سربراہی کریں۔ ذاکر صاحب فی الفور اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ تین چار دن ان کا کوئی پتہ نہ چلا ایک دن یونین کے دارالمطالعے میں مل گئے میں نے پوچھا "کیسی رہی"۔ بولے "بخیر

گذشت "
میں نے کہا " اور جناب پڑھائی بھی "
فرمایا " اس ہنگامے میں دل و جان سے منہمک رہا اس کا تو کچھ اجر ملنا
چاہئے تھا۔ اللہ نے آپ سے نجات دلائی " ۔
" اور کھانا پینا " میں نے پوچھا۔
بولے " قوم کا کام کرنے والا بھوکا نہیں مرتا " ۔
میں نے کہا " ذرا احتیاط رکھئے گا قومی کام کرنے والے بھوک سے تو نہیں
مرے لیکن ہیضے میں اکثر مرے پائے گئے ہیں " ۔
میں بدخط ہو کر چلنے لگا تو لپک کر سامنے آ گئے کہنے لگے " للہ میرا کہا
مان جائیے " ۔ میں نے کہا " وہ کیا " ۔
فرمایا " دہلی چلیں "
میں اکتا گیا اور بولا " ذاکر صاحب ہوش میں آئیے امتحان کے گنے دن رہ
گئے ہیں " ؟ اس بات کو اس طرح ٹال گئے جیسے اس کی ذرہ برابر بھی اہمیت
نہ تھی کہنے لگے " پڑھ کے کیا کیجئے گا کھانے کمانے بھر پڑھ ہی لیا ہے احمقوں
کو مرعوب کرنے کے لیئے بی اے کافی ہے بھلے مانسوں میں بیٹھ کر ہنسنے بولنے
کی عادت ڈالنی ہے اس کے لیے دہلی کا سفر ضروری ہے " ..... میں نہ مانا
ذاکر صاحب بھی دلی نہ گئے صرف کالج میں جہاں تہاں کھاتے یا گپ کرتے
پائے گئے ۔ امتحان سے تین چار دن پہلے صاحب باغ کے اُفق پر پھر سے نمودار
ہوئے ۔ ہم نے ان کی پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ سب کچھ کھو آئے تھے اور

ہماری ہمدردی کے مستحق تھے اور وہ اس طور سے ملے جیسے انہوں نے ہمارے گناہوں کو معاف کر دیا ہو ـــــ امتحان ہوا، نتیجہ نکلا، ہم سب فیل۔ صرف ذاکر صاحب پاس -!" لے

ادبی دلچسپیاں

تعلیمی مصروفیت اور یونین وغیرہ کی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ ہی ادبی مشغلے بھی جاری تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ طالب علمی میں انگریزی کتاب 'Plato's Republic' کا ترجمہ کر ڈالا اور ترجمہ بھی ایسا کیا کہ مولانا سہیل جو کالج میں اپنی ذہانت، شاعری، تقریر اور قابلیت میں سب سے اونچے سمجھے جاتے تھے بے اختیار کہہ اٹھے کہ "افلاطون کو اُردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا" ٢ے

علاوہ ازیں علی گڈھ کالج کے ماہوار رسالے 'علی گڈھ منتھلی' میں رِپ کے فرضی نام سے مضامین بھی لکھتے رہتے جو کالج میں بڑی دل چسپی کا باعث بنے رہے۔ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ریمز باتھم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر کا بالخصوص ان کی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بہترین اراکین سے کیا جا سکتا ہے۔ ٣ے

علی گڈھ کے دن رات

۱۹۱۸ء میں بی۔اے کرنے کے بعد ایم اے (اکنامکس) میں داخلہ لیا اور ایم۔اے کے آخری سال میں تھے کہ اکنامکس (اقتصادیات) میں جونیر لکچرر (یا اسٹوڈنٹ

لے "ذاکر صاحب" - ۵۲ ٢ے یہ کتاب "ریاست" کے عنوان سے چھپی ہے۔
٣ے 'آشفتہ بیانی' - " ذاکر صاحب' - ۳۶

لکچرر (مقرر) ہوگئے ۔ اسی زمانے میں تحریک خلافت اور ترک موالات (نان کو آپریشن) کا ہنگامہ شروع ہوا مگر اس داستان سے پہلے ذرا علی گڈھ کی زندگی میں ذاکر صاحب کے رہن سہن ، وضع قطع اور سیرت و کردار کا ایک نظارہ (رشید صاحب کے الفاظ میں) کر لیجئے :

"مُرشد ان طلبار میں سے تھے جن سے کالج کے ارباب حل و عقد بجا طور پر مرعوب تھے اور شاید اس کا سبب یہ تھا کہ مُرشد کی حاضری ہمیشہ کم رہتی تھی اور یونیورسٹی میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تھے یونین کے بے پناہ مقرروں میں تھے ۔ کُرتہ پاجامہ اور داڑھی شرعی ، شیروانی حیدر آبادی ، غذا ڈائننگ ہال کی ، ناشتہ دوسروں کا اور دوا دہلی کی ! مرشد کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے اور اس فکر میں وہ آس پاس کے تمام اطبار سے رجوع کرتے رہتے تھے ...... مُرشد ساری دوائیں خرید لاتے اور اس میں انگریزی یونانی اور ویدک سب شامل ہوتیں کیونکہ مُرشد دہلی جا کر ہر قسم کے اطبار سے ملتے اور ان سب کی تجویز کردہ دوائیں بڑے تکلف سے و احترام سے لاتے دواؤں کے ساتھ دہلی سے ہر قسم کے پھل اور مٹھائیاں بھی لاتے ۔ ہر اسٹیشن پر خوانچے والے سے کچھ نہ کچھ خریدتے اور وہ بھی ساتھ لاتے ۔ بورڈنگ ہاؤس پہنچکر صلائے عام دیتے لیکن شرط یہ تھی کہ جو شخص پھل یا مٹھائی وغیرہ میں شریک ہو اس کو دوا بھی کھانی پڑے گی " [۱]

---

[۱] "مضامین رشید" : ۷

"سیرت وشخصیت کے اعتبار سے نسبتاً بہت بلند و بہتر رہے .....
اصولوں کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا اور حریف کی عظمت کے بھی قائل
ہو جاتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی ایسی کوئی لغزش سرزد نہیں
ہوئی جو طالب علموں سے اکثر ہو جایا کرتی ہے"۔ [1]

اب رہا پڑھنے لکھنے کا معاملہ، سو وہ یہ تھا کہ "بی اے میں حاضری کم تھی، ٹول صاحب نے بلا کر دھمکایا تو کتاب لیکر بیٹھے۔ کچھ دیر تک قرۃ العین کے اشعار ٹھیک اس انداز سے پڑھتے رہتے جس سے بآسانی اندازہ ہو سکتا تھا کہ ایک "پٹھان" کے ہاتھ قرۃ العین اور اس کے اشعار کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد پینے اور قرۃ العین کے انجام پر غور کرنے کے لیے لیٹ جاتے۔ اتنے میں مولانا (سہیل) کا نزول اجلال ہوتا۔ فرماتے مولانا اب جان کی خیر نہیں۔ پڑھنا شروع کیا ہے لیکن قدم قدم پر مصنف کتاب سے اختلاف آرا ہوتا ہے اور یہ بھی طے نہیں ہو سکتا ہے کہ کون حق بجانب ہے۔ مولانا جواب دیتے کوئی مضائقہ نہیں کتاب لاؤ۔ مولانا فرماتے ذرا اصل عبارت کا ترجمہ سناؤ وہ بھی سنایا گیا، مولانا لاحول ولا قوۃ کہہ کر فوراً کرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتے تبصرہ شروع ہوتا .... ذاکر صاحب کچھ دیر سنتے اور پھر کہتے "بس بس سمجھ گیا"۔ مولانا فرماتے دیکھو خواہ مخواہ جلدی نہ کرو ابھی تو محض ابتدائی باتیں بیان کی گئی ہیں یہ مصنف بڑا فریبی ہے، دیکھو اس کا فریب کھولتا ہوں، غرض نوبت یہاں تک پہنچتی کہ ذاکر صاحب قرۃ العین کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوتے اور

---

[1] "آشفتہ بیانی میری" : ۶۰

مولانا خواہ کسی حالت میں ہوتے اُن کے پیچھے ہولیتے، اب وہ آگے جارہے ہیں اور مولانا پیچھے پیچھے۔ جتنا فاصلہ دونوں کے درمیان بڑھتا جاتا، مولانا اپنی آواز بلند کرتے جاتے یہاں تک کہ ذاکر صاحب غائب ہوجاتے" لـ۵

تحریک خلافت

خلافت، ترک موالات اور سودیشی تحریک ہندوستان کی تاریخ کا سنہرا اور انقلاب آفریں باب ہے۔ مادر وطن کی آنکھوں نے اتحاد و یک جہتی کے یہ نظارے نہ کبھی پہلے دیکھے تھے اور نہ شاید بعد میں کبھی دیکھ سکیں۔ یہاں اس دور کی تاریخ دوہرانا مقصود نہیں لیکن پس منظر کے طور پر سمجھنا ضروری ہے۔

۱۹۱۹ئہ میں حکومت نے ایک طرف کچھ اصلاحات مانٹیگو چمیس فورڈ کے نام سے منظور کیں اور دوسری طرف رولٹ ایکٹ پاس کرکے شہری آزادیاں بھی سلب کرلی گئیں۔ عوام میں ان حالات پر غم و غصے کی فطری لہر کو بروقت مہاتما گاندھی، مولانا آزادؒ اور علی برادران کی رہنمائیاں میسر آجانے سے یہ آزادئ وطن کی تحریک میں تبدیل ہوگئی، تمام ملک میں ہڑتالیں، جلسے اور جلوس ہوئے جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ پنجاب میں مارشل لا لگا اور عوامی انقلابی تحریک پوری طرح جاگ اٹھی۔ مسلمانوں میں ہیجان کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہاں ترکی کی ہمدردی کا

لـ "مضامین رشید" ۔ ۳۰۶ انہی مولانا اقبال احمد سہیل مرحوم نے ذاکر صاحب کے وائس پریسیڈنٹ چنے جانے پر ایک طویل نظم کہی تھی جس کا آخری شعر یہ تھا:

نگار یونین را ساعتِ صد زیب و زین آمد — کہ اکنوں سرو بُستانِ ہُنر ذاکر حسین آمد

شدید جوش اٹھا تھا۔ وطن کو آزاد دیکھنے کی تمنائیں تو تھیں ہی اپنے پورے شباب پر کہ جنگ ختم ہونے پر برطانوی حکومت ترکی سے کیے گئے وعدوں پر حسب عادت خاک ڈالنے لگی اور اس کی سالمیت اور آزادی پر ضرب لگانے کو آمادہ ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کے کمزور ہونے کو خلافت کا کمزور ہو جانا سمجھا۔ چنانچہ یہاں خلافت کانفرنس قائم کی گئی اور ترکی کی سالمیت اور خلافت کی حفاظت کا عزم کیا گیا۔ اس موقعے پر مہاتما گاندھی نے نہ صرف تحریکِ خلافت کی پُر جوش حمایت کی بلکہ کانگریس کو بھی اس پر آمادہ کر لیا۔ ان حالات سے ملک کے کونے کونے میں بے مثال اتحاد کی فضا پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹ئہ میں جب ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو کلکتہ میں مولانا آزادؒ کی صدارت میں کانگریس کا خاص اجلاس ہوا جس نے متحدہ قومی مطالبات پیش کیے۔ ان میں جہاں رولٹ ایکٹ کی منسوخی اور سوراج وغیرہ شامل تھے وہاں خلافت کے وقار کو قائم رکھنے کی مانگ اور بصورت دیگر ترک موالات (نان کوآپریشن) کی دھمکی دی گئی تھی۔ خلافت کانفرنس پہلے ہی اس قسم کا اعلان کر چکی تھی اور جمعیۃ العلماء نے بھی اسی طرح کی تجویز پاس کیں۔ صرف مسٹر جناح اس محاذ سے الگ ہو گئے۔

ترکِ موالات کا اثر علی گڈھ پر

انگریز دشمنی کی مضبوط بنیادوں پر ملک میں سیاست کے جداگانہ دھارے ایک ہو چکے تھے اور آزادیٔ وطن کی خوابیدہ تمنائیں انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھیں تو یہ ممکن نہ تھا کہ علی گڈھ کالج جو اگرچہ برطانوی حکومت کے حلیفوں کا مرکز رہا تھا متاثر نہ ہو چنانچہ یہاں بھی دو گروہ طلباء میں پیدا ہو گئے تھے

حکیم اجمل خاں، علی برادران اور اُن کے ساتھیوں نے کالج کے ارباب کار کو خط لکھا کہ گورنمنٹ کی امداد لینا بند کر دی جائے اور امدادی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ممبران کورٹ کے جلسے میں ان حضرات نے پھر یہ دعوت دی مگر قدامت پرستوں کے درمیان بھینس کی بین ثابت ہوئی اور مطالبہ رد ہو گیا تو براہ راست طلباء سے اپیل کی گئی[1] خلافت کے حامی طلباء نے یونین کلب کی جانب سے قومی لیڈروں کو دعوت دی تو مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد علی گڑھ پہنچے۔

کالج کے ٹرسٹی بوکھلائے ہوئے تھے چنانچہ پرنسپل سے کچھ نہ بن پڑا تو والدین کی کانفرنس بلائی تاکہ خلافت کے سودائی کالج چھوڑ کر گھر چلے جائیں۔ کوئی ٹس سے مس نہ ہوا تو حکومت کی دہائی دی گئی[2] مگر ترشی سے یہ نشہ اترنے والا ہی نہ تھا۔ یونین میں جلسہ ہوا۔ قومی لیڈروں کی تقریروں کے بعد آپس میں مخالفت اور حمایت کا طوفان کھڑا ہو گیا

تاریخی فیصلہ

ذاکر صاحب کے لیے بھی یہ موقع کسی قدر شش و پنج کا تھا علی گڑھ چھوڑنا شاید طبیعت کو گوارا نہ ہوتا مگر جب ڈاکٹر ضیاءالدین نے اوروں کی طرح اُنہیں بھی سمجھایا کہ کالج میں رہے تو ایک ہی سال کے اندر ڈپٹی کلکٹری ملے گی تو عہدوں اور اعزاز کو حقارت سے ٹھکرانے والی

---

[1] عبدالغفار : حیات اجمل/ ۲۳۴

[2] رسالہ 'جوہر' جامعہ جوبلی نمبر (مضمون ڈاکٹر اشرف)

طبیعت نے قطعی فیصلہ کر دیا[۱] ۔ ترک موالات کی حمایت کا یہ تاریخی منظر رشید صاحب نے اس طرح دکھایا ہے:

"یونین میں جلسہ ہوا، میں اور مُرشد (ذاکر صاحب) بھی ایک طرف بیٹھے رہے، مولانا محمد علی نے تقریر کی اور بیٹھ گئے، مولانا شوکت علی نے تقریر شروع کی، دوپہر ہونے والی تھی اور دونوں بھائی دو کی گاڑی سے کہیں باہر جانے والے تھے تقریروں اور ان کے اثرات کے سیلاب کی کمزور موجیں کنار ساحل سے ہم آغوش ہونے والی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ وارفتگی کے ساتھ ہی یہ مشہور اور فرسودہ شعر پڑھا "سپردم بہ تو مایہ خویش را ...."
اور بیٹھ گئے، مُڑ کر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہے میں دم بخود ہو گیا اب جو دیکھتا ہوں تو ہنگامۂ محفل نعرۂ مجاہدین میں تبدیل ہو چکا تھا ایک سیلاب تھا جو ساحلوں کو پاش پاش کر رہا تھا ایک طوفان تھا جو نظم ہستی کو زیر و زبر کر رہا تھا ایک

---

[۱] "نقوش" شخصیات نمبر۔ محترم سید محمد میاں ٹونکی کا کہنا ہے کہ ذاکر صاحب تقریباً ایک ہفتے تک بالکل خاموش رہے اور تحریک کے بارے میں اُن کی کوئی رائے ظاہر نہیں ہوئی لڑکے یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ چونکہ ڈاکٹر ضیاء الدین سے قرب رکھتے ہیں اور جونیر لکچرر بھی مقرر ہو گئے ہیں اسلئے تحریک کے مخالف ہوں گے۔ مولانا محمد علیؒ وغیرہ کی آمد (غالباً ۱۳ اکتوبر) سے لگ بھگ ایک ہفتے کے بعد جب انھوں نے تحریک کی حمایت کا فیصلہ کیا تو
(باقی صفحہ ۶۳ پر)

ہول ناک گونج تھی جس نے دنیا کی آوازوں کو ہضم کر لیا تھا .....
میں مُرشد کو گھسیٹتا ہوا مجمع سے باہر لایا۔ باہر نکل کر میں نے پوچھا یہ کیا
ہوا؟ فرمایا رشید صاحب الوداع! زندگی کا آغاز بخیر ہوا ہے
انجام کی دعا کیجئے گا میرے پاس جو کچھ میرا ہے اسے محمود اور یوسف کے
سپرد کر دیجئے گا کالج کے کاغذات ہوں گے ان کو واپس کر دیجئے گا
میں نے کہا مُرشد آپ سے تو اس تحریک کے متعلق اکثر گفتگو رہی اور
آپ کچھ اس طریقہ کار کے مؤید بھی نہ تھے پھر یہ کیا ہوا۔ مُرشد نے
فرمایا تحریک صحیح ہو یا غلط، فرزندان علی گڈھ رزم و بزم دونوں میں برابر
کے شریک ہیں، رنگینیٔ محفل ہو، ہوائے ناؤ نوش یا میدان جہاد
اور نعرہ تکبیر وہ دونوں کے لیے یکساں سر بکف ہیں۔ اجل سے ناآشنا
رہ کر علی گڈھ اپنی زندگی کا ثبوت کیوں کر دے سکتا ہے آپ میرے
مزاحم نہ ہوں پانسہ پھینکا جا چکا بازی بھی لگ چکی ہے جب تک نتیجہ
برآمد نہ ہو کسی کو میرے فعل پر کوئی حکم لگانے کا حق حاصل نہیں ہے
اچھا خدا حافظ" [۱]

یونین میں فیصلہ

کالج کے طلبا دو گروہوں میں تقسیم تو ہو ہی چکے تھے
مگر تحریک خلافت کا حمایتی گروہ بھی اضطراب

---

[۱] مضامین رشید: ۱۵

جہاں ایک طرف جوش و مسرت کی لہر دوڑی وہاں دوسری طرف (مخالف طلبا اور استادوں میں)

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

اور کش مکش کے عالم میں تھا۔ یونین کے جلسے میں کسی نے تجویز پیش کی کہ اگر ہم اس ادارے کو چھوڑیں تو جو لوگ اس کی دعوت دے رہے ہیں اُنہیں چاہیے کہ وہ ہمارے لیے بہتر تعلیم کا انتظام کرنے کی ذمہ داری لیں۔ بات معقول تھی مگر اس پر آپس میں سخت اختلاف برپا ہو گیا اور اس شخص پر ڈاکٹر ضیاء الدین کا جاسوس ہونے کا الزام لگنے لگا۔ یہ ہنگامہ ہو ہی رہا تھا کہ ایم اے ایل ایل بی کا ایک نحیف طالب علم جو عرصے سے بیمار بھی تھا، کھڑا ہوا اور ایک پُر جوش مدلل تقریر کی۔ وہ کالج چھوڑنے کی حمایت کے ساتھ ہی ایک آزاد اور جداگانہ تعلیم گاہ کے مطالبے کی حمایت کر رہا تھا لیکن جب مخالفت کے شور میں یہ تقریر بھی دبتی نظر آئی تو اُس نوجوان نے دوبارہ تقریر کی اور خود اس نے اور اس کے ساتھیوں نے لکچرار شپ اور وظیفوں کے چھوڑنے کا اعلان کیا۔ اب کی بار اس کی تقریر نے خیالات کا رُخ بدل دیا۔ یہ نحیف نوجوان جس کا چہرہ کمزوری اور بیماری سے پہلے ہی پیلا پڑا تھا اور اب اس کا سارا بدن پسینے سے تربتر ہو گیا، طلباء کی تحریکوں اور اجتماعی زندگی کے میر کارواں ذاکر حسین خاں تھے

بالآخر مجمع نے تجویز منظور کی کہ اگر موجودہ تعلیم ناقص ہے اور اسے چھوڑنا ضروری تو قوم کا فرض ہے کہ بہتر تعلیم کا انتظام کرے۔ انقلابی نوجوانوں کی یہ

سخت کھلبلی مچ گئی اور فیصلہ بدلنے کے لیے زور ڈالا گیا لیکن نہ صرف فیصلہ اٹل رہا بلکہ انہوں نے تحریک کو کامیاب بنانے میں سرگرم اور نمایاں حصہ لیا۔

بکار قومی رہنماؤں کو جھنجھوڑے بغیر نہ رہی۔ اور انہیں سیاسی گتھیوں کے ساتھ ہی اس تعمیری مطالبے پر سوچنے کے لیئے بھی مجبور کر دیا۔

علی گڈھ میں تحریک کی کامیابی

ترک موالات اور خلافت کی تحریک ملک میں اس قدر کامیاب ہوئی کہ حکومت اس سے بے حد پریشان اور بدحواس ہوگئی۔ سرکاری طور پر جو رپورٹ مسٹر ولیمس نے پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیئے مرتب کی اس میں صاف صاف اس تحریک کی کامیابی کا اعتراف کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کا بھی کہ تعلیمی اداروں میں اس تحریک کا سب سے کامیاب حملہ علی گڈھ پر ہوا۔ مسٹر ولیمس کا خیال ہے کہ اگر اس تحریک کے ساتھ قومی درس گاہیں (نیشنل یونیورسٹی) قائم کرنے کی تعمیری اسکیم نہ ہوتی تو کم از کم تعلیمی اداروں پر اس تحریک کا حملہ پہلے ہی وار میں ناکام ہو جاتا۔ [1]

---

[1] WILLIAMS (L. F. R.): India in 1920—A report prepared for presentation to Parliament P. 55-60

باب ۲

جامعہ ملّیہ ــــ آزمائشی گھڑیاں

بے دستگاہ نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل
شوریست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

آخر کار ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء (مطابق ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ بروز جمعہ) کو وہ گھڑی آگئی جب ایک آزاد قومی درس گاہ کے قیام کا اعلان ہوا اور اس مبارک موقعے پر بلایا گیا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کو ــــ آج تک علی گڈھ والوں کی نظر میں دیوبند کے "ملاؤں" کی کوئی وقعت نہ تھی مگر آج کا علی گڈھ اُسی دیوبند کے مُلّا کے آگے سرِ تسلیم خم کر رہا تھا۔ ایک پرانے اور معروف علی گڈھ والے (جناب سید محمد ٹونکی) کی زبان سے سنیئے کہ:

"اس سلسلہ کی آخری کڑی دیوبند کا ضعیف و نحیف ملّا تھا۔ جسکی پیری

میں آزادی کا رنگِ شباب تھا، جس کے ہر چھوٹے اور سیدھے لفظ میں یثربی صداقت تھی، آہنی عزم تھا۔ اس ملا کے مختصر خطبے نے وہ روح پھونکی جو عمر بھر کی تعلیم نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ یہ دیوبند کا ملا محمود الحسن تھا جس کے انتظار میں نرگس ہزاروں سال روئی تھی اور جس نے ہم کو اس نئے تجربے پر اس طرح آمادہ کیا گویا برسوں کی تمنا پوری ہو رہی تھی اور برسوں کے انتظار کے بعد دیوبند اور علی گڈھ میں اتصال قائم ہو رہا تھا۔“ [۵]

سنگِ بنیاد

علی گڈھ کالج کی بڑی مسجد میں قومی درسگاہ کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور مولانا محمود الحسنؒ کس دل سوزی سے اپنے خطبۂ صدارت میں دل چیر کر رکھ رہے ہیں:

”اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس سے ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڈھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڈھ کا رشتہ جوڑا۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں

---

[۵] رسالہ ’جوہر‘ — جوبلی نمبر

کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ
علی گڑھ میری طرف آیا ہے "۔

باغی طلبار کو پولیس کے ذریعے باہر نکلوا دیا گیا۔ چند خیموں میں اس بظاہر بے سر و سامان قافلے نے قیام کیا اور اہل شہر نے اُس دن دونوں وقت کھانا لاکر کھلایا۔ مولانا محمد علیؒ نے ہر لڑکے کو الگ بلا کر قرآن پاک پر عہد لیا کہ جب تک انگریزی سامراج کا خاتمہ نہ ہو ہمارے لئے حکومت سے تعاون جائز نہیں۔ اس عہد و پیمان نے اِن چھ سو ہونہار باغی طلبار کو نیا حوصلہ اور امنگ بخشی اور ان کی زندگیاں قومی مقصد کے لیے وقف ہو گئیں۔

تعلیمی مصروفیت

درس گاہ کا نام جامعہ ملّیہ اسلامیہ رکھا گیا۔ مولانا محمد علیؒ پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے انہوں نے ہی عارضی نصاب تیار کیا اور خود انگریزی ادب اور جدید تاریخ کی تعلیم دینا شروع کی۔ ذاکر صاحب ان تمام مرحلوں میں مولانا کا پوری طرح ہاتھ بٹاتے، پڑھتے بھی تھے اور پڑھاتے بھی، اور ساتھ ہی ایک قلمی رسالہ پہلے "الرشید" اور بعد میں "جوہر" کے نام سے نکالا جو طلبار کی انجمن اتحاد کا ترجمان تھا [1]

علی گڑھ میں دو کوٹھیاں بھی کرایہ پر لے لی گئی تھیں۔ ایک بڑے کمرے میں ذاکر صاحب اور ان کے دو چھوٹے بھائی رہتے تھے۔ سعید انصاری صاحب جو اس درسگاہ میں بطور طالب علم کے تھے، کہتے ہیں:

---

[1] آگے چل کر یہ رسالہ چھپنے بھی لگا تھا۔ پھر بند ہو گیا۔

"جس چیز کا مجھ پر اثر ہوا وہ ذاکر صاحب کی زندگی، صحبت اور سلوک تھا۔ ان کی زندگی مجھے ایک سربستہ راز نظر آتی تھی جو بہم کسی خیال و عمل کی کوشش میں رواں دواں رہتی ہے ..... سرراہے جب کبھی مل جاتے تو کوئی اچھی بات بتا جاتے۔ ابھارنے والی بات کر جاتے۔ سلوک ایسا کہ ہمیشہ دل جوئی اور وابستگی کا خیال"۔ [۵۱]

برلن کو روانگی

ذاکر صاحب نئی قومی درسگاہ کے اہم رکن تھے۔ طلبا ریں بھی گھلے ملے، استادوں میں بھی شامل اور دونوں میں ہر دل عزیز۔ مگر اب انہیں کچھ دن کے لیئے جدا ہونا تھا یعنی معاشیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیئے جرمنی جانا تھا۔ ارادہ بہت دن سے تھا مگر موقعہ اب مل رہا تھا۔ جامعہ کے قیام سے دو سال بعد ۱۹۲۲ء میں سب ساتھیوں نے خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انہیں رخصت کیا [۵۲]

---

[۵۱] 'جوہر' جوبلی نمبر۔ [۵۲] جرمنی جانے کی مختصر کہانی یوں ہے کہ یو پی بورڈ آف ریونیو کے ایک نیک دل انگریز فری منیٹل نے جو ترک موالات اور خلافت وغیرہ کا مخالف تھا، ذاکر حسین نامی طالب علم کی غیر معمولی ذہانت کا ذکر سنکر ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور مل کر اس قدر متاثر ہوا کہ علی گڈھ کے کلکٹر کو خط لکھ کر انگلینڈ جانے کے لیئے پاسپورٹ کا انتظام کرا دیا۔ ذاکر صاحب نے پاسپورٹ تو لے لیا اور روانہ بھی ہو گئے۔ مگر انگلینڈ جانا گوارا نہ تھا اس لیئے اٹلی پر اتر گئے اور وہاں سے آسٹریا پہنچے اور سروجنی نائیڈو کے بھائی ویریندر چٹو پادھیا کے مشورے سے جرمن زبان (باقی اگلے صفحہ پر)

برلن میں برلن یونیورسٹی میں انہیں پروفیسر رومباٹ اور اسپرنگر وغیرہ کی رہنمائی حاصل ہوئی۔ جب وہ برلن پہنچے تو پہلے ہی سال وہاں کے ہندوستانیوں کی قومی انجمن اپنا صدر بنانا چاہتی تھی لیکن وہ اپنے حریف کے مقابلے کو مناسب نہ سمجھ کر دست بردار ہوگئے اور دوسرے سال بلامقابلہ صدر چُنے گئے۔ اُس زمانے میں مسز سروجنی نائیڈو کے بھائی مسٹر چٹو پادھیا اور آچاریہ وغیرہ بھی وہاں تھے۔ زندگی یہاں بھی انتہائی سادگی اور پاکیزگی کا اعلیٰ نمونہ رہی۔ برلن میں ان کے ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر مجیب تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین فرماتے ہیں :

> " سوا تین برس میرا ہر وقت کا ساتھ رہا ، میں نے اُنہیں ہر رنگ میں جو کھا پایا۔ سب سے زیادہ مجھ پر اس بات کا سکّہ بیٹھا کہ ذاکر صاحب " در ایام جوانی چناں کہ افتد و دانی " کی وادیٔ پُر خار سے بڑی پامردی کے ساتھ گذرے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں کانٹوں میں اُلجھے نہیں بلکہ اوسان قایم رکھے ، دامن بچائے قدم بڑھاتے چلے گئے برلن کے استادوں میں رومبارٹ وغیرہ سے بہت فیض اٹھایا "[۱]۔

برلن میں ذاکر صاحب نے جرمن زبان پر نہ صرف عبور حاصل کیا بلکہ ایک کتاب بھی مہاتما گاندھی کے مقصد حیات اور پیغام سے متعلق لکھی جو ۱۹۲۴ء میں وہیں

(بقیہ صفحہ ۶۹) سیکھنے کے لئے داخلہ کا فارم بھر دیا۔ جرمنی کا ویزا اس طرح آسانی سے حاصل ہوگیا جسے بعد میں بڑھوا لیا گیا اور برلن میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا۔

۱ [...] ' نقوش ' شخصیات نمبر (۱۰-۹) ص : [...] ثانی

شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں اپنی تقریروں سے جرمن عوام کو ہندوستان کے تہذیب و تمدن، عوامی مسائل اور مہاتما گاندھی کی شخصیت سے روشناس کرایا۔ اسی دوران میں وہاں آپ نے غالب اور حکیم اجمل خاں کا دیوان (دیوان شیدا) چھپوایا[1] لیکن ان مصروفیتوں کے باوجود جامعہ کی طرف سے غافل نہیں رہے اور یہاں تحریک خلافت کے سرد پڑ جانے پر جب جامعہ کے لئے کٹھن گھڑیاں آگئیں اور انہیں تار سے اطلاع دی گئی تو جواب آیا کہ "جامعہ کو بند نہ کیا جائے ہم اپنی زندگیاں اس کے لیے وقف کر چکے ہیں"۔

برلن ہی میں ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی ملاقات مس فلپس بورن سے ایک دعوت میں (مسز نائیڈو کی بہن کے مکان پر) ہوئی اور اسکے بعد ایسی ہی دوسری محفلوں میں ملنا ہوا۔ مس فلپس ذاکر صاحب سے بے حد متاثر ہوئیں اور انہیں برلن ہی میں جامعہ کے کاموں سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ جب بعد میں وہ یہاں آئیں تو انہوں نے ہندوستان کو اپنا ملک۔ اور

---

[1] یہ دونوں کتابیں اب نایاب ہیں۔ "دیوان شیدا" میری نظر سے گذرا ہے۔ چھوٹے سائز پر بے مثال گٹ اپ اور طباعت کا شاہکار ہے۔ اس میں قاضی عبدالغفار کا لکھا ہوا مقدمہ بھی شامل ہے اور یہ جامعہ کے لیے کاویانی پریس برلن سے شائع کیا گیا ہے۔ دیوان غالب ہندوستان میں بہت مقبول ہوا اور جلد ختم ہو گیا اس میں غالب کی جو تصویر دی گئی ہے وہ لائپزگ کے ایک مشہور آرٹسٹ نے بنائی تھی۔ دیوان غالب کو خود ذاکر صاحب نے کمپوز کیا تھا کیونکہ کاویانی پریس میں ہی انہوں نے کمپوزنگ کا کام بھی سیکھا تھا۔

اسلام کو اپنا مذہب بنا لیا اور جامعہ کی خدمت ہی کرتے کرتے دنیا سے سدھاریں

جامعہ پر آڑا وقت

پہلا تقسیم اسناد (کانوکیشن) ۸ ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو ہوا تھا جس کی صدارت حکیم اجمل خاں نے کی، دوسرے جلسہ اسناد میں مشہور سائنس داں پی۔ سی رائے نے اپنے خطبہ صدارت میں اسلام کو زبردست خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ "علم کی محبت اور صداقت کا احترام اسلام کے خمیر میں شامل ہے"۔ دو ہی سال بعد ۲۴ء میں وہ دن آگئے جب خلافت کی تحریک ناکام ہوگئی، ملک کے حالات بد سے بدتر ہونے لگے اور وقتی جوش کے تحت جامعہ قائم کرنے والے کنارہ کر گئے تو حکیم اجمل خاں نے دوڑ دھوپ کی، شریف منزل میں فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے کیے، کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا انہوں نے فرمایا:

"کچھ بھی ہو جائے جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا روپیہ کی دقّت ہے تو میں اس کے لیے بھیک مانگ لوں گا"۔

حکیم صاحب کی ہمت بندھی، مہاتما جی کی امداد و عنایت سے یہ مشکل گھڑیاں سہل ہوگئیں اور جامعہ دہلی منتقل کر دیا گیا جہاں قرول باغ میں کرایے کے مکانوں میں کام چلنے لگا۔ اسی دوران میں ذاکر صاحب کو بھی تار دیا گیا تھا جس کا ذکر آچکا ہے۔ ذاکر صاحب کے جواب نے کارکنوں کے حوصلے بلند رکھے۔ اسی زمانے (۱۹۲۵ء) میں حکیم اجمل خاں یورپ گئے اور پیرس میں ذاکر صاحب اور ان کے دو ساتھیوں سے گفتگو بھی ہوئی۔

شیخ الجامعہ

فروری ۲۶ء میں ذاکر صاحب مع اپنے ساتھیوں کے واپس آگئے۔ اس موقعے پر دعوتیں اور سپاسنامے ہوئے "جوہر"

کا خاص نمبر نکلا اور جامعہ کو نئی زندگی مل گئی۔ ذاکر صاحب شیخ الجامعہ مقرر ہوئے تین سو[۳۰۰] روپیہ ماہانہ تنخواہ قرار پائی مگر جیسے جیسے دن گذرے اور جامعہ کی ترقی ہوئی آپ کی اس تنخواہ میں کمی ہوئی۔ یہاں تک کہ صرف پچھتر[۷۵] روپے رہ گئی اِن اُلجھنوں کی کہانی تو آگے آتی ہے یہاں صرف اتنا سُن لیجئے کہ انتظامیہ کمیٹی کے سامنے ذاکر صاحب خود ہر مرتبہ اپنی تنخواہ کم کر دینے کی تجویز رکھتے اور مالی دشواریوں کے پیش نظر ممبران مجبوراً اسے منظور کر لیتے۔ شروع میں ایک بار ایسا ہوا کہ جامعہ کے اخراجات کے لیے فوری طور پر (غالباً) ایک ہزار روپے کی ضرورت تھی حکیم اجمل خاں نے اس سلسلے میں ذاکر صاحب سے مشورہ کیا انہوں نے فوراً یہ تجویز کیا کہ دو سو روپے میری تنخواہ میں سے لے لئے جائیں اور دو سو[۲۰۰] عابد صاحب (جو اُس وقت وہیں موجود تھے) کی تنخواہ سے اور اسی طرح مجیب صاحب جو اگرچہ موجود نہیں لیکن اُن سے بھی لے لیجئے۔ یہ سب چھ[۶] سو روپیہ ہو گیا باقی کا انتظام حکیم صاحب نے کیا۔ اس زمانے میں (۲۷-۱۹۲۶ء) حکیم اجمل خاں امیر جامعہ اور ڈاکٹر انصاری معتمد تھے۔

قومی اتحاد کا درس

تحریک خلافت نے جو اتحاد ملک میں پیدا کیا اس سے انگریزی حکومت کو سخت تلملاہٹ تھی چنانچہ یہ انتقام اس نے اس طرح لے لیا کہ شدھی سنگھٹن اور تبلیغ کی تحریکیں شروع کرا دیں۔ اب انقلابی تحریک سرد پڑ چکی تھی اور ملک میں فسادات شروع ہو گئے لیکن جامعہ بدستور اپنے مقصد کی طرف قدم اٹھائے بڑھ رہا تھا۔ یہاں طلباً قومی اتحاد کا درس لے رہے تھے۔ چنانچہ ایک بار جب مولانا ابوالکلام آزاد اور

مسز سروجنی نائیڈو جامعہ آئے تو ایک لڑکے نے قریب جاکر کہا " آج کل بلوے ہو رہے ہیں آپ لوگ ہندو مسلمانوں میں میل جول نہیں بڑھاتے ، بڑے ہو کر ہم یہ کام کریں گے "۔ مسز سروجنی نائیڈو نے لڑکے کو گلے لگا کر کہا " اس ہمت کی تعریف کرتی ہوں مگر تمہارے بڑے ہونے تک ہم لوگوں سے جو کچھ ہو سکتا ہے کریں گے" اسی زمانے میں صدر کانگریس مسٹر سری نواس بھی آئے اور اعتراف کیا کہ " دوسرے قومی مدرسے بے جان ہو گئے ہیں مگر یہاں زندگی ہے "۔

جامعہ کا پرچار اور چندہ

مالی مشکلات دور کرنے کے لیے اب ذاکر صاحب کو ہی کچھ کرنا تھا لہٰذا انہوں نے ملک میں دورے کرنے کا پروگرام بنایا۔ پہلے چھٹیوں کے دوران میں ایک وفد لے کر حیدرآباد گئے۔ دوسری بار جنوری ۱۹۲۶ء میں بہار کے دورے پر جانا ہوا۔ یہاں ۱۰ فروری کو حکیم اجمل خاں بھی ان حضرات سے آملے۔ پانچ دن میں کئی جگہ تقریریں ہوئیں اور معقول رقم وصول ہوئی۔ یہ لوگ ایک دن میں تین چار سو میل موٹر میں سفر کر لیتے تھے[۱] ان دوروں کا مقصد صرف چندہ ہی نہیں تھا بلکہ جامعہ سے لوگوں کو روشناس کرانا، قومی تعلیم کے شوق کو پھر سے زندہ کرنا اور تعلیمی کام کرنے والوں سے بات چیت کرنا بھی تھا۔

حکیم اجمل خاں کے انتقال (دسمبر ۱۹۲۷ء) کے بعد جامعہ کو اور بھی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ اب سارا بوجھ ذاکر صاحب پر ہی آپڑا تھا۔ چنانچہ جامعہ کو

---

[۱] عبدالغفار: حیات اجمل / ۳۲۲

مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لیئے فروری ۲۸ئ میں ایک بہت بڑا جلسہ پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں کیا گیا جس میں تمام چوٹی کے راہ نما جمع ہو گئے۔ عمارت کے لیے آٹھ لاکھ کا تخمینہ تھا، چودہ ہزار کے وعدے ہوئے اور ان کے نام ذاکر صاحب نے جلسے میں سنائے۔ ڈاکٹر عابد حسین، مجیب صاحب اور ذاکر صاحب نے اپنی تنخواہیں کم کر دینے کی پیش کش کی۔

جامعہ کی مالی مشکلات

مہاتما گاندھی نے جامعہ کی مالی اُلجھنوں کے لیئے "اجمل جامعہ فنڈ" قائم کیا اور چندے کی اپیل کی۔ نومبر ۲۸ئ میں ایک وفد جو مولانا آزادؒ، ڈاکٹر انصاری مولانا محمد علیؒ اور ذاکر صاحب پر مشتمل تھا مدراس وغیرہ گیا۔ یہ لوگ ۱۹ نومبر کو مدراس پہنچے وہاں تقریروں کے ذریعے جامعہ کے مقاصد کی وضاحت کی اور مہاتما جی کی اپیل سنائی جس پر مدراس کے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں نے بھی چندے میں شرکت کی[۱] اس سے پہلے ذاکر صاحب کی سرکردگی میں اعظم گڈھ جون پور۔ الہ آباد اور بنارس بھی وفد جا چکا تھا۔[۲]

ذاکر صاحب نے مالی مشکلات دور کرنے کی سبیل نکالی کہ "انجمن تعلیم ملی" کی بنا ڈالی جس میں یہ شرط رکھی کہ جو کارکن اس کے ممبر ہوں گے اُن میں کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے زیادہ نہ لے گا۔ اکثر حالتوں میں اس سے بھی بہت کم

---

[۱] رسالہ 'جامعہ' جنوری ۲۹ئ

[۲] مُصلی: جامعہ کی کہانی - ۱۲۳

پر ان لوگوں نے اکتفا کیا اور وہ بھی تھوڑے بہت دن نہیں، کئی کئی سال۔ انجمن کے صدر ڈاکٹر انصاری، سکریٹری ذاکر صاحب اور خزانچی جمنالال بجاج مقرر ہوئے۔

جامعہ اور مہاتما گاندھی

جامعہ سے ہمیشہ مہاتما گاندھی کو دلی لگاؤ رہا۔ ان کے بیٹے دیوداس گاندھی جامعہ کے اسٹاف میں شامل تھے۔ اپنے پوتے رسک لال کو انہوں نے یہاں تعلیم پانے کے لئے داخل کرایا۔ لیکن اس کا دوران تعلیم میں ہی انتقال ہو گیا اس کے بعد جب مہاتما جی یہاں آئے تو لڑکوں کو دیکھ کر کہا "میرا غم دور کرنے کے لیے یہ بچے بہت ہیں"۔ جامعہ کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "جامعہ کو مسلمانوں کی زندگی کا صحیح نمونہ ہونا چاہیئے"۔ [۵۱]

حصول اقتدار کے موقعے

اس زمانے میں ذاکر صاحب کا تمام قومی راہ نماؤں سے سابقہ رہا۔ مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خاں کا ان کی سیرت نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا "گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی، حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنایا تو حکیم اجمل خاں کے خلق و مروت صبر و حلم نے اس پر جلا کر دی"۔ [۵۲]

دنیاوی اقتدار یا مال و متاع کے حصول کی کوشش کیسی۔ اس مرد درویش نے ایسے ایسے کتنے ہی موقعے جان بوجھ کر ٹھکرا دیئے۔ اس حقیقت پر گواہ دو قر[ب]

---

۵۱ "جامعہ کی کہانی"۔

۵۲ "نقوش" شخصیات نمبر

ترین دوستوں رشید صاحب اور عابد صاحب سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ پہلے عابد صاحب کے الفاظ میں سنیئے کہ

"پبلک لیڈری کے موقعے جن کے لیے ذاکر صاحب کے ہم چشم ہزاروں جتن کرتے تھے ان کو بے مانگے مل رہے تھے مگر انہوں نے بے تامل چھوڑ دیئے" [1]

اور پھر رشید صاحب کی زبان سے :

"ذاکر صاحب نے کبھی اثر و اقتدار کے حصول کی کوشش نہ کی، اثر و اقتدار البتہ برابر اس کی کوشش کرتے رہے (مجھے ایک ایک کا علم ہے) کہ ذاکر صاحب ان کو قبول کر لیں لیکن اُنہوں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہ کی میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں ذاکر صاحب کو اپنے نفس کو زیر کرنے میں کوئی زحمت اٹھانی نہ پڑی ہوگی۔ جس طرح ریڈیو سٹ میں صرف مقررہ مخصوص لہریں بار پاتی ہیں اور دوسری تمام لہریں اس سٹ کے لیے بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اچھے اور برگزیدہ انسان کے دل کے تاروں کو وہی خیالات و جذبات مرتعش کر سکتے ہیں جو خود اچھے اور برگزیدہ ہوں" [2]

عیسائی طلبائے کے اجلاس میں

دسمبر ۲۸ء میں تمام دنیا کے عیسائی طلبار کی انجمن کا اجلاس میسور میں

---

[1] "نقوش" شخصیات نمبر۔ [2] "ذاکر صاحب" - ۸

منعقد ہوا جس میں مختلف ملکوں اور مذہبوں کے نمایندے شریک ہوئے اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے ذاکر صاحب کو دعوت دی گئی تھی چنانچہ آپ نے یہاں ایک مبسوط اور مدلل تقریر میں اسلام کی تشریح کی۔ یہ تقریر اس قدر پسند کی گئی کہ کانفرنس کے نمایندوں نے جن کے ذہن میں اسلامی تعلیمات کی طرف سے طرح طرح کی بدگمانیاں تھیں اپنے تعجب کا اظہار کیا اور اکثر نے کہا کہ "اگر یہ اسلام ہے تو ہم بھی مسلمان ہیں"۔

نمک ستیہ گرہ

۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ یہ تحریک نمک پر ٹیکس کے خلاف تھی۔ جامعہ میں بھی اس سلسلے میں جوش و خروش تھا۔ ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ جامعہ کا بنیادی کام ہی دراصل جنگ آزادی کے لئے سپاہی تیار کرنا ہے اور تعلیمی کام خود سب سے اہم قومی کام ہے۔ اس لئے جامعہ کے کارکنان کو کسی اور طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تاہم انہوں نے جامعہ کے لوگوں کو تحریک میں حصہ لینے سے روکا نہیں اور چند لوگوں نے عملی طور پر حصہ لیا جس کی وجہ سے نظام حیدرآباد نے جامعہ کی گرانٹ بند کردی جو بعد میں کافی دوڑ دھوپ کے بعد دوبارہ جاری ہوئی۔

قومی ہفتہ

قومی ہفتے کے سلسلے میں جامعہ کے لوگوں نے چند نئے تعمیری کام کیے یعنی صفائی اور حفظان صحت کے علاوہ غریب مرد اور عورتوں کے روزگار کا انتظام انہیں روئی اور چرخہ مہیا کرکے کیا۔ اس موقعے پر ایک جلسے میں ذاکر صاحب نے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ

"میری آرزو ہے کہ اس قومی ہفتے کی یاد تم اس طرح مناؤ کہ اپنے اندر اپنی قوم اور اپنے ملک کی سچی خدمت کے جذبے کو وقتی اور عارضی اُبال میں ضائع نہ کرو بلکہ اسے مستقل عادت کے طور پر اپنی سیرت میں محنت و مشقت سے اس طرح راسخ کرلو کہ وہ تمہاری فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ جس ملک میں ہزاروں نہیں لاکھوں، لاکھوں نہیں کروروں انسان وباؤں میں مکھی اور مچھر کی طرح مر جاتے ہیں اور کوئی نہیں جو انہیں صفائی اور حفظانِ صحت کے اصول سکھائے اور جس ملک میں کروروں انسان بلا ایک مرتبہ بھی پیٹ بھر کھانا کھائے جئے جاتے ہیں اور کوئی نہیں جو اُن کے افلاس اور ان کی جبری بیکاری میں سہارا دے سکے وہاں سچی خدمت کے مواقع کی کیا کمی ہے .... مجھے جامعہ کے سب طلبا سے توقع ہے کہ وہ اپنی قوم اور ملک کے مفاد کو اپنی شخصی شہرت اور منفعت پر ترجیح دیں گے" [۱]

اسی زمانے میں گروکل کانگڑی کے سالانہ جلسے میں ایک ادبی کانفرنس (سرسوتی سمیلن) کی صدارت کے لیئے ذاکر صاحب کو دعوت دی گئی تھی۔

نئے تجربات

ذاکر صاحب کا ذہن ہر وقت جامعہ میں نئے تعلیمی طریقوں کے تجربات میں ڈوبا رہتا تھا۔ انہوں نے ۲۹ء میں ایک پلان بنا کر استادوں کی ٹریننگ کا کام شروع کیا اور انہیں امریکہ کے چرچ مشن کے ایک ٹریننگ اسکول میں بھیجا جو موگا (پنجاب) میں نئے

---

[۱] مدھولی: "جامعہ کی کہانی" - ۱۳۰

طریقوں (پروجیکٹ میتھڈ۔ اسٹوری میتھڈ وغیرہ) پر کام کر رہا تھا۔ اس طرح ہاتھ کے کاموں کو بچوں اور مدرسے کی زندگی کا جزو بنانے کا مفید تجربہ پہلی بار شروع کیا[۵] یہی ہاتھ کے کام کی تجویز وہ بنیاد تھی جس پر ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے واردھا کانفرنس منعقد کی اور ذاکر صاحب نے وردھا اسکیم کا خاکہ تیار کیا جس کا مفصل ذکر اپنی جگہ پر آرہا ہے لیکن کچھ عجب نہیں کہ ذاکر صاحب نے ہی مہاتما جی کو اس طرف متوجہ کیا ہو

جامعہ کے لیے زمین

اسی زمانے میں ذاکر صاحب نے حیدرآباد دکن کا دورہ کیا جہاں سے جامعہ کے لیے مالی امداد حاصل کرنے میں خاصی کامیابی ہوئی اور اس روپے سے جامعہ کے لیے دہلی شہر سے آٹھ میل دور جمنا کے کنارے خریدی گئی۔ اسی جگہ پر آج کل جامعہ نگر آباد ہے۔

لڑکی کا انتقال

اسی دوران کا اہم واقعہ ان کی لڑکی (ریحانہ) کا انتقال ہے اور قابل ذکر اس لیے ہے کہ ان کے کردار کی ایک جھلک اس میں نظر آتی ہے۔ ہوا یہ کہ ایک سالانہ امتحان کے جلسے میں ذاکر صاحب حسب معمول بچوں کو بتاشے تقسیم کر رہے تھے کہ اتنے میں کسی نے آکر چپکے سے ان کے کان میں کوئی بات کہی۔ ذاکر صاحب نے جواب میں کچھ کہا اور بتاشوں کی تقسیم میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی آدمی پھر آیا اور کوئی بات کہی ذاکر صاحب کے چہرے پر اداسی چھا گئی، پھر جلد ہی وہ سنبھل گئے اور بتاشوں کی

---

[۵] جامعہ کی کہانی: ۳۴ — ۱۳۷

تقسیم کے بعد بچوں کو مبارک باد دی۔ جلسے کے بعد معلوم ہوا کہ پہلی خبر ایک حادثے کی تھی جس سے اُن کی لڑکی دوچار ہوئی اور دوسری خبر اس کے انتقال کی تھی[1]

حلقۂ ہمدردانِ جامعہ جامعہ کے نئے تعلیمی تجربات اور اُس کے لیے روپے کی فراہمی کا ایک مستقل سوال درپیش تھا جس کے لیے ذاکر صاحب نے ہمدردانِ جامعہ کا حلقہ قائم کیا۔ اس پلان کے تحت انھوں نے وفد بنا کر ملک کے مختلف حصوں میں دورے کیے، عوام وخواص کو بات چیت اور تقریروں کے ذریعہ جامعہ سے متعارف کرایا اور اس کی امداد پر آمادہ کیا۔ چنانچہ جو لوگ چار آنے آٹھ آنے تک بھی ماہوار دے سکتے تھے ان کو حلقۂ ہمدردانِ جامعہ، کا ممبر بنا لیا گیا۔ وفد کو خاصی کامیابی ہوئی۔ دہرہ دون سہارنپور اور بجنور وغیرہ سے ایک ہزار روپیہ سالانہ چندے کے وعدے ہو گئے۔ جامعہ کے سالانہ مصارف کے لیے جس رقم کی اپیل ذاکر صاحب نے کی تھی اس کا تقریباً ایک چوتھائی تو دہلی اور اس کے آس پاس فراہم ہو گیا۔ جون جولائی اور اگست ۳۴ء میں حیدرآباد، بھوپال وغیرہ میں بھی بہت کام ہو گیا اور یہ تمام زمانہ دوروں ہی میں تمام ہوا۔

صبر و ایثار کی مثالیں ادھر تو جامعہ کی مالی مشکلات حل کرنے کا یہ سامان ہو رہا تھا اور اُدھر جامعہ کے کارکن صبر و قناعت اور محنت و مشقت کی مثال پیش کر رہے تھے۔ کام کا بار ایک نے دو دو آدمیوں کا

---

[1] "جامعہ کی کہانی" / ۱۶۵

سنبھالا ہوا تھا لیکن یہاں بھی سب سے آگے آگے تھے ڈاکٹر ذاکر حسین!۔
شیخ الجامعہ تو وہ تھے ہی مگر کام ان کو اپنے پرائیویٹ سکریٹری کا، کلرک کا، خزانچی کا اکاؤنٹنٹ وغیرہ کا خود ہی انجام دینا ہوتا اور پھر اتنا ہی نہیں، ان کاموں کے لیے روپیہ بھی خود ہی فراہم کرنا، عمارتوں وغیرہ کی دیکھ بھال بھی کرنا، چھوٹے بڑے کلاسوں کو پڑھانا تو بہر حال تھا ہی۔ اس پر طرہ یہ کہ مالی مشکلات اور پریشانیاں اور اپنی تنخواہ گھٹا دینے کی خود ہی تجویزیں ـــــــ!

رشید صاحب کی زبانی ایک واقعہ سنیئے:

"کئی سال ہوئے دولت آصفیہ سے جامعہ کو گراں قدر مالی امداد ملی۔ ذاکر صاحب سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی میں نے ان کو مبارک باد دی تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے" رشید صاحب آج گیارہ سال بعد جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دی جاسکی ہیں متحیر رہ گیا میں نے کہا ذاکر صاحب یہ واقعہ جامعہ کی تاریخ میں ہی نہیں، ہماری قومی تاریخوں میں یاد رکھا جائے گا" [1]

مس گرڈا فلیپس بورن ایک جرمن خاتون مس فلیپس بورن بھی ہندوستان آئیں اور اپنے کو جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ ۳۲ء میں آپ نے کنڈر گارٹن کی جماعت کھولی اور جامعہ برادری میں آپا جان کہلائیں۔ ان کی ہر دلعزیزی اور یگانگت کا اندازہ لگانے کے لیے

---

[1] رشید احمد صدیقی: ذاکر صاحب۔ ۱۲۰

"تعلیمی خطبات" کے انتساب کی یہ عبارت دیکھئے:

"آپا جان! اس کتاب کے آخری حصے آج چھپ کر آئے ہیں — ان تقریروں میں میں نے جو کچھ کہا اور جس طرح کہا ہے، اس میں آپ کا بہت حصہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ اجازت دیں تو اس مجموعے کو آپ کے نام منسوب کروں۔......"

آپ کا ساتھی

ذاکر حسین

آپا جان نے بھی جامعہ کے اسٹاف کی طرح ایثار و قربانی کی نادر مثالیں پیش کیں۔ نہ صرف بہت بہت قلیل معاوضے پر کام کیا بلکہ خالی وقت میں دوسرا کام کرنے کا جو معاوضہ ملا وہ بھی ہمیشہ کنڈر گارٹن میں لگا دیا۔ وہ ذاکر صاحب کے کردار و سیرت سے بے انتہا متأثر تھیں۔

خالدہ ادیب خانم کی رائے

ترکی کی مشہور ادیب اور لیڈر خالدہ ادیب خانم بھی جنھوں نے ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کا دورہ کیا اور اپنا سفرنامہ کتابی صورت میں (ان سائڈ انڈیا) لکھا، ذاکر صاحب کی شخصیت کا گہرا اثر لے کر گئیں۔ اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

"کوئی ہندوستانی تعلیم یافتہ جس سے میں ملی ایسا نہ تھا جس نے یہ سوال نہ کیا ہو کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے ہم وطنوں میں جیسا ان ہیں اسی کے ساتھ اُن سے زیادہ کھرا آدمی ملنا غیر ممکن ہے .... جب میری

اُن سے میونک (جرمنی) میں ملاقات ہوئی تو ان کی عمر بائیس سال سے کچھ ہی اوپر تھی لیکن داڑھی موجود تھی اور انھیں جوان کہنا محال تھا۔ اس خشک مزاج طالب علم کے ساتھ جو صریحاً پختگی کو پہنچ گیا تھا دوسرے نوعمر طالب علم مجیب نامی تھے ....

آگے چل کر وہ ان کے عادات و کردار کا نقشہ بھی ان الفاظ میں کھینچتی ہیں:

"وہ قریب قریب اپنے معمول، یعنی اپنے خیالات میں گُم سے نظر آتے ہیں ..... لیکن میں نے اس جامد چہرے کو رنگ بدلتے دیکھا ہے۔ میں نے ان کو نہایت غصے میں اور ترس کھا کے آنسو بہاتے بھی دیکھا ہے۔ تاہم ہمیشہ اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں ..... اس ٹھنڈی مٹی کے شخص کو جو چیز بہت مشتعل کرتی ہے وہ کمینہ پن، جھوٹ اور خود غرضی ہے .... وہ مذہبی آدمی ہیں اگرچہ مذہب کے متعلق زیادہ باتیں نہیں کرتے۔"

اور آخر میں نتیجہ نکالتی ہیں کہ:

"اسلامی دنیا اگر اپنے مذہب کو جو اس کے اخلاق کی بنیاد ہے ترک کیے بغیر جدید ہونا چاہتی ہے تو اسے عام طور پر ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقلید کرنی چاہیے۔ تجربے اور اسلامی دنیا کے بے لاگ مطالعے نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا ہے۔" [1]

خانم کی حیرانی

خالدہ ادیب خانم جامعہ آئیں، لکچر بھی دیئے اور دل و دماغ پر نہ مٹنے والے نقش لے گئیں۔ جامعہ کے بارے

---

[1] اندرونِ ہند (ترجمہ اِن سائڈ انڈیا)۔ ۱۰۹

میں اپنی کتاب میں پورا ایک باب تحریر کیا ہے اور تفصیل سے اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے یہاں اتنی گنجائش تو بھلا کہاں ہے مگر انہی کے دو اقتباسات سے یہ دل کش نظارہ اور کر لیجئے بچوں کی ایک نشست گاہ کے بارے میں کہتی ہیں :

"یہاں سوائے دریوں کے اور کوئی سامان نہ تھا ..... یہ زیادہ تر چھ سے نو سال تک کے بچے تھے اور معدودے چند لڑکیاں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین سب کے چہیتے ہیں سب سے چھوٹے بچے قطاروں میں سے رینگ رینگ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک درخت معلوم ہونے لگے جس کے ہر پہلو پر جیتے جاگتے پودے لپٹے ہوں۔ انھوں نے ان بچوں کو نہ پیار کیا اور نہ ان کو جدا کیا بلکہ ان کا جسم اس طرح مڑتا گیا کہ یہ ننھی مخلوق آرام سے جگہ حاصل کر لے ...... یہ بچے انگریزی نہیں جانتے تھے لہذا ڈاکٹر ذاکر حسین نے ترجمانی کی۔ میں نے پوچھا تم کیا بننا چاہتے ہو؟ زیادہ تر سوداگر پھر ڈاکٹر اور ایک بچہ جہازی بننا چاہتا تھا...... مگر کوئی بچہ سرکاری عہدہ دار یا سپاہی بننے کا خواہش مند نہ تھا جسے میں نے بہت اچھی علامت تصور کیا۔"

مختصر یہ کہ جامعہ کے بارے میں انھوں نے یہ اعتراف کیا :

"جامعہ میں آزادی اور پابندئ ضوابط کو اس خوبی سے ملایا گیا ہے کہ مجھے یہ چیز اس کا سب سے بہتر اور باوقعت کارنامہ معلوم ہوا۔"

معاشیات پر لکچر | ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے ذاکر صاحب کو معاشیات (اکانومکس) پر مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس کا پہلا باب ریل میں لکھا گیا۔ رشید صاحب ہمراہ تھے اور یہ روداد سفر بڑے پر لطف طریقے پر انھوں نے بیان کی ہے (جی تو چاہتا ہے کہ ان کے الفاظ میں دہرائی جائے مگر طوالت کے خوف سے دل پہ جبر کرنا پڑ رہا ہے) غرض یہ کہ مقالہ جب پڑھا گیا تو "الہ آباد میں اس مقالے کی دھوم مچ گئی۔ بڑے سے بڑا افلاطون جمع تھا ہر ایک یہی کہتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو جیسا سنا تھا اس سے بھی اونچا پایا"۔[۱] یہ مقالات کتابی صورت میں بھی چھپے ہیں اور ان کا اردو ترجمہ 'معاشیات، مقصد اور منہاج' کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔

جامعہ کی نئی عمارت | یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو اوکھلا میں جامعہ کی نئی عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ کام جامعہ کے سب سے چھوٹے بچے کے ہاتھوں ہوا۔ اس تقریب پر خالدہ ادیب خانم بھی موجود تھیں۔ انھوں نے اس موقعے کا حال اپنی کتاب میں یوں لکھا ہے:

"آخری مرتبہ میں نے جامعہ کو اس موقعے پر دیکھا جب اس کے ارکان دہلی کے باہر اپنی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے جمع ہوئے...... یہ رسم ایک بڑے شامیانے کے نیچے ادا ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری صدر تھے اور

---

[۱] "ذاکر صاحب" /۷۴

بڑے بڑے ہندو مسلمان اکابر جمع تھے۔ بڑی بڑی رقمیں ہندوؤں نے
دی تھیں لیکن مسلمان عوام نے بھی چندے دیئے تھے اور اپنی قلیل
آمدنی میں سے جس طرح بن پڑا پابندی سے چند آنے اس کام کے لیے
نکالے تھے یہ بڑی تعریف کے قابل بات ہے" [۱]

سنگِ بنیاد کے اس جلسہ میں ایک ہزار سے زیادہ آدمی سواری کی دقّت کے باوجود پہنچے۔ یہاں ذاکر صاحب نے جوش و متانت سے لبریز تقریر کی۔

---

[۱] "اندرونِ ہند" / ۱۲۴-۱۰۱

باب ۳

واردھا اسکیم

واردھا اسکیم ہندوستان کے تعلیمی ڈھانچے میں انقلاب لانے اور اسے ملک کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش تھی۔ یہ اسکیم مہاتما گاندھی کی راہ نمائی میں مرتب ہو کر صوبائی (کانگریسی) حکومتوں کے عمل درآمد کے لیے پیش کی گئی۔ اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ ناقص تعلیمی نظام کی بجائے جو ملک میں بے روزگاری اور دفتری کلرکوں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے، ایک نیا پلان بنایا جائے جو بچوں کو تعلیم کے ساتھ ان کی ضرورت اور ماحول کے مطابق صنعت و حرفت کی طرف رجحان پیدا کرے اور ساتھ ہی حکومت یا عوام پر اخراجات کا بوجھ بھی نہ پڑے۔

۱۹۳۷ء میں جب اکثر صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں بن گئی تھیں مہاتما

گاندھی نے انھیں اس طرف توجہ دلائی اور "ہری جن" میں مضامین لکھے۔ ذاکر صاحب اُس زمانے میں کبھی کبھی واردھا اور سابرمتی جاتے اور قومی تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات مہاتما گاندھی کے سامنے رکھ کر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اسی گفت گو کے نتیجے کے طور پر اس اسکیم کا تخیّل پیدا ہوا۔[1]

یہ کہانی دراصل اس طرح ہے کہ مدراس کی کانگریسی حکومت نے شراب کی تیاری اور خرید و فروخت بند کرنے کا ارادہ کیا مگر اس راہ میں آڑے آتے تھے تعلیمی ادارے کہ یہ محصول بند ہونے سے جن کی جان پر بن آئی تھی اور یہ صورت حال اکثر صوبوں میں تھی۔ مہاتما گاندھی نے یہ دیکھ کر اپنے اخبار "ہری جن" کے ذریعے تجویز کیا کہ تعلیم کو اپنا خرچ آپ برداشت کرنا چاہیئے۔ تاکہ حکومت کا کام آسان ہو اور بے روزگاری دور ہو۔ یہ تب ہی ہو سکتا تھا کہ جب محض کتابیں پڑھا دینے کی بجائے دست کاری کی بھی تعلیم دی جائے اور اتنا مال تیار کیا جائے کہ جسے بیچ کر اسکول اپنے اخراجات پورے کر سکیں یہ معاملہ اتنا سلجھا ہوا نہیں تھا کہ صرف چند مضامین لکھنے سے کام بن جاتا اس لیے واردھا میں تعلیم کے ماہروں اور کانگریسی وزیروں کی ایک کانفرنس ہوئی۔

واردھا کانفرنس یہ کانفرنس ۲۱، ۲۲ / اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مہاتما جی کی صدارت میں ہوئی۔ پہلے گاندھی جی نے

---

[1] لنک ویکلی، نئی دہلی۔ ۱۴/ مئی ۶۸ء

اپنے خیالات پیش کیے، اعلیٰ اور ابتدائی تعلیم کو الگ کر دینے کی تجویز رکھی۔ شہروں سے زیادہ دیہات کی اہمیت بتائی، ابتدائی تعلیم کے لیے مدت بجائے چار سال کے سات سال کرنے اور اس میں ثانوی تعلیم شامل کر کے پوری مدت کے لیے ایسا مسلسل نصاب بنانے پر زور دیا جس کا مرکز کسی دستکاری کو بنایا جائے اور باقی مضامین اسی کے ساتھ متعلق ہوں اس طرح اسکولوں میں کام بھی سکھایا جائے اور بچے کی ذہنی تربیت بھی ہو تاکہ وہ گاؤں چھوڑے بغیر اپنا آبائی پیشہ ذریعۂ معاش بنا سکیں اور ان کے ذہن و دماغ کی ایسی تربیت ہو جس سے ترقی کا حوصلہ کر سکیں۔ مدرسوں کا نظامِ عمل ایسا ہو کہ وہ اپنا خرچ آپ برداشت کریں۔

مہاتما گاندھی کی ان تجاویز نے ماہرین تعلیم اور وزیروں کو پریشان کر دیا۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ تعلیم اپنا خرچ آپ برداشت کر سکتی ہے۔ وہ تعلیم کی پیچیدگیوں اور استادوں کی کوتاہیوں سے واقف تھے، اخراجات کا انھیں اندازہ تھا۔ چنانچہ گاندھی جی نے جب اپنی تقریر ختم کر کے سب کی رائے دریافت کی تو وہ سب کچھ دیر نیچی نظریں کیے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ یہ دیکھ کر ذاکر صاحب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس بات سے اتفاق کیا کہ سچی تعلیم وہ ہے جس میں انسان کی تمام صلاحیتیں پھلیں پھولیں انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کا یہ خیال کہ وہ تعلیم کو بالکل نئی صورت دے رہے ہیں صحیح نہیں ہے اس لیے کہ جرمن استاد پستالوزی لوٹز ہی نے اسی طریقے کو سب سے بہتر مانا ہے اور اس کے بعد اس خیال کی بنیاد پر سیکڑوں معلموں نے

تجربہ کرکے عملی روپ دینے کی ترکیبیں نکالی ہیں لیکن طریقہ اتنا محدود نہیں جتنا
کہ گاندھی جی نے ظاہر کیا کیونکہ صرف تکلی اور چرخے کے ذریعے ہر علم وفن نہیں
سکھا جا سکتا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے لیے سات سال کی مدت رکھنے
سے بھی اختلاف کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ تعلیم اس وقت ختم ہو جائے گی
جو دراصل صلاحیتوں کے ظاہر ہونے کی عمر ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ
تعلیم وتربیت نامکمل رہ جائے گی۔ انھوں نے رائے دی کہ مخصوص صلاحیتوں
کے مدرسے قائم کیے جائیں مثلاً ایک دستکاری اور صنعتی تعلیم کے لیے ہو تو دوسرا
ریاضی اور سائنسی علوم کے لیے وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے تجویز کیا کہ چونکہ ہم
اس طریق تعلیم کو بہت بڑے پیمانے پر رائج کرنا چاہتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ
ہم چند ادارے خاص جگہوں پر قائم کریں اور وہاں اس کا تجربہ کرکے ایسے
نمونے بنالیں جن کی پھر عام طور سے نقل کی جا سکے۔ ورنہ ممکن ہے کہ
نئی تعلیم سے فائدے کی بجائے نقصان ہو۔

ذاکر صاحب کی یہ تقریر اور تجویز عام طور پر پسند کی گئی صرف پروفیسر
کے۔ ٹی شاہ کو مہاتما گاندھی کی تجویز سے بنیادی اختلاف تھا جنھوں نے
سوشلسٹ نظریات سے اسکیم کا جائزہ لیا لیکن اس سے انھیں بھی اتفاق
تھا کہ تعلیم ہاتھ کے کام کے ذریعے دینا چاہیے مگر اس میں بھی انھوں نے
زور دیا کہ ذاکر صاحب نے مخصوص صلاحیتوں کے مدرسوں کی جو تجویز پیش کی
تھی وہ بھی منظور کی جائے۔ اجلاس میں مولوی عبدالحق نے بھی تقریر کی۔

دوسرے اجلاس میں مہاتما جی نے اعتراضات کا جواب دیا۔

ونوبا اور کالیلکر وغیرہ صاحبان نے تقریریں کیں۔ سی پی کے وزیر اعظم مسٹر شکلا نے عام جبری تعلیم کے خرچ کا حل اس طرح نکالا کہ جہاں اسکول بنے وہاں اتنی زمین حاصل کر لی جائے جو استاد کی بسر اوقات کے لیے کافی ہو۔ اپنی اس نئی "اُپج" کا نام انھوں نے "وِدیا مندر اسکیم" رکھا تھا۔

کمیٹی کی قرارداد

مہاتما گاندھی کی خواہش پر اسی دن رات کو کانفرنس نے بطور کمیٹی، ذاکر صاحب کی صدارت میں ان تجویزوں پر غور کیا۔ سب کو بحث میں حصہ لینے اور تقریر کے کمالات دکھانے کا موقع بھی مل گیا اور کمیٹی نے چار رزولیوشن بھی کانفرنس کے سامنے پیش کر دیے۔ یعنی :

۱۔ ملک کے لیے عام جبری تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔

۳۔ اس مدت میں تعلیم کا مرکز کوئی دستکاری ہو۔ جو بچے کے ماحول سے چنا گیا ہو اور کچھ اس کے علاوہ سکھایا جائے جو اسی ربط اور تعلق سے ہو۔

۴۔ امید ہے کہ اس طریقۂ تعلیم سے آہستہ آہستہ اتنی آمدنی ہونے لگے گی کہ استادوں کا خرچ نکل آئے۔

ذاکر حسین کمیٹی

یہ چار رزولیوشن کانفرنس کے سامنے پیش ہو کر منظور ہوئے تو مہاتما جی نے نئی تعلیم کا نصاب بنانے

کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی اور ذاکر صاحب کو اس کا صدر بنایا یہ ذاکر حسین کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کی تشکیل یوں تھی:

صدر: ڈاکٹر ذاکر حسین

کنوینر: ای۔ ڈبلو۔ آر۔ نائکم

اراکین: خواجہ غلام السیدین۔ کشور لال مشروالا۔ کے۔ ٹی شاہ۔ جے۔ سی کمار اپا۔ ونوبا بھاوے۔ شری کرشنا داس جاجو۔ کاکا کالیلکر۔ آشا دیوی۔

اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ شروع دسمبر ۱۹۳۷ء میں مہاتما جی کی خدمت میں پیش کی۔ [۱]

اب ذرا کمیٹی اور کانفرنس کی خشکی سے نکل کر ایک دلچسپ نظارہ بھی کر لیجئے اور دیکھتے چلیئے کہ یہ رپورٹ ذاکر صاحب نے کب، کہاں اور کس طرح مکمل کی۔

مقام ہے علی گڑھ اور مکان رشید صاحب کا، کمرہ ایسا کہ جو بیک وقت سونے، بیٹھنے، کھانے پینے، لکھنے پڑھنے اور دُوند مچانے کا کام دیتا تھا۔ اس میں بھی عالم یہ کہ ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی اسی سلسلے میں کچھ دوست ملنے آ گئے تو ان سے خوش گپی ہونے لگی۔ کتابوں، رپورٹوں، فائل وغیرہ کا انبار ہے۔ کاغذات پھیلے

---

[۱] رسالہ 'جامعہ'، دسمبر ۱۹۳۷ء۔ بنیادی قومی تعلیم (کمیٹی رپورٹ)

ہوئے ہیں۔ ٹریننگ کالج کے لوگ آگئے تو اُن سے تعلیمی مسائل پر بحث چھڑ گئی۔ کوئی خوانچے والا آگیا تو جو کچھ اس کے پاس رہا اسی سے شغل شروع کر دیا کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آگئے تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے شعر و شاعری کا شائق آگیا تو شعر خوانی کی مجلس گرم ہو گئی۔"...... غرض یہی ہنگامہ آرائیاں رہیں اور رپورٹ کا خاکہ بھی تیار ہو گیا تو اب ذاکر صاحب کو چند گھنٹے یکسوئی کے درکار تھے۔ چنانچہ کیا یہ گیا کہ انھیں ایک مکان کے بالاخانے پر پہنچا کر تالا لگا دیا گیا۔ اس لیے نہیں کہ کوئی خلل نہ ڈالے بلکہ بقول رشید صاحب "خطرہ تھا کہ خود مرشد نہ نکل جائیں"۔ دو گھنٹے نہ ہوئے تھے کہ ایک صاحب ملنے آئے، نوکر سے پوچھ گچھ کر ہی رہے تھے کہ ذاکر صاحب کو آواز پہنچ گئی، جھپٹ روشن دان میں اسٹول رکھ کر کھڑے ہو گئے، بولے:

"ارے میں یہاں مقفل ہوں۔ کنجی رشید صاحب کے پاس ہے لیکن کوئی مضائقہ نہیں آپ اس بات کا پتہ لگا لائیے"۔

اُنھوں نے کہا "ہاں رپورٹ نقل کر لایا ہوں"۔

فرمایا "سنائیے"۔ انھوں نے سنانا شروع کیا۔

اتنے میں رشید صاحب یونیورسٹی سے آئے تو "رومیو جولیٹ" کا یہ ڈرامہ نظر آیا۔ انھوں نے کہا "مرشد یہ کیا ہے؟"

کہنے لگے "ذرا ٹھہریئے گا۔ بس ایک منٹ"۔—— اوپر جا کر تالا کھولا تو سارا کام کیے چاروں شانے چت پڑے کچھ گنگنا رہے ہیں۔ پوچھا "یہ آپ کیا سن رہے تھے؟"

کہنے لگے" فلاں رپورٹ کا حوالہ دینا تھا ایک جگہ شبہ ہوتا تھا اس لیے ان صاحب سے کہا تھا کہ اصل رپورٹ دیکھ آئیں انھوں نے جو سنایا تو اطمینان ہو گیا کہ جو یاد تھا وہ ٹھیک تھا۔"[1]

یہ رپورٹ ایک ہفتے کے اندر مکمل ہو گئی۔ دسمبر ۳۷ء کے پہلے ہفتے میں کر دی گئی اور ۱۱ر دسمبر کو "ہری جن" میں چھپی۔

واردھا اسکیم کانگریس کے سامنے فروری ۳۸ء میں جب ہری پورہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو قومی تعلیم کے اس پلان پر غور کیا گیا اور ایک تجویز منظور ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ کانگریس قومی تعلیم کے مسئلے کی اہمیت ۱۹۰۶ء سے محسوس کرتی ہے۔ تحریک نان کوآپریشن کے زمانے میں اس کی نگرانی میں متعدد جگہ قومی مدرسے قائم ہوئے تھے ...... ہندوستان میں موجودہ تعلیمی نظام ناکامیاب رہا ہے اس کے مقاصد پرانے، غیر سوشل اور اینٹی نیشنل ہیں اور یہ لوگوں کی ایک چھوٹی تعداد تک محدود رہا ہے قوم کی کثیر آبادی کو اس نے جاہل بنا رکھا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ایک نئی بنیاد پر سب کے لیے قومی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اِس سلسلے میں کانگریس نے وہ چار تجویزیں جوں کی توں منظور کیں جو واردھا کانفرنس کی کمیٹی نے ذاکر صاحب کی صدارت میں منظور کی تھیں۔

---

[1] رشید احمد صدیقی: 'ذاکر صاحب' / ۱۸-۱۶۔

کانگریس کے رزولیوشن میں یہ بھی تجویز کیا گیا کہ ایک آل انڈیا ایجوکیشن بورڈ بنایا جائے تاکہ وہ بنیادی کام شروع کرے۔ اس غرض کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ای۔ آر یا نائکم سے درخواست کی گئی اور انھیں اختیار دیا گیا کہ وہ گاندھی جی کی ہدایت ونگرانی میں اس بورڈ کو قائم کرنے کی فوری کارروائی کریں۔ بورڈ کو اختیار دیا گیا کہ اپنا دستور آپ بنائے۔ [1]

اسکیم پر ایک نظر

واردھا اسکیم کا اصل مقصد ایک ایسا تصوّر پیش کرنا تھا کہ جو علم اور عمل میں، ہاتھ کے کام اور کتابی تعلیم میں، جسم اور دماغ میں، فرد اور سماج میں ہم آہنگی پیدا کر کے اُن بندھنوں کو جنم دے جو زندگی کے تقاضوں اور تعلیم کے درمیان سے غلامی نے توڑ دیئے تھے۔ اسکیم کی بنیاد یہ بنائی گئی ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۳۹ء میں مکتبہ جامعہ نے "بنیادی قومی تعلیم" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کی۔ یہ رپورٹ اور اس کا مفصل نصاب (کورس) ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ رپورٹ پانچ حصوں میں تقسیم ہے۔ یہ اُردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی چھپ چکی ہے۔

پہلے حصے میں بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں موجودہ تعلیمی نظام پر تنقید کرتے ہوئے نئے تعلیمی ڈھانچے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اسکولوں میں ہاتھ کے کام کی اہمیت واضح

---

[1] تنڈولکر: مہاتما۔ جلد ۴ ص ۲۳۲۔ ۲۴۴

کی گئی اور اسکیم کی تشریح کرتے ہوئے اپنا خرچ آپ نکالنے کی تدابیر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲) دوسرے حصے میں مقاصد بیان کیے گئے ہیں، بنیادی تعلیم کے سات سالہ کورس کا خاکہ پیش کیا ہے، بنیادی حرفے (دستکاری) جو اسکولوں کے لیے تجویز کیے گئے اُن میں کتائی، بُنائی، لکڑی کا کام، زراعت، چمڑے کا کام وغیرہ شامل ہیں۔ مادری زبان کے سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ "جن علاقوں میں ہندوستانی بولی جاتی ہے اُن میں مادری زبان ہو گی لیکن بچوں اور استادوں دونوں کے لیے لازمی ہو گا کہ ناگری اور فارسی دونوں خط سیکھیں تاکہ ہندی اُردو میں لکھی کتابیں پڑھ سکیں۔

(۳) تیسرا حصہ استادوں کی تعلیم سے متعلق ہے۔ اسکیم کی کامیابی کی سب سے بڑی شرط استادوں کی اچھی تعلیم ہے اور جب تعلیمی نظام کو ایک سرے سے بدلنا ہو تو یہ ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ استادوں کو صرف علمی مضامین ہی نہیں بلکہ حرفے بھی سیکھنا ہوں گے، زندگی اور کام میں ایک دوسرے سے ربط پیدا کرنا سکھایا جائے گا۔ اس حصے میں استادوں کی تعلیم کا پورا کورس مرتب کیا گیا ہے۔

(۴) چوتھا حصہ نگرانی اور امتحانات کے بارے میں ہے۔ اس میں موجودہ امتحانات کے طریقوں کو ناقص بتاتے ہوئے نئے طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔

(۵) پانچویں حصّے "انتظام" میں بنیادی تعلیم کے اسکولوں کے تمام انتظامات سے متعلق تفصیلات بیان کی ہیں۔

آخر میں ممبران کا ایک خط مہاتما گاندھی کے نام ہے جس میں اس اسکیم پر کیے گئے اعتراضات پر بحث اور اُن کے جوابات ہیں اور ساتھ ہی ساتویں جماعت تک کا مکمل کورس شامل کر دیا گیا ہے جس میں ضمیمے کے طور پر ایک ایسے مثالی اسکول کے لیے جس میں سات جماعتیں ہوں کُل زمین کا رقبہ، کمروں کی تعداد اور لمبائی چوڑائی وغیرہ دی گئی ہے۔

اسکیم پر اعتراضات اور رائیں

وارد ھا اسکیم منظر عام پر آئی تو اس پر تنقیدوں، تبصروں او اعتراضوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ ان میں گروہ تو وہ تھا ـــــ اور یہ ہمیشہ ہمارے دیش میں موجود رہا ہے ـــــ کہ جو اپنی آنکھوں پر مخصوص نظریات کی عینک لگا چکا تھا اور جو گاندھی جی کے ہر ہر قدم کو ایک خاص فرقے اور مذہب کے خلاف ثابت کرنے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا تھا۔ اس گروہ کی تسلّی کسی دلیل اور کسی ثبوت سے ممکن نہ تھی۔ نہ ذاکر صاحب نے اس گروہ کو جواب دینے کی تکلیف گوارا کی اور نہ آج مجھ میں یہ طاقت ہے۔ اس لیے مناسب ہو گا کہ صرف ایک ایسی معتبر اور مستند شخصیت کی رائے پر اکتفا کر کے آگے چلا جائے جس پر انگلی اٹھانے کی جرأت خصوصاً اس گروہ کو تو ہو نہیں سکتی۔ یہ شخصیت ہے مولانا عبدالماجد دریابادی، اور رائے سنیئے:

"اسکیم کا سرکاری نام واردھا اسکیم تھا۔ ودیا مندر کا نام اب خیال میں نہیں آتا کہ کس کا چلایا ہوا تھا بہرحال تعلیمات اسلامی کے خلاف اس میں کوئی چیز نہ تھی۔۔۔۔۔ گاندھی جی کی یہ جوہر شناسی اور بے تعصبی تھی کہ ملک کی قومی تعلیم کی اس بڑی اسکیم کے لیے انتخاب ایک مسلمان کا کیا تھا۔" [۱]

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ چاہے آج جیل میں ہوں یا جیل سے باہر مگر اُن کی شخصیت اور عظمت سے انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ رائے اُن کی بھی سن لیجیے جو ایک کتاب پر پیغام کی صورت میں دی گئی:

"ہندوستان میں صحیح اور مفید تعلیمی نظام کی بنیاد رکھنے کے سلسلے میں واردھا اسکیم آج ماہرین تعلیم کے لیے ایک ضروری چیز بن گئی ہے۔۔۔۔۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں تعلیم کا مقصد انسان کو اُس ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنے پر تیار کرنا ہے جو اس کے ماحول اور سماج نے مسلط کر دیا ہو اور ٹھیک یہی چیز تھی جسے گاندھی جی نے اپنی واردھا اسکیم میں پیش کیا تھا۔" [۲]

اخبار ایجوکیشنل (انڈیا)، (مسولی پٹم) نے لکھا:

---

[۱] 'صدق جدید'، ۲ رجون ۱۹۶۸ء

2. MATHUR (V. S.); Gandhi di as an Educationist.

"اس رپورٹ نے ان بنیادی اصلاحات اور تبدیلیوں کو جو تعلیمی نظام کی بہتری کے لیے ضروری ہے بے حد مفید اور مدلل طریقے سے واضح کر دیا ہے .... خوش قسمتی سے کمیٹی کو صدر ایسا ماہر تعلیم ملا ہے جو ہر لحاظ سے اس معزز جگہ کو پُر کرنے کے قابل تھا رپورٹ اپنا خرچ آپ اٹھانے والی تعلیمی تجویز کی بہترین ماہرانہ علمی تفسیر ہے .... ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کانگریسی کیا تمام صوبوں، بلکہ ریاستوں میں بھی اس رپورٹ کا تعلیمی نظریوں اور عمل پر گہرا اثر پڑے گا۔"

اخبار "ہندو" (مدراس) میں ایک استاد کے قلم سے:

"ہمارے ملک کی تعلیمی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ قومی ترقی کی شاہ راہ پر وہ خطرے کا نشان جو موجودہ ضرر رساں تعلیم کی حد بندی کرتا ہے۔"

مسٹر الیگزنڈر لارن زلیاکس (نیو ایجوکیشن فیلوشپ امریکہ کے صدر) کا خیال:

"ملک کی ابتدائی تعلیم کے معیار کو اونچا کرنے کے لیے زبردست جہاد کی ضرورت ہے اور واردھا اسکیم اس مقصد کے لیے مجاہدانہ اقدام ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی کی طرف سے پیش کی گئی ہے جس میں ایسے مجاہدانہ ارادوں کو عملی شکل میں لانے کا جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔"

رابندر ناتھ ٹیگور کی رائے:

"مہاتما گاندھی اپنی توجہ عوام کی تعلیم کے مسئلے کی طرف پھیری ہے .... جب اس تجویز پر عمل شروع ہو جائے گا تو ہمیں اس عملی بزرگ کی قابلیت کا جن کا عمل قول سے ہمیشہ بڑھ کر رہتا ہے ایک نیا ثبوت ملے گا۔"

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک کمیٹی مقرر کی جو واردھا اسکیم پر غور کر کے اپنی رائے پیش کرے۔ ذاکر صاحب کو اس کمیٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی اس کے علاوہ مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ نے اس رپورٹ پر بحث کی اور فیصلہ کیا کہ تعلیمی ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ کمیٹی میں ذاکر صاحب کو شامل کیا گیا۔

اعتراضات کا جواب

ذاکر صاحب نے ایک مضمون (رسالہ جامعہ مارچ ۱۹۳۸ء) میں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

"گاندھی جی نے حسب معمول سونے والوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے کر جگایا ہے اور ان لوگوں کو جو شکایت ہے وہ اصل میں پانی سے نہیں بلکہ پانی پھینکنے والے سے ہے۔ بعض اعتراضات تعلیم کے علاوہ غلط فہمی پر مبنی ہیں بعض "جدیدیت" کے زعم باطل پر اور گاندھی جی کے مفروضہ مقصد پر۔"

اس کے بعد "ترقی یافتہ" یا "ترقی پسند" طبقے کے اعتراضات کے جواب میں لکھتے ہیں:

"دست کاری کے ذریعے تعلیم دینے کی تجویز کو لوگ محض اس وجہ سے کہ اس کی ابتدا گاندھی جی نے کی ہے جو معنی چاہیں پہنائیں لیکن "ترقی پسند" نقادوں سے یہ التجا کرنا بے جا نہ ہوگا کہ شخصیت سے قطع نظر کرکے بجائے خود اس تجویز پر غور کریں۔ باوجود قدامت پسند ہونے کے کبھی گاندھی جی "جدید" چیزوں کی حمایت کرسکتے ہیں، اور کرتے ہیں......... اس نظام تعلیم کو جو ہندوستان میں رائج ہے دنیا دقیانوسی اور فرسودہ سمجھ کر چھوڑ رہی ہے........ اگر یہ حضرات جو دورِ حاضر کے پرستار ہیں جدید خیالات اور رجحانات سے واقف ہوتے تو وہ گاندھی جی کی وسعتِ نظر کی داد دیتے۔"

اسکیم پر دوسرے اعتراضات کا جواب:

"علمی تحقیقات سے اور روزمرہ کے مشاہدے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے پہلے بچوں کے رجحانات زیادہ تر عملی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعے سے سوچتے ہیں اور کرنے کے ذریعے سے سیکھتے ہیں گویا وہ نوع انسانی کی تاریخ کو دہراتے ہیں اس لیے کہ حقیقت میں دماغ کا رفتہ رفتہ ہاتھ ہی کے کام سے پیدا ہوا ہے۔ ہاتھ کا کام نہ صرف کُل فنون کی بلکہ کُل علوم کی بھی بنیاد ہے........ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی مفید ہاتھ کا کام یعنی کوئی صنعت بچے کی تعلیم کا مرکز قرار دی جائے۔ میرے خیال میں صرف یہی طریقہ ہے جس سے انھیں

تعلیم دی جا سکتی ہے .... اکثر شدت کے ساتھ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وار دھا اسکیم میں مفید دستکاری پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ محض میکانکی ہو کر رہ جائے گا جس سے بچوں کی طبیعت اکتا جائے گی بعض کا قول ہے کہ یہ بچوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بدترین صورت ہے۔ اکثر لوگ اس تجویز سے خفا ہیں کہ تعلیم اپنا خرچ آپ نکالے۔ میں ان سب حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ وار دھا کمیٹی کی رپورٹ لکھتے وقت یہ شبہات اور اندیشے ہمارے پیش نظر تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر ہم اُن نتائج پر پہنچے ہیں ...... نقّاد رپورٹ کو زیادہ غور سے پڑھتے تو ہم پر یہ الزام نہ رکھتے کہ رپورٹ لکھنے والوں نے ان چیزوں سے لاپروائی برتی ہے۔ باوجود ان سب خطروں کے ہمیں یہ گوارا نہ ہوا کہ ان سے ڈر کر ہم اس طریقے کو چھوڑ دیں جس کے سوا بچوں کی تعلیم کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ خطرے ہر کام میں ہوتے ہیں اور انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایسی سلامتی چاہتے ہیں کہ جس میں کوئی خطرہ نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ نہ کریں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں اگرچہ اس میں بھی شبہ ہے کہ اس طرح ہم سلامت رہ سکیں گے۔"

اور تقسیم اوقات کے بارے میں:

"ہمارے نقّاد طیش میں آ کر پکار اُٹھتے ہیں" ساٹھ فیصدی صرف دستکاری کے لیے اور چالیس فی صدی تعلیم کے لیے!"

مجھے اعتراف ہے کہ رپورٹ کے لکھنے والوں کے وہم وخیال میں بھی نہ تھا کہ دستکاری اور تعلیم ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ دستکاری سے تعلیم حاصل ہوگی۔ یہی ان کی ساری اسکیم کی بنیاد ہے

اس مضمون کے آخر میں اُنہوں نے لکھا:

"اِن سب اعتراضات نے جو اب تک اس اسکیم پر کیئے گئے ہیں میرے اس یقین کو متزلزل نہیں کیا ہے کہ اس اسکیم کے بنیادی اصول معقول اور ناقابل اعتراض ہیں۔ اُنہیں ایک روز ضرور عمل میں لانا پڑیگا اور ان کی مخالفت خواہ جس طرف سے بھی ہو ناکام رہے گی۔ جب یہ اصول دل سے تسلیم کر لیئے جائیں گے تو ہندوستان کی تعلیم میں اور قومی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا"

واردھا اسکیم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں بھی وردھا رپورٹ پیش ہوئی، مخالفت اور اعتراضات کیئے گئے اور نتیجے میں کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی بنائی گئی۔ اُس زمانے میں ذاکر صاحب اپنی آنکھوں کے علاج کے لیئے بمبئی گئے ہوئے تھے اور سخت تکلیف میں مبتلا تھے لیکن اسی حالت میں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی اور طبیعت نڈھال تھی، ایک خط نواب صدر یار جنگ (سکریٹری) کو لکھوایا جس میں کمیٹی کی بنیادی سفارشات کی اہمیت واضح کی گئی تھی اور آخر میں یہ شعر تھا:

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

لیکن اب لطف ملاحظہ ہو کہ اس "کمال یار جنگ کمیٹی" کے کام میں بھی امداد لی جاتی ہے تو اسی نشانۂ ملامت وردھا کمیٹی کے صدر ذاکر حسین سے!۔ اور یہ ماجرا سنیے رشید صاحب سے:

"ذاکر صاحب کی بلند نظری، دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کے مخالف بھی جب کبھی اُن کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انھوں نے نہ صرف بغیر پس و پیش کے بلکہ بڑے خلوص سے اُن کی مدد کی۔ واردھا تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلے میں اُن کو جس سفاہت اور سفاکی سے رسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے اور کوئی قابل فخر کارنامہ بھی نہیں۔ اس رپورٹ کے بعد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی طرح ڈالی جس کا کام اب تک ختم نہیں ہوا ہے لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ جس زمانہ میں اس کمیٹی پر ایک نازک دور گذر رہا تھا نواب کمال یار جنگ مرحوم جب کبھی دہلی آتے تو ذاکر صاحب سے ملتے اور کمیٹی کے کام کو حسن خاتمہ پر پہنچانے کی سبیل ذاکر صاحب سے دریافت کرتے اور اعانت کے طلب گار ہوتے۔ وردھا کمیٹی کی رپورٹ جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف منازل سے گذر کر صوبہ متحدہ کی حکومت میں پہنچی تو کانفرنس کی حمایت میں، اور کانفرنس کے ہی نقطۂ نظر کو ذاکر صاحب نے وہاں کے ماہرین کے سامنے واضح

کیا اور مزا پایا"۔ ۵۶

واردھا اسکیم اور جامعہ

واردھا اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جامعہ میں ۱۹۳۸ء میں اسکیم کی بنیاد اور پلان کے مطابق استادوں کا مدرسہ قائم ہوا اور اسی سال کانگریس نے مہاتما گاندھی کے ایما سے ذاکر صاحب کی قیادت میں ہندوستانی تعلیمی سنگھ قائم کی جس کے ذریعے مدرسے کو مالی امداد ملتی رہی۔ یہاں ہر استاد کو ٹریننگ کے دوران حرفے (دستکاری) لازمی سیکھنا ہوتے اور ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے پر زور دیا جاتا۔ کیونکہ ذاکر صاحب کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ "جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے اس کی تعلیم گاہوں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا کہاں کی دانشمندی ہے سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اُسی وقت ممکن ہے جب یہ مدرسے گنتی کے چند خود غرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سوادِ اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں"۔

کمیٹی کے ایک ممبر کی رائے

خواجہ غلام السیدین صاحب وردھا کانفرنس میں شریک تھے اور ذاکر حسین کمیٹی کے ممبر بھی رہے جو کچھ انہوں نے دیکھا اور سنا وہ اُنہی کے الفاظ میں یہ ہے:

---

۵۶ رشید احمد صدیقی: "ذاکر صاحب" / ۳۰

"اس کے ایک ممبر ذاکر صاحب بھی تھے - ان کی ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد قابلیت اور خلوص اور خوبیٔ تقریر سے ہر کمیٹی اور کانفرنس پر چھا جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی وہی حادثہ پیش آیا کانفرنس بحیثیت مجموعی ان کے خیالات سے کافی متاثر ہوئی اور اسلئے گاندھی جی کی نظرِ انتخاب نے ذاکر صاحب کو اس کمیٹی کی صدارت کے لیے چُنا جو اسکیم کو مُرتب کرنے کے لیے بنائی گئی تھی ...... خواہ اس میں کتنی ہی ترمیم اور تبدیلی ہو مجھے یقین ہے کہ اس پر اُن کی چھاپ قایم رہے گی - اُنہوں نے اپنی دور اندیشی، ور تعلیمی نظر سے کام لے کر اس اسکیم کو، جو اُس وقت سرکاری حلقوں میں مردود اور عام تعلیمی حلقوں میں حلقوں میں مشتبہ تھی، بڑی حد تک حشو زوائد اور افراط و تفریط کی آمیزشوں سے پاک کیا اور اپنی قوت استدلال سے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کے ممبروں اور دوسرے ماہرین تعلیم کو اس کی تائید پر آمادہ کیا - گاندھی جی کے خیالات تو ایک خلاق ذہن اور زندگی کے نبض شناس کے خیالات تھے ذاکر حسین کمیٹی نے ان کو تعلیمی تصورات اور جانی بوجھی تعلیمی اصطلاحوں کے سانچوں میں ڈھالا اور اس کی معنویت کو اجاگر کیا اس طرح ایک تعلیمی صناع کی تراش خراش کے بعد وہ اس شکل میں وہ قوم کے سامنے آئی کہ فنی نقطۂ نظر سے اس پر جو بنیادی اعتراضات کیئے جا رہے تھے وہ بڑی حد تک بند ہو گئے" ...

اور آخر میں یہ بھی اِنہی کی زبانی سُنیئے کہ بنیادی قومی تعلیم کے پرچار اور عملی طور

پر اُجاگر کرنے کا فرض کس طرح انجام دیا گیا :

"ذاکر صاحب نے گذشتہ پچیس برس میں یعنی جب سے اسکیم نے جنم لیا، مختلف طرح سے بڑے دل کش اور دل نشیں انداز میں اس حقیقت کو سمجھایا کہ انسان کی زندگی میں کام کا کیا مقام ہے ...... اُن کا کہنا ہے کہ بچوں کے ذہن کی بیداری، سیرت کی پختگی، تخلیقی قوتوں کا آغاز اور جماعتی زندگی سے صالح رشتہ قائم کرنے کا بہترین ذریعہ کام ہی ہے۔ اجتماعی تہذیب وتمدن کے بہترین عناصر کو فرد اسی طرح اپنی ذات کا جزو بنا سکتا ہے کہ وہ مختلف طرح کے کام کرے، اُن میں نظر اور مہارت پیدا کرے اور ان کی قدروں کو اپنے اندر جذب کرے۔ خیال نیا نہیں لیکن ہمارے سماج میں جو ذات پات کے بندھنوں میں گرفتار ہے اور جہاں بہت سی سماجی اور اقتصادی وجوہ سے ہاتھ کے کام کو ذلیل سمجھا گیا ہے، اس صداقت کو، اس عقیدے کو از سر نو مضبوطی اور قابلیت سے پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ ذاکر صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا، ...... اُنہوں نے بنیادی تعلیم کی محض تفسیر اور تعبیر ہی نہیں کی بلکہ اس کے مشکل اور دشوار گذار راستے میں جہاں بار بار غلطیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں، قدم قدم پر اس کی رہنمائی بھی کی۔ جب اندیشہ ہوا کہ یہ تحریک ایک عقیدے کی سی عصبیت اختیار کرے گی تو انہوں نے استادوں کی آزادی رائے اور عمل اور تجرباتی ذہنیت کی تائید

کی - جب لبقول ان کے دودھ میں اس قدر پانی ملایا گیا کہ اسکیم میں صرف پانی کا مزہ باقی رہ گیا تو انہوں نے اس کے بنیادی اصولوں کی یاد کو تازہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہاتھ کے کام کو محض خانہ پُری کے طور پر شامل کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا ...... جب کبھی بنیادی تعلیم کو ناسمجھ اور تخیل سے عاری استادوں اور" ماہرین تعلیم" نے اس طرح چلایا کہ ڈھانچہ رہ گیا اور روح نکل گئی تو انہوں نے جرأت کے ساتھ انہیں ٹوکا " لہ

لہ غلام السیدین : آندھی میں چراغ -

باب ۴

جامعہ ملّیہ — منزل کے قریب

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۸ء

در رہِ منزل لیلےٰ کہ خطر ہاست بجاں
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

۱۹۲۰ء میں جب مولانا محمد علیؒ نے علی گڈھ کے باغی گروہ کا یہ کیمپ بنایا تھا تو ان کا اصل مقصد علی گڈھ کو انگریزی حکومت کے پنجے سے آزاد کر کے اُس پر قبضہ کرنا تھا۔ جامعہ کے لیئے ایک نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ ایک عارضی کیمپ ہے جنگِ آزادی کے سپاہیوں کا۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ "یہاں سے

سے سچے خدا پرست مسلمان اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں" اسی خیال کے پیش نظر وہ اس میں پورے انہاک سے دلچسپی لیتے رہے اور یہی نظریہ اس زمانے میں زیادہ مقبول تھا بہ نسبت دوسرے تصور کے جو یہ تھا کہ یہ ایک مستقل تعلیم گاہ ہو "اور مسلمانوں کی تعلیم اور زندگی کا ایک ایسا نقشہ بنا دے جس میں دینی اور دنیوی اقدار کے پرانے اور نئے زمانے کے رنگ سموئے ہوں[5]"۔ اس نظریئے کے حامی تھے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ اور بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین۔ دونوں نظریات پر کافی بحث ہوتی رہی آخر کار تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد جامعہ خلافت کمیٹی کی ماتحتی سے نکل آیا تو تعلیمی نظریہ رکھنے والوں نے اسے دہلی لاکر ایک مستقل تعلیمی ادارے کی شکل دیدی اور اس کا مقصد ذاکر صاحب کے الفاظ میں یہ قرار پایا کہ "ہندوستانی مسلمانوں کی آیندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی ......" جامعہ کو سیاست کی ڈگر سے ہٹا کر تعلیمی راہ پر لگانے اور اسے نئی قومی تعلیم کا مرکز بنانے کا سہرا بڑی حد تک ذاکر صاحب ہی کے سر پر ہے۔

---

[5] رسالہ 'جامعہ'، دسمبر ۶۳ء

دیوبند علی گڑھ اور جامعہ

مسلمانانِ ہند کے تعلیمی اداروں میں ایک طرف علی گڑھ کالج تھا۔ جو انہیں نئی تعلیم دے کر مغربی تہذیب و تمدن سے آشنا کرنے کی خدمت انجام دے رہا اور جسے نہ صرف انگریزی حکومت کی پوری سرپرستی اور امداد حاصل تھی بلکہ تربیت کے لیئے انگریزی استادوں کی خدمات بھی حاصر تھیں لیکن مسلمانوں کے مستقبل کی تشکیل اور تعمیر کا کوئی واضح اور منظم پروگرام علی گڑھ کے دامن میں نہ تھا۔ دوسری طرف دیوبند کا مدرسہ تھا جو تحریک ۱۸۵۷ء کے بعد انقلابی علماء نے ہر انگریزی چیز ——— سے نفرت کی بنا پر قائم کیا اور دینی تعلیم جس کا نصب العین تھا لیکن درمیان کی ایک راہ اور بھی تھی جو قدرت نے جامعہ کے لیے چن رکھی تھی اُس نے ایک طرف مسلمانوں کی نئی تعلیم کا ان کی آیندہ زندگی کی مطابقت سے پروگرام بنایا اور دوسری طرف ان کو سچا خدا پرست اور قوم و وطن کا شیدائی بنانے کا فریضہ انجام دیا اس طرح جامعہ کے بوریہ نشینوں نے، جن کے تیاگ اور ایثار و قربانی کی کہانی کچھ تو اوپر گذر چکی اور کچھ آگے آتی ہے۔ وہ کام کر دکھایا جو علی گڑھ سے نہ ہوسکا ——— جو دیوبند نہ کرسکا۔

اب ذکر آ ہی گیا ہے تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نظر سے بھی دیکھئے:

"میں تو صرف یہ دیکھ سکا ہوں کہ جامعہ کس طرح ذاکر صاحب کی شخصیت کے سہارے اور اس سے سیراب ہوکر اپنے مخصوص بلند نصب العین سے قریب تر ہوتی رہی اور باوجود صدہا دشواریوں کے

اس نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام ہندوستان میں ایک نئی ذہنی بیداری
پیدا کی اور اسے پروان چڑھایا... جامعہ پہلا ایسا ادارہ ہے جو حکومت
کی اعانت سے مستغنی رہ کر اپنوں کی سرد مہری کے باوجود، جو اکثر شدید اور غیر
شریفانہ مخالفت کی حد تک پہنچی، اپنے لیے ایک اچھی اور اونچی جگہ پیدا
کر سکی.... خود حکومت جو اس طرح کی تحریکوں کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے
دیکھتی ہے جامعہ کی طرف جھکی اور اس نے جامعہ کی درخواست کے بغیر
جامعہ کے نصاب اور امتحانات کو اپنا لیا۔ ہندوستان کی قومی تحریکوں
کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے" [۱]

جامعہ کے طریقہ کار اور ذاکر صاحب کی شخصیت کا ہی یہ جادو تھا جس نے مہاتما
گاندھی کو گرویدہ بنایا، اے جے کیلاٹ کو اپنے دامن میں کھینچا، فلپس بورن
کو جرمنی سے ہندوستان لایا اور خالدہ ادیب خانم کو حیران کیا۔ [۲]

کاشی وِدّیا پیٹھ میں

بنارس کا کاشی وِدّیا پیٹھ بھی جامعہ ہی کی طرح کا ایک قومی ادارہ ہے۔ ۱۹۳۵ء میں اس کے کانووکیشن کو خطاب کرنے کے لیے ڈاکٹر بھگوان داس نے تار دے کر ذاکر صاحب کو مدعو کیا اور ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء کو انہوں نے اس غیر مسلم تعلیم یافتہ مجمع کے سامنے

۱۔ "ذاکر صاحب" / ۴۰

۲۔ پروفیسر اے جے کیلاٹ کیرالہ کے رہنے والے ایک عیسائی تھے جو جامعہ میں استاد رہے اور اسٹاف کے دوسرے ممبروں کی طرح ایثار و قربانی کی انوکھی مثالیں پیش کیں۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "جامعہ کی کہانی" از عبدالغفار مدھولی)

قومی تعلیم کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اور مسلمانانِ ہند کی ترجمانی بھی دل نشین لفظوں میں کی۔ اس خطبے کے چند اقتباسات یہ ہیں :۔

"..... ہمارے نظام تعلیم میں بس اتنی تبدیلی سے کام نہیں چلے گا کہ اس میں دیسی زبان کے لیئے کوئی اچھی جگہ نکل آئے اور تاریخ کی کتابیں بدل دی جائیں! - ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علیحدہ علیحدہ ہیں، قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولے میں ان تعریفوں کو بالکل پس پشت ڈال دیں یا ہر صوبے اور ہر گروہ کو جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے اس بات کا موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے اگر آپ کے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا سیاسی دانش مندی کا تقاضا ہی نہ سمجھا جائے گا بلکہ خود صحیح تعلیم کے لئے لازمی مانا جائے گا۔ "

"مثال کے طور پر آپ ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلے ہی کو لے لیجیے۔ کیا ہندستان کا قومی نظام تعلیم ان مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی

تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں ؟ - آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لئے کتنا اہم ہے ممکن ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لئے مضر ہو مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے ..... مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قایم کرسکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہے کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا ؎

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ،

اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کئے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندوستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ اُن کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان اُنہیں ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر اُنگلی اٹھائے۔ ہندوستان میں اُن کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری اُن پر ڈالے، ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مسلمان سیاست کے میدان میں دوسری تمام ہندی آبادی کے پہلو بہ پہلو ہوں گے، جداگانہ اور مشترکہ انتخابات کے جھگڑے ٹنٹے بھی بھلائے جاچکے ہوں گے اور غالباً ملازمتوں کے حصول میں بھی مسلمان ایک خوددار گروہ کی طرح بجائے تحفظ کے، مقابلے پر اصرار کرتے ہوں گے، اُس وقت بھی وہ یہ ضرور چاہیں گے کہ ان کی تعلیم کے نظام میں اُن کی تمدنی چیزوں کو پورا پورا دخل ہو اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی دانش مند ہندوستانی حکومت اُن کے اس مطالبے کو پورا کرکے مسلمانوں کی ترقی اور ان کی ترقی سے خود اپنی مضبوطی کا سامان کرے گی۔"

اور آخر میں طلبا سے خطاب ہے:

"...... چاہے تم دھن دولت کی فکر ہی میں لگ جاؤ، کم سے کم کاشی ودیاپیٹھ کے سناتک ہو کر تم کبھی اپنی قوم کی راہ میں روک نہ بننا۔ اپنی کامیابی کے لئے بہتیرے لوگ قوم کا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتے تم اس کا دھیان رکھنا کہ کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے فرائض کو ترک کرکے اور اپنی ساری اچھی خواہشوں کو پیروں تلے روند کر ہی اس تک پہنچا جائے جو اپنی غرض کے لیے اتنا اندھا ہو جائے کہ اپنے دیس اور قوم کو نقصان پہنچانے سے بھی نہ چوکے وہ آدمی نہیں جانور ہے.....

ہمارے دیس کو ہماری گردنوں سے اُبلتے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینے کا بارا ماسی بہنے والا دریا درکار ہے۔ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی......

عزیزو! اِس نئے ہندوستان کے بنانے کے کام میں تم سے جہاں تک بن پڑے ہاتھ بٹانا۔ مگر یاد رہے اگر مزاج میں بے صبری ہے تو تم اس کام کو اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ یہ بڑا دیر طلب کام ہے۔ اگر طبیعت میں جلد بازی ہے تو بھی تم کام بگاڑ دوگے کہ یہ بڑا پتّا مارنے کا کام ہے۔ اگر جوش میں بہت سا کام کرنے کی عادت ہے اور اس کے بعد ڈھیلے پڑ جاتے ہو تو بھی شاید یہ کٹھن کام تم سے نہ بن پڑے گا، اس لیے کہ اس میں عرصے تک ایک سی محنت اور توجہ درکار ہے اگر ناکامی سے مایوس ہو جاتے ہو تو اس کام کو نہ چھوُنا کہ اس میں ناکامیاں ضروری ہیں، بہت ناکامیاں اور بار بار ناکامیاں۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے ہر ناکامی اور زیادہ

محنت کرنے پر اُبھارتی ہو...... ایسے وقت بھی آئیں گے کہ تم تھک کر شل ہو جاؤ گے، بے بس ہو جاؤ گے اس وقت مادی اور اخلاقی طور پر آزاد بھارت ماتا کی اُس تصویر کی طرف دھیان لگانا جو تمہارے دل میں ہمیشہ رہنی چاہیے یعنی اُس دیس کی تصویر پر جس میں سچائی کی حکومت ہوگی، جس میں سب کے ساتھ انصاف ہوگا، جہاں امیر و غریب کا فرق نہ ہوگا...... اور جب وہ وقت آئے جو سب کو آنا ہے، میدان کو چھوڑنا پڑے تو یہ تسلی تمہارے لیے بس ہوگی کہ تم نے اپنے بس بھر اُس سماج کو آزاد کرنے اور اچھا بنانے میں کوشش کی جس نے تمہیں آدمی بنایا تھا۔ تم چلے جاؤ گے، دوسرے تمہارے کام کو جاری رکھیں گے اس لیے کہ یہ کام کبھی ختم ہونے والا نہیں"

عمارتوں کی تعمیر

اوکھلے میں جامعہ کے لئے عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی تو ذاکر صاحب کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن اوکھلے آتے۔ تانگے میں، ریڑھی میں، ریل میں، بس میں۔ غرض جس طرح بھی بن پڑتا اور آخر کار وقت آگیا جب جامعہ رفتہ رفتہ اوکھلے میں آکر "جامعہ نگر" کہلانے لگا۔ "ہمدردانِ جامعہ" کی تعداد پانچہزار تک پہنچی، چندے کی رقم پچیس ہزار ہوگئی۔ ایک صاحبِ خیر رگھونندن سرن نے اشرفی دیوی ٹرسٹ کی جانب سے ایک لاری بھی پیش کی اور اس طرح جامعہ کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا گیا۔

اگلے دو تین سال میں جامعہ کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوا اور مزید عمارتیں

نقشے کے مطابق بنتی چلی گئیں۔ ان عمارتوں کا نقشہ ذاکر صاحب نے ایک بار حیدر آباد کے دوران قیام میں (غالباً) جرمن انجینئر کارل ہائنس سے بنوایا تھا مگر ہائنس صاحب نے دہلی آکر پورے طور پر بنایا اور اپنے فن کا یہ کمال دکھایا کہ موجودہ طرز کے نئے خطوط پر اسلامی شان اور ہندوستانی رنگ پیدا کیا۔ اسی دوران میں ذاکر صاحب نے بھی اوکھلے میں اپنی آبائی زمین اور مکان وغیرہ کی آمدنی سے اپنا مکان (۳۸-۱۹۳۷ء) بنوالیا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی منائی گئی۔ جامعہ کے طلباء اور استادوں نے بھی شرکت کی اور ذاکر صاحب نے کانفرنس کے شعبۂ ثانوی تعلیم کے اجلاس کی صدارت (۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء) کی۔ اس موقعے پر انہوں نے ایک یادگار خطبۂ صدارت پڑھا۔

"...... دنیا جو نسل، وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے پھر ہم سے اُس حقیقی عدل و مساوات کی فرمانروائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لئے بے تاب ہے جو ایک نبیؐ اُمّی نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا......"

ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے کہا:

"ایک بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خود دار اور آزاد جماعت کی طرح رہنا ہے تو ان کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پچھتر سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا اور پچھلی

مساعی کی تہہ میں جو نصب العین کار فرما تھا اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی"۔

طبیہ کالج میں

۱۹۳۸ء میں پٹنہ طبیہ کالج میں کانوکیشن ایڈریس پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ اس موقعے پر انہوں نے ایک عالمانہ ایڈریس پڑھا اور ملک کے طبی مسئلوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ناقدانہ انداز سے بحث کی۔ یہ ایڈریس "تعلیمی خطبات" میں شامل ہے۔

جامعہ میں علمی و ادبی سرگرمیاں

جامعہ میں شروع ہی سے علمی اور ادبی ماحول برقرار رہا اور ذاکر صاحب کی سرپرستی میں یہاں تصنیف و تالیف اور ترجمے کے اہم کام برابر ہوتے رہے۔ انجمن اتحاد جامعہ کے اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبار کی انجمن تھی جس کے جلسے ہر ہفتے ہوتے۔ علمی و ادبی مضامین پڑھے جاتے، مباحثے ہوتے اور تفریحی مجلسیں۔ انجمن کے صدر ذاکر صاحب تھے اور اس کا ترجمان رسالہ "جوہر" پہلے قلمی اور بعد میں مطبوعہ شکل میں نکلا (پہلے یہ "الرشید" کے نام سے نکلتا تھا) بعد میں یہ "جامعہ" کے نام سے نکلنے لگا۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے "پیام تعلیم" اور "بچوں کا اخبار" بھی نکالا گیا۔ رسالہ 'جامعہ' میں ذاکر صاحب "رفتار دنیا" کے عنوان سے دنیا کے سیاسی حالات پر ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔

مکتبہ جامعہ ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا۔ بچوں کی تعلیمی اور ادبی کتابیں سب سے پہلے یہیں سے چھپنا شروع ہوئیں اور اس موضوع پر اچھا لٹریچر مہیا کیا گیا۔ خود ذاکر صاحب نے بھی چند کتابیں بچوں

کے لئے لکھیں ۔ اُردو میں ترجموں کی کمی کو بھی مکتبہ نے پورا کرنا شروع کیا چند ترجمے ذاکر صاحب نے بھی کیے مہاتما گاندھی ۔ پنڈت نہرو ۔ مولانا محمد علی حکیم اجمل خاں وغیرہ کی تصانیف سے دنیا کو مکتبہ جامعہ ہی نے روشناس کرایا اور دنیا کے مشہور و معروف مفکرین کے خیالات اُردو میں منتقل ہوگئے ۔

تعلیمی اور تہذیبی ادب پر بھی قابل قدر کام ہوا ، قومی تعلیم پر مضامین اور ماہرین تعلیم کے متعلق کتابیں شائع کی گئیں ۔ اس سلسلہ میں ذاکر صاحب کے خطبات کا مجموعہ "تعلیمی خطبات" اور پروفیسر مجیب کی "دنیا کی کہانی" وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ آل احمد سرور کا خیال ہے کہ "جامعہ نے تعلیمی سیاسی اور تہذیبی اصولوں پر نظریاتی مواد فراہم کر کے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے ۔" اسکے علاوہ خالص ادبی نقطۂ نظر کی بھی بے شمار کتابیں شائع کی گئیں ۔ سوانح عمریوں ، نظموں ، ناولوں ، ڈراموں ، افسانوں کے میدان بھی خالی نہیں رہے ۔

یوروپ کا سفر

جون ۳۹ئہ میں ذاکر صاحب علاج کے لیے یوروپ گئے اور اس دوران میں دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے پر نہ جانے کہاں کہاں پھنس گئے ۔ یہ کہانی اُنہوں نے ایک خط میں ڈاکٹر سید عابد حسین کو لکھی تھی جو ۱۱ر ستمبر کو جنیوا سے لکھا گیا :

" برادرم عابد صاحب تسلیم

آپ کا خط مجھے اُس دن ملا جب میں جرمنی سے بھاگ رہا تھا ۔ اسی ڈاک سے ایک شفیق صاحب کا اور ایک خط میم صاحبہ کا ملا ۔ ان خطوط

سے اُدھر کا حال اتنا تو معلوم ہو گیا کہ چند ہفتے صبر سے گذار سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کسی بندۂ خدا نے خبر نہ لی..... میری کہانی سنیے۔ ۳؍ جولائی کو وینس پہنچا۔ شہر پسند آیا، وہیں رہ پڑا دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا بہانہ یہ تراشا کہ اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں، واقعی سیکھتا بھی تھا لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی بھلانے میں اُس سے بہت کم لگے گی۔ ۱۸؍ جولائی کو وینا پہنچا۔ وہاں امتیاز آ گئے اُن کے ساتھ ایک ہفتے کے بوڈاپسٹ چلا گیا۔ بڑا ہی "گتھا ہوا" شہر ہے، واقعی خوب صورت۔ تقریباً ہر شخص جرمنی بھی جانتا ہے وہاں سے پھر وینا واپس آئے مگر ہوائی جہاز پر! - یہ ارمان بھی کیوں رہ جاتا۔ وینا سے امتیاز تو چلے گئے اور مجھے ڈاکٹروں کے سپرد کر گئے۔ ڈاکٹروں نے وہ وہ معائنے کئے کہ معاذ اللہ در گفتن نمی آید۔ قرار یہ پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں ٹھیک ہیں احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا، آنتیں البتہ بہت خراب ہیں۔ پُرانی پیچش ہے اور خوب ہے اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی مُتاثر ہو چلے ہیں زیادہ ڈھیل کی گنجائش نہیں قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہیئے تھی لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا اس لئے ابھی موقع ہے، علاج ہو سکتا ہے۔ خون کی جو حالت ہونی چاہیئے تھی اس سے بہت بہتر ہے اس لئے علاج میں سہولت ہے۔ قلب بھی (ستم ظریفی ملاحظہ ہو!) بر جا ہے دماغ کا معائنہ نہیں ہوا ورنہ شاید کچھ دل چسپ نتیجہ بر آمد ہوتا علاج سے زیادہ پرہیز کی تاکید کی گئی سات انجکشن تجویز کئے گئے اور حکم ملا

کہ کسنجن (KISSINGEN) چلے جاؤ وہاں تین ہفتے رہو۔ انجکشن لو، پرہیز کرو۔ اس کے بعد خون کا معائنہ کراؤ اگر انجکشن کی وجہ سے خون میں کچھ کمزوری آگئی ہو تو ۵ - ۴ ہفتے کا وقفہ دے کر پھر انجکشن لینا.... چنانچہ میں ۱۵ راگست کو KISSINGEN پہنچا۔ چھوٹی سی جگہ ہے باشندے سب پردیسی اور بیمار۔ چاروں طرف پھولوں کی بھرمار۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ وینا سے ڈاکٹر نے ایک مفصل وصیت نامہ ساتھ دیا تھا اور ایک ڈاکٹر کے نام تعارفی خط۔ انہوں نے اُسی دن سے علاج شروع کر دیا۔ ایک مکان میں رکھ دیا جہاں بھٹیارن خود ڈاکٹر تھی اور ایک ڈاکٹر کی بیوہ اور بڈھی! یعنی تجربہ کار۔ اس نے پرہیز کا پورا پورا انتظام کیا چند ہی روز میں فائدہ محسوس ہونے لگا۔ لیکن فلک کج رفتار کو کیا کہیے، لڑائی کی خبریں آنے لگیں آدمی، گھوڑے گاڑیاں موٹریں سب ضبط ہونے لگیں۔ ۲۵ راگست کو سب تیاری ہو چکی تھی۔ ہمارے نوکر سب فوج میں جا چکے تھے بیمار ساتھی سب بھاگ نکلے تھے ریلیں کم ہوگئی تھیں مگر ہم تھے کہ ڈٹے رہے۔ اور کرتے بھی کیا۔ انجکشن پورے نہیں ہوئے تھے طبیعت برابر صحت کی طرف مائل تھی۔ ہم نے طے کیا کہ فی الحال جنگ نہ ہوگی اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ راگست کو خاکسار کے بطن سے (ایک زندہ وجود تولّد ہوا! یعنی) ایک عدد عظیم الشان کیڑہ، طول جس کا کوئی نو انچ تھا برآمد ہوا پیچش کے علاوہ یہ بزرگ بھی سالہا سال سے (اندرون خانہ مقیم) موجود تھے انہیں گرفتار کیا اور ڈاکٹر کے پاس

لے گیا انہوں نے اس کا لاطینی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا اور کہا بہت اچھا
ہوا کہ یہ مکمل گئے بہت پُرانا ہے۔ خیر یہ بھی ہوا۔ ہم خوش ہوئے کہ علاج
کامیاب ہو رہا ہے اور جمے رہے۔ پہلی ستمبر کو انجکشن ختم ہو گئے غسل جو
تجویز کئے تھے وہ بھی پورے ہو گئے اور ۲ تاریخ کو اعلان جنگ برطانیہ
نے کر ہی دیا۔ ہمیں اس روز تک بس یہ معلوم ہوا تھا کہ صلح کی بات چیت
ہو رہی ہے اور پوری امید تھی کہ پُرامن طریقے پر معاملہ یک سو ہو جائیگا
حالت جنگ کا اعلان ہمیں ۳ کو سہ پہر میں سُنایا گیا اتوار کا دن تھا اُسی
وقت اسٹیشن گیا معلوم ہوا پہلی گاڑی جو مل سکتی ہے وہ صبح پانچ بجے ہے
واپس آکر حساب چکایا سامان باندھا رات کو دس بجے جاکر سامان اسٹیشن
پر دیا اور ٹکٹ خریدا صبح پانچ بجے روانہ ہو گیا ریلوں کا انتظام کچھ یوں تھا
کہ ایک حلقے والا دوسرے حلقے کی کوئی خبر نہ دیتا تھا۔ بس اس حلقے میں
گاڑیوں کا حال معلوم ہو سکتا تھا وہ بھی غیر معین طور پر STUTTGART
میں میں نے سوئزرلینڈ کا قصد کیا کہا گیا کہ STUTTGART تک
جا سکتے ہو آگے معلوم نہیں خیر STUTTGART کا ٹکٹ لیا راستے
میں تین جگہ گاڑی بدلتی تھی دو دفعہ بدل چکا تھا تیسری جگہ پہنچنے سے پہلے
ایک مقام پر بشارت ملی کہ یہ گاڑی آگے نہیں جائے گی سب مسافر اُتر
جائیں۔ اُتر گئے۔ ۸ گھنٹے وہاں پڑے رہے۔ چھوٹا سا اسٹیشن ہوائی جہازوں
کے ڈر سے تاریک۔ بس ہر گھنٹے دو گھنٹے میں گاڑی گذر جاتی تھی جس میں
سرحدی مقامات کے بڈھے بچے ہوتے تھے جنہیں اندرون ملک بھیجا جارہا

تھا۔ خیر یہ وقت بھی گزر گیا اور ہم STUTTGART پہنچے۔ وہاں کہا
ZURICH جانا ہے۔ معلوم ہوا کہ گاڑی ابھی جا رہی ہے۔ سامان
پوچھا معلوم ہوا ساتھ نہیں آیا اسی دریافت کرنے میں ZURICH کی
گاڑی روانہ ہو گئی۔ رات وہیں قیام فرمایا قاعدے سے سرکاری مہمان
ہونا چاہیئے تھا مگر مہمان داری نہ معلوم کیوں نہیں کی گئی دوسرے دن
ZURICH کا ٹکٹ لیکر روانہ ہوا۔ جرمن علاقے میں LAKE
CONSTANCE کے کنارے فریدرش ہافن پر اترا وہاں
سے اسٹیمر لینا ہونا ہوا رات کو پہنچا تھا دوسرے دن تین بجے دن کے اسٹیمر
جانے والا تھا راستے میں معلوم ہوا کہ اسٹیمر پھر چلنا بند ہو گئے ہیں نہ جا سکو گے
مگر یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ پھر چلنے لگے ہیں سہ پہر میں اسٹیمر پر پہنچا جرمن
پولس نے کہا کہ تم کو سوئزرلینڈ والے جہاز سے اترنے نہ دیں گے، صبح ہی ۵۰
آدمی اس ساحل سے واپس بھیجے گئے ہیں میں نے کہا آپ تو جانے دیں میں
قسمت آزمائی کر لوں گا۔ مسکرائے، کندھے اچکائے اور پاسپورٹ پر مہر لگا
دی میں اسٹیمر پر بیٹھکر ROMANSHOM پہنچا۔ اسٹیمر جس میں چار سو
آدمیوں کی جگہ تھی اس پر عملے کے علاوہ بس تین آدمی اور تھے۔ کپتان
نے پوچھا تم نے ویزا حاصل کر لیا ہے میں نے کہا نہیں۔ کہا پھر کیسے چلتے
ہو یہ جہاز اسی لیے تو خالی جا رہا ہے کہ رات کے بارہ بجے سے ہماری حکومت
نے باہر سے آنے والوں کے لیے بلا استثنا ویزا کی قید لگا دی ہے اور اس
کی سختی سے پابندی ہو رہی ہے یہ گفتگو اس وقت ہوئی کہ جہاز چل چکا تھا

میں نے کہا اب تو میں چل کھڑا ہوا ہوں فرمایا کہ نہیں واپس جا سکتے ہو
پھر اس جہاز پر واپس ہو جانا اور جرمنی میں فلاں مقام پر جا کر ویزا کے
حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ میں نے کہا حضرت اب یہ تو ہونا نہیں ایک
دفعہ جرمنی سے نکل آنے کے معنی یہ نہیں کہ دوبارہ ان کی مہمانی کی آزمائش
کروں۔ خیر اسی گفتگو میں ROMANSHOM پہنچے وہاں وہی پیش
آیا جو کپتان نے کہا تھا۔ سرحدی پولس نے کہا واپس جاؤ میں نے کہا
ناممکن، یہیں قید کر لو۔ کچھ دیر تو وہ اصرار کرتا رہا کہ حکم تو حکم ہے واپس
جانا ہی ہوگا مگر جب میری طرف سے انکار ہوتا رہا تو کہنے لگا تم بات تو
ٹھیک کہتے ہو جرمنی واپس جاؤ گے تو تمہیں وہاں قید کر لیں گے تمہیں واپس
بھیجنا تو ناانصافی ہے میں نے کہا آپ ہی سمجھیے چنانچہ اس نے برن کو فون
کیا وہاں سے مجھے اجازت مل گئی اور میں ZURICH پہنچا وہاں
کانسل نے مشورہ دیا کہ جنیوا جاؤ انگلستان جانے یا اٹلی سے ہندوستان
واپس جانے کے متعلق وہیں سے زیادہ آسانی رہے گی چنانچہ میں ۹ کو یہاں
پہنچ گیا یہاں ڈاکٹر لگوکلی سے ملاقات ہو گئی وہ اتفاق سے اسی ہوٹل میں
ہیں جس میں میں آکر ٹھہرا ہوں اب یہاں اطمینان ہے چند روز کی اس
بھاگ دوڑ میں ذرا رنگ و روغن ویسا نہیں رہا جیسا KISSINGEN
میں ہو گیا تھا مگر فی الجملہ اچھا ہوں خوب سوتا ہوں خوب کھاتا ہوں اور
ہضم کرتا ہوں اور کیا چاہیے وقفہ گذار کر پھر یہیں کہیں انجکشن لینے کا
انتظام کروں گا اور اگر اٹلی غیر جانب دار رہا تو انشاء اللہ ستمبر اکتوبر کے ختم تک

آپ لوگوں سے آملوں گا...... مجھے یہاں پہنچ جانے کی سب سے زیادہ خواہش
اس وجہ سے تھی کہ آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہوتی رہے گی دیکھیے یہ
قیاس صحیح نکلتا ہے یا نہیں ۔"

واپسی یورپ کے سفر سے بمشکل واپس ہوئے، جامعہ میں تو خیر استقبال ہوتا ہی، علی گڑھ میں بھی ہوا۔ اسی موقعے پر آل احمد سرور صاحب نے مشہور نظم "مرد درویش" لکھی تھی:

زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم وہ مردِ دانہ
نگاہ جس کی ہے عارفانہ، مزاج جس کا قلندرانہ

وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثارِ بیکراں کا ہے معترف آج تک زمانہ

جلال بھی ہے جمال بھی ہے یہ شخصیت کا کمال کہیے
خیال میں بجلیاں پرافشاں، لبوں پہ اک دل رُبا ترانہ

وہ جس کی تحریر سے ہویدا جہان میں حکمتِ کلیمی
وہ جس کی تقریر سے جھلکتی تب و تابِ عنا زیانہ

وہ جس کی بزمِ ستارہ بیں نے فلک بھی دیکھا جہاں بھی دیکھے
پسند لے دیکے جس کو آیا مگر کچھ اپنا ہی آشیانہ

غلام قوموں میں کیا بصیرت، نظر میں گرمی نہ دل میں وسعت
کسی کو پہچانتی نہیں ہیں وہ مردِ حُر ہو کہ مردِ دانا

سکوتِ ساحل سے کون دیکھے کنارِ ساحل سے کون سمجھے
کسی کا موجوں سے جنگ کرنا کسی کا طوفاں کو آزمانا

افق پہ ہے روشنی سی لیکن وہ چشم بینا کہاں سے لائیں
ابھی جبینوں سے جن کی چھوٹا نہیں فرنگی کا آستانہ

ورق ورق ہے مرا صحیفہ، ملے تو کیونکر بنے تو کیوں کر
اِدھر نئی آرزو کی گرمی، اُدھر خمارِ شبانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

حالات کے سُدھار کا ارمان

ملک کے حالات اب دن بدن بگڑتے ہی چلے جاتے تھے فرقہ پرست لیڈروں کی بن آئی تھی اور دیش کے بٹوارے کی طرح ڈالی جا چکی تھی ذاکر صاحب خود تو سیاسی میدان میں تھے نہیں لیکن حالات کی اصلاح کا سودا ان کے سر میں ضرور سمایا تھا چنانچہ کوئی موقع انہوں نے ہاتھ سے نہ جانے دیا جب سیاسی لیڈروں سے واسطہ پڑا ہو اور انہوں نے دردمندانہ اپیل نہ کی ہو۔ ایسا ایک موقعہ بنیادی قومی تعلیم کی دوسری سالانہ کانفرنس میں ہاتھ آیا جو اپریل ۱۹۴۱ء کو جامعہ نگر میں ہوئی۔ یہاں دراصل بابو راجندر پرشاد موجود تھے۔ اور ذاکر صاحب نے اس سے فائدہ اٹھایا:

"میں اُن کی معرفت تعلیمی کام کام کرنے والوں کی یہ التجا اپنے ملک کے سب سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے کمزوروں

کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے ..... ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں۔ کب تک شبے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھُٹ گھُٹ کر سسکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھرّاتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی ..... ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں۔ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی ایک دل نظر نہیں آتے۔ کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی، جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں۔ کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں، کوئی دکھ نہیں جسے سب مٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجئے اور جلد کیجئے۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے"۔

آزمائش کا سخت دور

یہ زمانہ جامعہ پر بھی ایک لحاظ سے سخت آزمائش کا دور تھا۔ اگرچہ وہ رفتہ رفتہ نئی عمارتوں میں منتقل ہو چکا تھا اور مالی اعتبار سے حالت پہلے سے بہتر ہوتی جاتی تھی لیکن ۳۷ء میں کانگریسی حکومتوں کے قیام کے بعد مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں کے کانگریس سے اختلاف اور ٹکراؤ کی بدولت جو زہر پھیلنا شروع ہوا وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس زہریلی فضا میں ذاکر صاحب اور جامعہ عجیب کشمکش اور ہیجان کے دور سے گزرے۔ "فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو نفرت کی آگ میں لپیٹ لیں یا جلا کر خاک کر دیں۔ قوم

پرور ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسیٹ لیں۵۹۔" کامیاب اگرچہ کوئی نہ ہوا۔ نہ دشمنوں کی عداوت نہ دوستوں کی محبت۔ لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ جذبات کے طوفان، تخریب کے سیلاب اور نفرت کے اُمڈتے ہوئے ساگر میں جامعہ کی کشتی کھینا اور سیاست کی آلودگی سے صاف بچا کر لے جانا ہنسی کھیل نہ تھا۔

اس سارے تماشے کا کلائمیکس یا نقطۂ عروج وہ ہے جب جامعہ کی جوبلی میں لیگی اور کانگریسی راہ نما ذاکر صاحب کی دعوت پر یکجا نظر آتے ہیں مگر اس قصے کو تو ابھی نہ چھیڑیے کہ یہ ذکر آگے آرہا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سیاسی کشمکش کی نل رُبائیوں میں تعلیم و تعمیر کی خشکیاں بھلا کسے اپنی طرف کھینچ سکتی تھیں۔ ہمت توڑنے اور شبہ کرنے والے زیادہ تھے اور ہمت بندھانے یا مدد کرنے والے بہت کم۔ مگر اسی ہمت شکن ماحول میں اور فرقہ وارانہ نفرت کی آندھیوں کے درمیان جامعہ والوں کی چھوٹی سی ٹولی تعلیم و تعمیر کے دیے جلاتی بڑھتی چلی گئی جامعہ کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور مالی مشکلات دور ہوئیں تو ان ایثار پیشہ لوگوں نے یہ روپیہ اپنے آرام و آسائش پر نہیں بلکہ جامعہ میں قومی تعلیم کے نئے تجربوں، عمارتوں کی تعمیر اور زمینوں کی خریداری پر خرچ کیا۔

ہندوستانی تعلیمی سنگھ

۳۷ء میں واردھا اسکیم کے اصول پر استادوں کا مدرسہ جامعہ میں قائم ہو چکا تھا

۵۹۔ نقوش، شخصیات نمبر

جس میں دور و نزدیک کے استاد ٹریننگ کے لیے آنے لگے اور قومی تعلیم کا بلند مقصد اپنے ساتھ لے کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیلتے چلے گئے۔ اسی زمانے میں "ہندوستانی تعلیمی سنگھ"، بھی مہاتما گاندھی کی سرپرستی میں قائم ہوئی ذاکر صاحب اس کے صدر بنائے گئے اور ۱۹۵۰ء تک صدر رہے۔ اس تعلیمی سنگھ نے اپنے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ یہ تعلیم کو مفید بنانے، عام کرنے، کاروباری لحاظ سے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے اور سستا کرنے کے لئے گاندھی جی کے نظریات کی عملی صورت تھی۔[1]

ذکرِ حسینؑ

۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو یادگار حسینیؑ کے جلسے میں ذاکر صاحب نے جو تقریر کی وہ زبان و ادب کا انمول شہ پارہ ہی نہیں شہید کربلا کے مقصد حیات و شہادت کی وجد آور تصویر بھی ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے یادگار حسینی تحریک کا مقصد یہ بیان کیا کہ "فخر انسانیت اور مایۂ نازش بشریت حسینؑ کے کارناموں کی قدر و قیمت کو انسانیت کے عام معیاروں پر پرکھا جائے اور اس کا نتیجہ انسانیت کی عام زبان میں بیان کیا جائے" اس تقریر کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"صاحبو! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس عالم انسانیت کے لئے حسینؑ کی روداد شہادت کیا تخت طلبی کی بس ایسی ناکام کوشش ہے جس میں آپ کو ناکام فریق سے تاریخی ہمدردی سی ہے؟ یا یہ بس ایک

---

[1] جعفر حسین: ہندوستانی سماجیات ص ۱۵۸

مخرور المزاج سردار کی ضد یا نا عاقبت اندیشی ہے جس میں ضد کرنے والا اتفاق سے آپ کے محبوب اور مخدوم آقا کا جگر گوشہ ہے اس لیے آپ اس کی پیچ کرتے ہیں ؟ کیا یہ بے دردی اور سفّاکی سے ایک کمزور جماعت کے مٹانے کی دل ہلانے والی کہانی ہے جس کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنسوؤں کی چند بوندیں آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جاتی ہیں ؟ ...... حسینؑ کی کہانی ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ وہ تو انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستان ہے، شرف انسانیت کی کہانی ہے انسان کے پستی سے بلندی کی طرف ارتقا کی روداد ہے۔ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معیاروں کی تفسیر ہے۔ بہیمی غلامی سے انسانی حریت کی طرف سفر کی منزل ہے۔ وہ دنیا میں خدائی بادشاہت کا اعلان ہے اور انسانوں میں اس کے قیام کے امکان بلکہ لزوم پر کسی حربے سے نہ لوٹنے والی شہادت ہے۔ وہ منزل تکمیل انسانی کی راہ کا چراغ ہے۔ اس چراغ کو باطل کی قوتیں جب کبھی اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتی ہے۔ حسینؑ کی یاد اس کی لو کو روشن کر دیتی ہے۔ جب راہ حق و حریت میں انسان کے قدم ڈگمگاتے ہیں، اور کیسے نہیں ڈگمگاتے تو حسینؑ کی مثال اسے سہارا دیتی ہے اور سنبھال لیتی ہے۔ جب دولت و اقتدار کی فرعونیت حق پرستوں کی تہی دست اور بے وسیلہ جمیعتوں پر عرصۂ زندگی تنگ کرتی ہے اور جب پیہم ناکامیوں کا ہجوم حق پر باطل ہونے کا وسوسہ دل میں ڈالتا ہے تو حسینؑ ہی کی مثال انہیں ثبات قدم کا سبق دیتی ہے اور یاس کی کفر آفرینی سے بچاتی

جب جماعتی زندگی کا فساد فرد کو بے حقیقت سا بنا دیتا ہے تو حسینؑ کی مثال اس فرد کو اس کی یہ ذمہ داری یاد دلاتی ہے کہ جماعت کو اخلاقی جماعت بنانے کا فرض آخری طور پر اس پر عائد ہوتا ہے۔ . . جب کبھی دنیا میں حکمِ حقیقی کی قدر کا تسلط ہوگا تو دنیا ضرور یاد کرے گی کہ اس کے سب سے بڑے محسن کے نواسے نے کس طرح اس کی حمایت میں اپنی جان نذر کی تھی جب دنیا میں افراد و اقوام ان اقدارِ اعلیٰ کے سیوک کی حیثیت سے ارتقاءِ روحانی و ذہنی کے منازل سبک رفتاری سے طے کرتی ہوگی اور ان قدروں کے حاملوں کو ناکامی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا تو وہ ضرور یاد کرے گی کہ صدیوں پہلے ایک بے یار و مددگار حق پرست نے ناکامی سے ڈرے بغیر ان اقدارِ اعلیٰ کی حمایت کی ہمت کی تھی جب دنیا ایک خدا سے ڈرے گی اور اس طرح سب اوروں کے ڈر سے نجات پا چکی ہوگی تو وہ یہ نہ بھولے گی کہ فاطمہؓ کے لالؑ نے میدان کربلا میں اپنا سر کٹوا کر اُس اطاعت اور اُس سربلندی کا مظاہرہ کیا تھا اُس وقت یہ بے نوا حکمرانوں کا حکمراں دکھائی دے گا۔ یہ ناکام دین و ایمان کا پشت پناہ نظر آئے گا اور اس کا خاک و خون میں لتھڑا ہوا سر الٰہی سطوت و جبروت کا علم معلوم ہوگا اور عارف اجمیری کے الفاظ میں سب پر روشن ہو جائے گا کہ

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد و نہ داد دست در دستِ یزید حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

روزانہ کے کام کاج

جامعہ میں یہ دن رات انتہائی مصروفیت کے عالم میں بیتتے۔ وہ صبح بہت سویرے بیدار ہوتے اور جامعہ چلے جاتے[1] جامعہ کی تمام عمارتوں کا چکر لگاتے، کلاسوں، دفتروں غسل خانوں، پاخانوں تک کا جائزہ لیتے۔ کاغذ کے اِدھر اُدھر پڑے پُرزے اٹھا کر اپنی جیبوں میں بھر لیتے۔ دیواروں پر اُلٹی سیدھی لکیریں بنی ہوتیں تو ان کو خود مٹاتے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ترانے میں (جو روزانہ صبح کو ہوتا تھا) شریک ہوتے اور چند منٹ بچوں کے سامنے تقریر کر کے اچھی باتیں بتاتے۔ یہاں سے اپنے دفتر چلے جاتے جہاں جیبوں سے ردی کاغذ کے ٹکڑے نکال کر ٹوکری میں ڈالتے۔ اپنی میز وغیرہ خود صاف کرتے یہاں تک کہ جھاڑو بھی اکثر خود ہی دیتے تھے[2] یہیں ان کے لیے نوکر گھر سے صبح کا ناشتہ لے آتا (یہ ناشتہ رات کی ایک باسی روٹی اور تھوڑے سے دودھ پر مشتمل ہوتا تھا) ناشتے کے بعد کام میں لگ جاتے۔ ان کاموں میں جامعہ کا دفتری اور تعلیمی ہر قسم کا کام شامل ہوتا۔ اکثر دو ڈھائی بجے وہ گھر کہلا بھیجتے کہ کھانا کھانے نہ آسکیں گے اور ان کا کھانا وہیں آجاتا جس کے بعد کام بدستور پھر شروع ہو جاتا۔ شام کو اکثر کہیں نہ کہیں جانا ہوتا کبھی کسی میٹنگ میں کبھی کہیں اور۔ جامعہ سے یہ سفر اکثر بس میں طے ہوتا جس کے انتظار میں اُس زمانے میں گھنٹہ بھر سے کم نہ لگتا تھا۔ بعض موقعوں پر تانگے یا ریڑھی یا

---

[1] منظور احمد کا بیان ہے کہ میں نے کبھی بھی صبح اُٹھ کر انہیں گھر پر نہیں پایا۔

[2] مسلم یونیورسٹی گزٹ ذاکر نمبر۔ ۲۰

کافی دور پیدل چل کرطے کیا جاتا۔ رات کو عموماً کافی دیر سے واپسی ہوتی لیکن گھر آکر کسی کو بھی جگائے بغیر جو کچھ ملتا چپکے سے کھا پی کر بستر پر چلے جاتے۔

ان مصروفیتوں کا نظارہ رشید صاحب کے الفاظ میں بھی کر لیجئے:

"جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں سارا قضیہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا تھا۔ اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا سوشل اور سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی زرِ خالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وسیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقے میں ان جیسا اور کوئی نہ تھا۔ کسی کو اپنے ذوقِ ذہانت و فطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اُس سے زیادہ دوڑ دھوپ اٹھاتے ہیں اور ہر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب

جیسا کوئی نہیں۔ جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں۔ اور بوڑھاپا یہ جانتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے۔" ۵۱

گھر کے اندر اور باہر

ذاکر صاحب کی گھریلو زندگی ہمیشہ انتہائی سادہ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ جامعہ میں تو ان کو مالی پریشانیاں بھی اکثر رہتی تھیں لیکن ان حالات سے انتہائی صبر وقناعت اور استقلال کے ساتھ نمٹنے میں ان کی بیگم صاحبہ (شاہ جہاں بیگم) کا کردار بھی قابلِ ذکر ہے جنہوں نے کبھی بھی ان معاملات میں ذاکر صاحب کو دماغی الجھنوں میں مبتلا نہیں کیا۔ وہ تعلیم سے محروم ضرور ہیں مگر تربیت سے نہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ گھر کے کام کاج میں ہر وقت منہمک رہتیں تمام ذمہ داری اور بار اپنے اوپر رکھتیں۔ حتیٰ کہ روپیہ کی سخت ضرورت کے وقت بھی اِدھر اُدھر سے لے کر کام چلالیتی تھیں مگر ذاکر صاحب کے سکون اور معمول میں فرق نہ آنے دیتیں البتہ جب بالکل ہی مجبور ہو جاتیں تو ان کے کمرے میں جاکر ان کی علمی مصروفیتوں میں دخل انداز ہوتیں۔

ذاکر صاحب کے پاس کپڑے بھی ہمیشہ ضرورت سے کم بلکہ چند ہی رہتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اُنہیں شہر میں کسی تقریب کے موقعے پر جانا تھا اور کھانا بھی رات کا وہیں تھا۔ تیار ہونے لگے تو اپنے دیرینہ خادم سے کہا کہ وہ کوئی سفید

---

۵۱ ' ذاکر صاحب ' ۔ ۶۲

شیروانی ہو تو لے آؤ" منظور احمد کا کہنا ہے کہ ان کے پاس جو کھدر کی سفید شیروانی تھی اس کا کالر بہت بوسیدہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے میں نے درزی کو ٹھیک کرنے کے لیئے دی اور اس نے اس میں نئے کھدر کا کالر لگا دیا، وہ اسی طرح دھلنے کو چلی گئی اور وہاں سے آئی تو کالر چھوٹا ہو گیا تھا، غرض وہی شیروانی کپڑوں کے ساتھ رکھ دی گئی لیکن جب کافی دیر ہو گئی اور وہ کپڑے بدل کر کمرے سے باہر نہ نکلے تو میں نے اندر جھانک کر دیکھا کہ آخر بات کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ کپڑے تو پہن چکے مگر آئینے کے سامنے کھڑے شیروانی کا کالر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بند کرنے کے لیئے زور لگا رہے ہیں اور وہ کسی طرح بند ہونے میں نہیں آتا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ "بھئی یہ کالر بند نہیں ہوتا" میں نے کہا "پھر کیا حرج ہے ایسے ہی چلے جایئے"۔ بولے "نہیں نہیں ایسے نہیں جاؤنگا" میں نے کہا "تو پھر ہاتھ چھوڑ کر سیدھے کھڑے ہو جایئے میں بند کیئے دیتا ہوں" اس پر تیار ہو گئے اور جب کالر پورے زور سے کھنچکر بند کیا گیا تو گردن کی رگیں پھول گئیں، کھال کالر سے باہر ابل پڑی اور چہرہ سُرخ ہو گیا۔ مگر خوش ہوئے کہ کالر بند ہو گیا۔ تقریب میں گئے اور کھانا وہیں کھا کر رات کو دس گیارہ بجے واپس ہوئے تو کالر اسی طرح بند تھا، نہ اس درمیان میں کھولنے کا موقعہ آیا اور نہ وہ کھولا جا سکتا تھا۔

ایک بار ایک لڑکا اُن سے ملنے آیا، اپنے گھریلو لباس میں اندر بیٹھے ہوئے تھے اطلاع ملنے پر ٹوپی سر پر رکھ کر باہر آئے تو دیکھا لڑکے کے سر پر ٹوپی نہیں ہے، بال بنائے ہوئے ہے جھٹ اپنی ٹوپی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی۔ لڑکا اس

خاموش نصیحت سے ایسا سٹ پٹایا کہ جو کچھ کہنے آیا تھا بھول گیا جب بھی کسی لڑکے کے سر پر میلی ٹوپی دیکھتے تو اسے اپنے ساتھ گھر لے آتے۔ خود اس کی ٹوپی دھو کر پریس کر کے پہنا دیتے۔ ناممکن تھا کہ وہ پھر کبھی میلی ٹوپی یا کپڑے پہن لے۔

جامعہ کے اسٹاف حتیٰ کہ چپراسیوں وغیرہ سے بھی کبھی ذاتی کام نہیں لیتے تھے وہاں کے کارکن بتلاتے ہیں کہ ادنیٰ سے آدمی کو اگر کسی سے شکایت یا کوئی تکلیف ہوتی تو بہت دھیان سے سنتے اور چند منٹوں میں شکایت اس طرح رفع کرتے کہ دونوں خوش ہو جاتے۔ اسٹاف کے ساتھ برتاؤ کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ جامعہ کے ایک ٹیچر منشی علی محمد بڑے کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے یہاں تک کہ ٹخنے سے نیچا پاجامہ پہننا گناہ سمجھتے تھے۔ ذاکر صاحب جب ان کی کلاس کے سامنے سے گذرتے تو اپنا پاجامہ ذرا سا اونچا کر لیتے اور بعد میں پھر ٹھیک کر لیتے کسی نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ "منشی جی کو یقین ہے کہ جس کا پاجامہ نیچا ہوگا وہ دوزخ میں جائے گا۔ وہ مجھے عزیز رکھتے ہیں میرا دوزخ میں جانا گوارا نہ کریں گے۔ میرا نیچا پاجامہ دیکھ کر انہیں دکھ ہوگا، انہیں دکھ سے بچانے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔"

ان کے پڑھانے کا طریقہ ایسا تھا کہ بچے ہوں یا بڑے کبھی ان کا جی نہیں گھبراتا تھا کیونکہ وہ عمر اور دلچسپی کے مطابق ہی باتیں کرتے اور پڑھا بھی دیتے تھے اپنے طلبا سے ان کا کہنا تھا کہ "وہ تعلیم کے مقاصد کو سمجھیں اور حصول علم کی کٹھن منزلوں کو صبر و استقامت کے ساتھ طے کریں، خود اعتمادی اور حق شناسی کا جذبہ پیدا کریں اور اپنی زندگی کو خدا کی مرضی کے مطابق بنائیں۔ ہاتھ کے سچے اور قول کے پکے بنیں، حق کے لئے جان دینا سیکھیں، خدمت خلق کو اپنا مذہب،

آزادی کو اپنا شعار اور اسلام کو اپنا مسلک بنا لیں" اکثر یہ شعر انہیں سُناتے:

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

جامعہ منزل کی طرف

جامعہ کی مالی امداد میں کافی اضافہ ہو چکا تھا اس کے علاوہ نہ صرف ملک کے چوٹی کے لیڈر یعنی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال، شیخ محمد عبداللہ وغیرہ تشریف لاتے رہتے بلکہ غیر ملکی رہنما مثلاً چیانگ کائی شیک اور دنیا کے تعلیمی ماہرین بھی مہمان ہوتے۔

ایک بار ایک صاحب تفریحاً اپنی کار میں جامعہ نگر آئے، سب طرف دیکھا بھالا اپنا کارڈ (پتہ) دیا اور اگلے دن کسی کو بھیجنے کے لئے کہہ کر چلتے بنے۔ اگلے دن آدمی گیا تو سو روپے پیش کیے کہ یہ جامعہ کو دیدیے جائیں یہ صاحب چاندنی چوک کے ساکن لاڈلی پرشاد صاحب تھے [۵]

'ہمدردان جامعہ' کے چندے کی رقم میں بھی کافی اضافہ سال بہ سال ہوتا گیا اور ۴۶-۱۹۴۵ء میں یہ رقم ۸۴ ہزار تک پہنچی۔ جوبلی کا ڈھائی لاکھ چندہ اس کے علاوہ تھا۔ تیس بتیس لاکھ کی مالیت کی زمین اور عمارتیں بھی اب جامعہ کی ملکیت ہو چکی تھیں۔ دہلی میونسپلٹی نے بھی گرانٹ منظور کی اور حکومت نے ۱۹۴۵ء میں جانچ کے بعد جامعہ کی سندوں کو تسلیم کر لیا۔ کیا اب یہ کہنے کی بھی ضرورت

۵۔ جامعہ کی کہانی، ص ۳۰۱

ہے کہ یہ سب کامرانیاں کس کی طبع بلند اور کس کی جانِ بے تاب کے طفیل تھیں اور کیا یہ بھی دہرانا ضروری ہے کہ اسٹاف کی بمع شیخ الجامعہ تنخواہیں اب بھی وہی ہیں یعنی پچھتر روپیہ ماہوار یا اس کے لگ بھگ۔

بچوں کا میلہ

جامعہ میں بچوں کا تعلیمی میلہ بھی ہر سال ہونے لگا تھا ۱۹۴۴ء کے میلے میں جھنڈا لہرانے کی رسم مولانا عبید اللہ سندھی نے ادا کی، ذاکر صاحب نے اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں تو اپنی جماعت کے لیئے وہ سربلندی مانگنی اور حاصل کرنی چاہیے جو اوروں سے بہتر خیال اور اوروں سے بہتر کاموں سے حاصل ہوتی ہے۔ جو سچے یقین سے ملتی ہے جو پیہم سعی و عمل سے ملتی ہے جو محبت اور خدمت سے ملتی ہے ہم اس ملک میں اپنے لئے سربلندی چاہتے ہیں، سرداری چاہتے ہیں لیکن یہی خدمت کی سربلندی۔ ظلم و جبر کی سر بلندی نہیں۔ ہم وہ سرداری چاہتے ہیں جو اس ملک کے سب باشندوں کے لیئے رحمت بن کر ہمیں ملے۔ جو اس ملک کے توہمات باطل اس کے رسوم فاسد، اس کی خود غرضیاں، اس کے ظلم اس کے مفلسوں کی بپتا مٹانے میں سب سے آگے ہونے پر ہماری ہو"۔

یونیسکو کانفرنس

۲۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ذاکر صاحب یونیسکو کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ یہ سال جامعہ کی زندگی میں پچیسویں گرہ لگا رہا تھا اور جوبلی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ انہوں نے جہاز سے ہی ۲۹ اکتوبر کے لئے پیغام روانہ کیا اور ایک پمفلٹ "جامعہ کیا ہے؟"،

لکھا۔

جوبلی کی تیاریاں اور چندہ

جوبلی منانے کے لئے نومبر ۱۹۴۶ء مقرر کیا گیا۔ اخراجات کے لئے ایک وفد نے ذاکر صاحب کی رہ نمائی میں ملک کا دورہ کیا، عام جلسوں میں تقریروں کے ذریعے عوام سے اور خاص محفلوں میں سرمایہ دار طبقہ کو متوجہ کیا مگر خودداری اور وقار کے ساتھ یہ کہہ کر کہ "اگر یہ کام ملک وقوم کے لئے مفید ہے تو جامعہ کے کارکنوں کا فرض نہیں کہ دست سوال آپ کے سامنے دراز کریں آپ کا اپنا کام ہے کہ اس کی امداد کے لئے ہاتھ بڑھائیں۔ جو قوم اپنے ایثار پیشہ خادموں کی قدر نہیں کرتی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں نہیں سوچتی اُسے بشارت ہو کہ اُس میں اس قسم کے کام کرنے والے پیدا ہی نہ ہوں گے" اُن کے الفاظ نے اتنا اثر کیا کہ بعض تو آنکھوں میں آنسو لے آئے۔ [۵]

۳۰ر اپریل ۱۹۴۵ء کو وہ بمبئی گئے تھے، یہاں ہندوؤں نے بھی دل کھول کر چندہ دیا، کل پچھتر ہزار ہوا۔ مئی میں دہلی اور رام پور وغیرہ گئے۔ مختصر یہ کہ جوبلی کے لئے دس لاکھ کی اپیل کی گئی تھی اور بارہ لاکھ سے اوپر جمع ہوا۔

جوبلی کا جشن

۱۵ر نومبر ۱۹۴۶ء کو امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ نے جھنڈے کی رسم ادا کی اور ذاکر صاحب نے اس موقعے پر تقریر کی۔ نمائش کا افتتاح نواب رام پور نے کیا۔ لیکن جوبلی کا خاص جلسہ ۱۷ر

---

[۵] غلام السیدین: "آندھی میں چراغ"

نومبر کو ہوا۔ یہ اس لحاظ سے یادگار اور تاریخی جلسہ تھا کہ اس میں لیگ اور کانگریس کے تمام چوٹی کے لیڈرز جمع ہو گئے جو اور کسی جگہ کبھی جمع نہ ہوئے تھے۔

مسٹر جناح کی شرکت

مسٹر جناح کو اس موقعے پر مدعو کرنے پر جامعہ کے کارکنوں میں قدرے اختلاف پیدا ہوا تھا ایک گروہ ان کے بلانے کے حق میں نہ تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں:

۱۔ کانگریس اور لیگ کی کش مکش پورے عروج پر تھی اور ملک کی فضا بحد خراب ہو چکی تھی۔ ایسے میں یہ خطرہ مول لینا مناسب نہ تھا۔

۲۔ مسٹر جناح اپنی دریدہ دہنی کے لیے تو مشہور تھے ہی لیکن کچھ ہی عرصہ پہلے قومی رہنماؤں خصوصاً حضرت مولانا آزادؒ کی شان میں انتہائی توہین کے الفاظ استعمال کر چکے تھے جس سے نیشنلسٹ حلقوں میں سخت غم و غصے کا احساس موجود تھا اور اگر وہ یہاں بھی اس قسم کے الفاظ منہ سے نکالتے تو معاملہ برداشت سے باہر ہو جاتا۔

دوسرا گروہ جس میں ذاکر صاحب بھی شامل تھے، اس معاملے میں مختلف نظریے رکھتا تھا اس کے بھی دو کارن تھے:

۱۔ تعلیمی میدان میں سیاسی مسلک کو نظر انداز کرنا ضروری تھا ورنہ سیاست کی کش مکش اور گندگی ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیتی۔

۲۔ مسٹر جناح کو ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ "قائد اعظم" بنائے ہوئے تھا اگر ان کے ساتھ یہ اعتبار برتا جاتا تو اس

طبقے کی ناراضگی کا باعث ہوتا اور چونکہ "ہمدردان جامعہ"
میں عام لوگوں کو بغیر سیاسی نظریہ بیچ میں لائے ہوئے ممبر بنایا
گیا تھا اس لیے یہاں بھی امتیاز درست نہ تھا۔

چنانچہ مسٹر جناح آئے، تقریر بھی کی مگر موقع کا لحاظ رکھ کر سنجیدہ اور
نپی تُلی۔ البتہ ذاکر صاحب کی تقریر اس موقعے پر ایک درد بھرے دل کی آخری
پکار تھی، انہوں نے جامعہ کی پچیس سالہ کہانی دہرائی آیندہ منصوبوں اور
ارادوں کا خاکہ پیش کیا اور اپنی بے تاب تمناؤں کا اظہار۔

"اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ اور کشادہ ہوتی، سینہ
بہلانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خون جگر
کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا
ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے
تو کیا یہ جلد بازی ہے؟ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو
شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی
تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اُٹھے جہاں لوگ
سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، دیکھ کر سیکھ سکیں، برت کر اپنا سکیں
اور سنوار سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر
فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا
جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو، جہاں
مل جُل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور ہم آہنگ

زندگی کی فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ للعالمینؐ کے چمن کے
نونہال بارآور سایہ دار بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ اُن کے فیض سے
ان کا سارا ماحول مستفیض ہو، وہ ہر جگہ سے حکمت کو یں کہ اُن کا
کھویا ہوا مال ہے اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے
موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔ اعلیٰ حضرت۔
اکابر قوم اور بلند ہمت دوستو اور عزیزو، اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنانِ
جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ
ہو سکے گی؟ اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ
یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا، لیکن اس کا
ایک جواب آپ سب کے ذمے بھی ہے۔"

قومی رہ نماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُن کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا
اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی پُر درد آواز میں اُن سے مخاطب ہو کر
پوچھا:

"آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں
ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت
اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن
شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر
سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے
دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گذار

کیسے پیدا کر سکیں گے ؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے ؟ .... آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گذرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو اس دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے ؟ "

وطن کے باوقار قومی لیڈروں سے دردمندانہ التجا کی کہ :

" خدا کے لیئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھایئے ۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی ، کیسے لگی ، آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھایئے ۔ یہ مسئلہ اِس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے ، خدا کے لیئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجئے " ۔

اور آخر میں پُرسوز لہجے میں کہا :

" جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں ، میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتلاتے اور دن رات اس ادارہ کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی ادارے کو نصیب ہوں گے ۔

انہوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے یہ قوم کے بچوں کے لیئے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لئے ترسے ہیں۔ یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لیے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا، یہ کتابوں کو ترستے ہیں، تحقیقی رسائل کو ترستے ہیں، انہیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے ...... انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے

آغشتہ اند ہر سر خارے بہ خونِ دل

قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ اند

اس تقریر کے لب و لہجے اور خصوصاً آخری حصے پر نہ صرف خود اُن کی آواز بھرّا گئی بلکہ حاضرین کی آنکھیں بھی تر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ ان کی تقریر کے بعد راجگوپال آچاریہ نے تقریر کی اور جامعہ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند کی طرف سے سات لاکھ رُوپے کی امداد کا اعلان کیا یوپی گورنمنٹ نے زمین عطا کی، نواب بھاول پور نے ایک لاکھ روپیہ دیا۔ پنڈت نہرو نے جامعہ کے ابتدائی دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے اپنے پیغام میں کہا تھا:

"اس کے پاس ایک ایسی چیز تھی جو اُس زمانے میں شاید ہی کسی دوسرے تعلیمی ادارے کے پاس ہو، وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی زیر قیادت اس کے مخلص، ایثار پیشہ اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے کارکنوں کی جماعت

تھی اس طرح زندگی کی معمولی سہولتوں کے نہ ہونے اور تنگ دستی کے باوجود اس کو ایک ایسی چیز مل گئی جو روپے پیسے اور کسی شخص کی سرپرستی سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہوتی ہے "

وزارت سے انکار

۱۹۴۶ء میں جب اینٹرم گورنمنٹ (عارضی حکومت) بنی تو ذاکر صاحب کو کانگریس کی طرف سے کیبنٹ میں لینے کی تجویز کی گئی لیکن انہوں نے اُسے منظور نہیں کیا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا خیال ہے کہ انہوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترکہ کابینہ متحدہ ہندوستان کا اصول مان کریں گی اُس وقت قبول کرنے سے انکار کردیا۔[۱] وہ صرف اس وقت اسے قبول کرسکتے تھے جب ان کا نام متفقہ طور پر پیش ہو

تعلیم اور تربیت کے مسئلے

اسی زمانے میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے اجلاس (لاہور) کی صدارت کے لیے ذاکر صاحب کو مدعو کیا گیا۔ جہاں ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم کے مسائل زیر بحث آنا تھے۔ اس موقعے پر اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے انگریزی کی بجائے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا ابتدائی سے پہلے کی تعلیم کے متعلق بالک باڑیوں، تربیت گاہوں و پرورش کے اداروں کی حمایت کے

---

[۱] 'نقوش' (لاہور) شخصیات نمبر۔ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ نے اپنی کتاب "ہسٹری آف انڈین نیشنل کانگریس" میں لکھا ہے کہ راجکماری امرت کور اور ذاکر صاحب کے ناموں پر وائسرائے کو اعتراض تھا اور یہ نام کانگریس کی بغیر اطلاع کے فہرست سے کاٹ دیے گئے تھے۔
History of Indian National Congress, V. 2 P. 801

ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ طبقہ کہیں بہت بڑا نہ ہو جائے جس میں بچہ کھو سا جائے اور اسے کوئی داخلی لگاؤ پیدا نہ ہو۔ اس لیۓ ایسی تربیت گاہ میں ۳۰ - ۴۰ سے زیادہ بچے نہ ہوں، اس میں ان کی ہر آسایش کا سامان ہو اور گھر کی طرح کا رہن سہن مہیا ہو - انہوں نے تعلیمی کام کی خصوصی منزلیں بیان کیں اور مدرسے میں ہاتھ کے کام سکھانے کی ضرورت پر زور دیا -

بھاول پور کالج کے کانوکیشن (اپریل ۱۹۴۶ئہ) میں طلبار سے مخاطب ہوئے تو اُنہیں تعیر سیرت کی طرف متوجہ کیا، اس کے اجزار اور ضروری صلاحیتوں کا تفصیلی جائزہ لے کر بتایا کہ جو اپنی سیرت کی تربیت کے کام کو اہم جانتا ہے وہ لپنے لیۓ بے غرض خدمت کے خاص میدان کا متلاشی رہتا ہے اور پھر:

> " سیرت کی تربیت کا کام دراصل ایک جنگ ہے جس میں آدمی بعض قوتوں کا ساتھ دیتا ہے، بعض سے لڑتا ہے - یہ کام مجاہدانہ ہے اس مجاہد کی خصوصی صفت اس کی اخلاقی جرأت ہوتی ہے جو سیرت بنانا چاہتا ہے اسے اپنے اندر یہ صفت پیدا کرنی چاہیئے..... میرا پیام آپ کو یہی ہے کہ اپنی سیرت کی تربیت کو اپنے ہاتھ میں لیجیۓ ضبط نفس اور بے غرض خدمت سے اس کے عناصر کی پرورش کیجیۓ ..... کام بڑا دشوار ہے اور عمر بھر کا کام ہے مگر اسی کام کرنے کے لیۓ تو زندگی عطا ہوئی ہے یہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے رہنے سے کیسے انجام پائے گا اس میں تو زندگی ہی کھپانی ہے " [۱]

---

[۱] "تعلیمی خطبات"

تعلیمی سنگھ اور مہاتما گاندھی

ملک کے آزاد ہونے کا وقت آیا تو مہاتما گاندھی نے وردھا اسکیم کو عملی روپ دینے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیئے ماہرین تعلیم کے ساتھ برابر ان کی بات چیت اور بحثیں ہوتی تھیں۔ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے جلسے جس کی کانگریس نے بنیاد ڈالی تھی برابر ہوتے رہتے اور ذاکر صاحب ان سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۱ر جنوری ۱۹۴۵ء کو بھی تعلیمی سنگھ کی میٹنگ میں ماہرین تعلیم جمع ہوئے۔ گاندھی جی چونکہ مون برت (خاموشی کا برت) رکھے ہوئے تھے لہٰذا ان کی تقریر ذاکر صاحب نے پڑھی جس میں نئی تعلیم کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ قومی زبان کے بارے میں کہا گیا تھا کہ "یہ یقیناً ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے جو آج کل لکھاوٹ کے دو اسٹائل رکھتی ہے اور ہمیں یہ دونوں لکھاوٹیں (فارسی اور دیوناگری) سیکھنا چاہیئے۔ ہمارے تمام سائن بورڈ دونوں لکھاوٹوں میں ہوں اور ہمارے درمیان کوئی ایسا نہ ہو جو دونوں کو بہ آسانی پڑھ لکھ نہ سکتا ہو"۔

۱۶ر فروری ۱۹۴۶ء کو بھی جب ذاکر صاحب تعلیمی سنگھ کے دوسرے ممبروں کے ساتھ مہاتما جی سے ملے تو غذائی حالات پر بھی تبادلۂ خیالات کیا۔ پھر ۲۹ر جولائی کو پونا میں کانگریسی صوبوں کے تعلیمی وزیروں کی بنیادی کانفرنس تعلیم کے منصوبوں پر غور کرنے کے لئے ہوئی۔

۲۱، ۲۲ر اپریل ۱۹۴۷ء میں بھی دہلی میں تعلیمی سنگھ کا جلسہ ہوا جس میں تمام تعلیمی پہلوؤں پر کھل کر بحث ہوئی۔ ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے درخواست

کی کہ وہ حکومت اور تعلیمی سنگھ میں عملی طور پر تعاون کرانے میں مدد دیں اور یا پھر سنگھ کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ اُنھوں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ کانگریس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے کبھی اپنی تعلیمی پالیسی کی تشریح اپنے وزیروں پر نہیں کی" اُنھوں نے بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ مولانا آزاد سے ملے تھے۔ مولانا نے اِن معاملات سے ہمدردی ظاہر کی اور تعلیمی سنگھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کا خیال تھا کہ مذہبی تعلیم کے لیئے اسکولوں میں سہولتیں مہیا کی جانا چاہئیں اور مذہبی امور کے ماہروں کو موقعہ دیا جائے کہ وہ یہ تعلیم دیں لیکن مہاتما گاندھی کو اس تجویز سے اتفاق نہ تھا انہوں نے فرمایا کہ "آپ کو اس سلسلے میں مولانا آزاد سے بات کرنا چاہیئے لیکن میرا خیال ہے کہ مذہبی تعلیم کے سلسلے میں اگر کچھ لوگ غلط قسم کی مذہبی تعلیم دیں گے تو آپ اُنہیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے اور اگر دیں گے تو نتائج اچھے نہ نکلیں گے اس لیئے گورمنٹ تو صرف ایسی اخلاقی تعلیم دے سکتی ہے جو تمام مذہبوں کی بنیاد ہو اور تمام پارٹیاں اس پر متفق ہوں کیونکہ دراصل حکومت سیکولر ہوگی"۔ ۲۲ اپریل کو یہ اجلاس ختم ہوا۔ اسی دن مہاتما جی نے اپنی پرارتھنا میں سنگھ کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور دونوں لکھاوٹوں میں ہندوستانی زبان کے استعمال پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "میں نے دانستہ مشترکہ اپیل (گاندھی جناح) پر دونوں لکھاوٹوں میں دستخط کیئے ہیں" [۱]

---

۱ - TENDULKAR V. 7, P. 419-51

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء

ہندوستان کی آزادی کا یادگار دن آیا تو پروگرام یہ تھا کہ جامعہ کے ہر چھوٹے بڑے کو صبح چار بجے ایک مقررہ جگہ پہنچنا ہے جہاں جھنڈا لہرانے کی رسم ادا ہونا تھی۔ یہ شاید پہلا موقعہ تھا کہ جب ذاکر صاحب کو اپنے دیرینہ خادم منظور احمد پر غصہ آیا تھا۔ ان کے کردار و عمل کا یہ دلچسپ واقعہ گھر کی چہار دیواری میں دیکھا جا سکے گا ہوا یہ کہ ان کا یہ خادم منظور (جو اُس وقت کم عمر لڑکا تھا) اوپر چھت پر سویا ہوا تھا اور بیگم صاحبہ کے دو بار اٹھانے پر بھی پوری طرح نیند سے بیدار نہ ہو سکا۔ ذاکر صاحب نے کئی بار پوچھا، آخر کار تولیہ اور پانی کا لوٹا لے کر اوپر جانے لگے تو زینے میں مڈبھیڑ ہوئی، بولے "آیئے میں آپ کا منھ ہاتھ اوپر ہی دُھلا دوں" منظور کو کچھ نیند کا خمار، کچھ اُن سے تصادم کی جھنجھلاہٹ، جواب کسی قدر ناگواری کے انداز میں دیا اُدھر ذاکر صاحب کی بڑی بھاوج جو اُن دنوں مہمان آئی ہوئی تھیں اُن کو پکارنے لگیں ذاکر صاحب نے غصے میں لوٹا تولیہ وغیرہ زینے ہی میں ٹیک دیا اور چلے گئے۔ ناشتے پر بیٹھے تو اب بھی منظور کا پتہ نہ تھا وہ حضرت ابھی غسل خانے ہی میں اٹکے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب نے کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہ کی بلکہ ناشتے کی ٹرے لے کر اس کی طرف آنے لگے کہ پہلے منظور کو ناشتہ کراؤں گا۔ وہ

لے حسن اتفاق کہ آج پورے بیس سال بعد ۱۵ر اگست ۱۹۶۷ء کی صبح ہو رہی ہے جب یہ سطور حوالۂ قلم کی جا رہی ہیں اور وقت بھی وہی ہے یعنی صبح کے چار بجا چاہتے ہیں۔ (خورشید رضوی)

دراصل بیحد غصے کے عالم میں تھے کیونکہ چار بجنے والے تھے اور جھنڈا لہرانے کی رسم ادا ہونا تھی وہ چاہتے تھے کہ منظور کو بھی آج کی اہمیت کا احساس ہو۔ غرض یہ کہ سب کے کافی کہنے سننے پر باز آئے اور خود ناشتہ کر کے جھنڈے کی رسم ادا کرنے چلے گئے۔ منظور کا کہنا ہے کہ جب دو ڈھائی بجے کے قریب انہیں فرصت ملی تو مجھے بلا کر محبت سے سمجھایا اور ۱۵ اگست کی اہمیت بتائی۔

فسادات کے شعلوں میں

کام کاج کی زیادتی اور انتھک مصروفیتوں کا اثر صحت پر آخر کب تک نہ پڑتا، چنانچہ ۱۹۴۷ء میں وہ گھڑی بھی آگئی جب ڈاکٹروں کا یہ اصرار ٹالا نہ جا سکا کہ وہ کچھ دن کے لئے کشمیر چلے جائیں۔ غالباً اگست ۴۷ء کے آخر میں وہ کشمیر کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں منظور احمد ان کے ہمراہ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اسی گاڑی سے ریلوے کے ایک افسر (مسٹر کپور) بھی سفر کر رہے تھے وہ ذاکر صاحب کو نام سے جانتے تھے کبھی دیکھا نہ تھا۔ انہوں نے منظور احمد سے تصدیق کی اور اپنے ڈبے میں چلے گئے اس کے بعد ایک اسٹیشن پر ذاکر صاحب سے ملے، بات چیت کی اور انہیں بتایا کہ فضل[۵] صاحب بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں

گاڑی لدھیانے پہنچی تو ان لوگوں نے پٹھان کوٹ جانے کے لئے معلومات کیں مگر اسٹیشن ماسٹر نے (شرارتاً) صحیح اطلاع نہ دی اور یہ لوگ جالندھر پہنچ کر اترے یہاں اسٹیشن پر کوئی نہ تھا صرف گورکھے پہرہ پر تھے۔ فضل صاحب

---

۵ جالندھر کے رہنے والے کوئی صاحب تھے۔

کہنے لگے کہ آج آپ میرے یہاں قیام کریں۔ اتنے میں ایک لمباتڑنگا سکھ دس بارہ آدمیوں کے ساتھ آیا اور ان لوگوں کے قریب آکر اپنے ساتھیوں سے (پنجابی میں) کہاکہ "سامان اٹھالو" یہ سنکر منظور احمد نے اُنہیں روکنا شروع کیا، اسی جھگڑے میں فضل صاحب سے زیادہ تیز گفتگو ہوگئی اُنہوں نے اُن آدمیوں کے سردار کے ایک تھپڑ رسید کر دیا جس سے وہ آگ بگولا ہوگیا، اپنی کرپان نکال لی اور حکم دیاکہ گولی چلاؤ۔ اس کی زبان سے یہ سُنکر گورکھا ملٹری کے آدمی اپنی بندوقوں کی نال ان سب کے سینوں پر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ منظور احمد کا کہنا ہے کہ یہ دیکھ کر میرے اور فضل صاحب کے ہوش اُڑ گئے میں نے بندوق کی نالی ذاکر صاحب کے سینے پر رکھی دیکھی تو تڑپ کر اپنا ہاتھ نال کے سامنے کردیا مگر ان کے چہرے پر خوف ودہشت کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہ تھی، نہ اُنہوں نے اپنی جگہ سے انچ بھر بھی جنبش کی اور اس طرح جس ذات مقدس کا نام نامی ان کے نام کا جزو ہے اس کی سیرت وکردار کا پرتو ان کے اس بے باکانہ انداز میں نظر آیا ——— یہ منظر کپور صاحب نے دیکھا تو لپک کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے، اس کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کیا اور ذاکر صاحب کا نام بتایا تو وہ باہر آگیا اور فوجیوں کو ہٹاکر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اتنے ہی میں ایک سکھ ملٹری افسر (گوردیال سنگھ) اُدھر آنکلا تو کپور صاحب نے اس سے بھی یہ ماجرا کہا۔ ذاکر صاحب نے کمرے میں سے اُسے دیکھا تو فوراً باہر نکل آئے اور گوردیال سنگھ سے انگریزی میں (غالباً ملٹری کے ناقص انتظام کے بارے میں) گفتگو کرنے لگے وہ بہت شرمندہ تھا، نتیجہ یہ ہواکہ گوردیال سنگھ نے

گورکھا ملٹری کو حکم دیا کہ ان لوگوں کی حفاظت کرے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو نالیں ان سب کے سینوں کو نشانہ بنانے والی تھیں اب ان کی حفاظت میں سیدھی ہو گئیں مگر سامان سب لٹ چکا تھا جب گوردیال سنگھ جیپ منگوا کر ان سب کو سوار کرانے لگا تو فسادیوں کی بھیڑ پھر اکٹھا ہو گئی اور اس کو الگ لے جا کر اصرار کرنے لگے کہ ان کو ہمارے حوالے کرو، وہ کسی طرح نہ مانا اور کہا کہ میں ان کی حفاظت کا وعدہ کر چکا ہوں تو کہا اُن کو کچھ دور حفاظت سے لے جا کر چھوڑ دو وعدہ بھی پورا ہو جائے گا اور ہمارا کام بھی بنے گا یہ بھی اسے منظور نہ ہوا غرض کافی دیر بحث ہوئی اس کے بعد وہ ان کو جیپ میں بٹھا کر (فضل صاحب کے کہنے پر) ان کے دوست بیدی صاحب کے یہاں لے گیا جو وہاں جج تھے۔ یہ لوگ وہاں بہت آرام سے رہے۔ اگلے دن بیدی صاحب نے موٹر میں سوار کرایا، آدمی ساتھ کیے اور اسٹیشن بھیجا کہ دہلی جانے والی گاڑی میں سوار کرا دیں مگر راستے میں ایک جیپ میں گوردیال سنگھ نظر پڑے ذاکر صاحب نے کہا گاڑی روکو اور خود فوراً اُتر پڑے۔ ان کا اترنا تھا کہ داڑھی دیکھ کر بھیڑ پھر اکٹھی ہونے لگی جسے گوردیال سنگھ صاحب نے دھمکا کر بھگایا اور ذاکر صاحب سے کہا کہ آج میرے ساتھ کھانا کھائیے اور قیام کیجیے اُنہوں کہا اس وقت کیا موقع ہے پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ اُس نے کچھ رقم بھی پیش کرنا کرنا چاہی مگر انہوں نے قبول نہ کی۔ اس نے اپنی حفاظت میں اسٹیشن پہنچا کر سوار کرا دیا۔

گاڑی لدھیانے پہنچی تو پھر کچھ غنڈے نظر آئے مگر ذاکر صاحب پھر

بے دھڑک اتر کر پلیٹ فارم پر آ گئے۔ اتنے میں ایک شخص (ہندو) آ کر اُن کے قدموں پر گر پڑا اور کہا کہ آپ میرے استاد کے استاد ہیں، میں آپ کے ہمراہ چلوں گا اور آپ پر آنچ نہ آنے دوں گا۔ نہ جانے وہ کون تھا۔ چند سکھ نوجوان بھی جو دہلی کے طالب علم تھے اسی ڈبے میں آ گئے اور کہنے لگے کہ ہم اپنی جانیں دے کر بھی آپ کی حفاظت کریں گے یہ نوجوان جالندھر پر بھی ملے تھے اور حفاظت کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر اسٹیشن ماسٹر نے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔

دہلی آ کر ذاکر صاحب نے پنڈت نہرو کو فون پر سب حالات سُنائے منظور احمد کا بیان ہے کہ "واپسی کے بعد اتنے لوگ انہیں پوچھنے آئے کہ وہ حالات سناتے سناتے پریشان ہو گئے آخر مجھ سے کہا کہ مجھے کہیں چھپا دو میں نے ایک جگہ انہیں بند کر دیا اور کئی دن بعد باہر نکالا۔

دہلی میں فسادات

جالندھر سے واپس آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ شروع ستمبر میں دہلی پر بھی ستم ٹوٹا اور بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی جانے لگی۔ جب جامعہ پر حملہ کا خطرہ پیدا ہوا تو پنڈت نہرو نے ان سے کہا کہ وہ وہاں سے ہٹ کر محفوظ جگہ میں آ جائیں مگر ذاکر صاحب نے صاف صاف بتا دیا کہ جامعہ پر حملہ ہو گا تو میرے خون کا ہر قطرہ یہیں گرے گا میں اپنی جگہ سے ہٹنے والا نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے دفتر میں بدستور کام کرتے اور دوسروں سے کراتے تھے۔ اپنے ساتھیوں سے انہوں نے کہہ دیا کہ آپ لوگ سب چلے جائیں میں اکیلا یہاں رہوں گا، زندہ رہا تو پنجاب

سے آنے والوں کو بڑھا کر ہی اپنی زندگی گذار دوں گا "۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں کہ "ان کے ہمدرد اصرار کر رہے تھے کہ دہلی چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ مگر ذاکر صاحب کے قدم جمے رہے اور اُن کی وجہ سے ہزاروں اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے "۔ [1]

منظور احمد کا بیان ہے کہ رات کو باری باری ہم لوگ پہرہ دیتے اور ذاکر صاحب ہماری ہمت بڑھاتے، پیٹھ ٹھونک کر کہتے کہ منظور احمد اگر حملہ ہو تو اتنے ہی فسادی مرے ہوئے نظر آئیں جتنی اس بندوق میں گولیاں ہیں"

مہاتما گاندھی کی آمد

مہاتما گاندھی فسادات کے شروع میں دہلی میں موجود نہ تھے وہ ۹ ستمبر کو پہنچے یہاں پنڈت نہرو انتہائی سراسیمہ اور پریشان تھے اُنہوں نے گاندھی جی کو بتایا کہ دہلی کی سڑکیں لاشوں سے پٹی پڑی ہیں، غنڈوں نے امن و امان غارت کر دیا ہے اب ہم پاکستان کو کس منھ سے کچھ کہہ سکیں گے"۔ [2]

گاندھی جی بالکل بے بس تھے پھر بھی ان کی موجودگی اور بے چینی نے وہ بہت کچھ نہ ہونے دیا جو ہونا تھا۔

۱۰ ستمبر کو مہاتما جی جامعہ آئے یہاں آس پاس کے لوگ پناہ لینے جمع

---

[1] نقوش، شخصیات نمبر

2. TENDULKAR V 8, P. 277-99
PYARE LAL, V. 2, P. 435-36

ہوئے تھے اُن کی مصیبت سُنی، اُنہیں تسلّی دی۔ ایک عورت دو مہینے کا بچہ گود میں لیئے ہوئے تھی جسکے ماں باپ فساد میں کام آگئے تھے۔ یہ منظر بہتوں کی آنکھوں میں آنسو لے آیا اور ان میں خود مہاتما جی بھی شامل تھے جنہوں نے یہ کہہ کر منظر کو اور بااثر بنا دیا کہ "وقت آجائے تو ہونٹوں پر خدا کا نام لیکر جان دے دو مگر ہمت نہ ہارو"۔ پھر انہوں نے جامعہ کے مرد اور عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"اگر تم میں سے ہر ایک کو اس خوب صورت ادارے کے لیئے جان دینا پڑے جسکو ہندو مسلمانوں نے مل کر جنم دیا ہے تو مجھے دکھ نہ ہوگا" [۱]

ایک جگہ انہوں نے پناہ لینے والوں کے سامنے کہا:

"میں عہد کرتا ہوں کہ یا تو حالات کو درست کروں گا یا اسی کوشش میں جان دیدوں گا" [۲]

ذاکر صاحب نے مہاتما جی کو جالندھر کا واقعہ سُنایا۔ اُنہیں یہ واقعات سُنکر انتہائی دُکھ ہوا کہ اگر اس دیش میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی جان بھی محفوظ نہیں تو پھر یہاں زندگی کس کام کی۔ [۳] ۱۰ ستمبر کو اپنی پرارتھنا سبھا میں کہا:

---

1 - PYARE LAL, V. 2, P. 435-36

۲ اخبار 'لیڈر' (الہ آباد) ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء

3 - PYARE LAL, V. 2, P. 435-36

"ڈاکٹر ذاکر حسین میرے پیارے دوست ہیں۔ انہوں نے سچ مچ دکھ کے ساتھ مجھے اپنی کہانی سنائی لیکن ان کے من میں کسی طرح کی کڑواہٹ نہیں تھی۔ اگر ایک سکھ ملٹری افسر اور ایک ہندو ریلوے کرمچاری نے وقت پر ان کی جان نہ بچائی ہوتی تو غصّے سے پاگل بنے سکھوں نے مسلمان ہونے کے قصور میں انہیں جان سے مار دیا ہوتا" ؎۱

فسادات کے بعد دہلی میں یہ خونی ڈرامہ ختم ہوا تو لاکھوں آدمی قتل، زخمی اور بے گھر ہو گئے تھے۔ وہ اب مختلف کیمپوں میں پڑے تھے۔ جامع مسجد پر، پرانے قلعے میں اور دوسری جگہوں پر۔ مہاتما جی نے ۱۱-۱۲-۱۳ ستمبر کو ان کیمپوں کا خود معائنہ کیا ان کو ضرورت کی چیزیں مہیا کرائیں۔ ایک ایمرجنسی بورڈ ان کی امداد کے لئے بنایا گیا جو ماؤنٹ بیٹن کی تجویز پر بنا اور مولانا ابو الکلام آزاد کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ ذاکر صاحب نے پناہ گزینوں کی حالت کا خود پرانے قلعے پہنچکر جائزہ لیا، ان کی تکلیفوں کو دیکھا اور یہ حالات بورڈ کے سامنے بیان کئے۔ انہوں نے کہا کہ "ان لوگوں کو موت سے بچا کر زندہ درگور کر دیا گیا ہے"۔ تب بورڈ نے ان پناہ گزینوں کی امداد کا تیزی سے سامان کیا۔ ؎۲

؎۱ پاٹھک: "اپ راشٹرپتی ذاکر حسین" (ہندی)

؎۲ (مولانا) ابو الکلام آزاد: "ہماری آزادی" ترجمہ انڈیا ونس فریڈم

مکتبہ جامعہ فسادات میں جامعہ پر تو آنچ نہ آئی مگر اس کی قیمتی لائبریری اور مکتبہ جامعہ جو قرول باغ میں تھا تباہ ہوا۔ بعد میں ذاکر صاحب نے اسے دوبارہ لمٹیڈ کمپنی کی شکل میں قایم کیا اور عرصے تک بورڈ آف ڈائرکٹرز کے چیرمین رہے۔[1]

درد بھری پکار ذاکر صاحب کے دلِ پُر درد نے اُن زہریلی فضاؤں سے تڑپ کر قوم کو پکارا اُن کی پر سوز آواز آل انڈیا ریڈیو سے (آزادیٔ وطن سے تقریباً دو ماہ بعد) گونجی:

"اپنی انسانیت کو بچاؤ اپنی قوم کے تہذیب زندگی کے حق کو تلف نہ ہونے دو۔ تہذیب اور انسانیت اور شرافت کی وہ ساری پونجی جو ہم نے غلامی کی گھٹا ٹوپ رات میں نفاق کی آگوں سے، خود غرضی کے طوفانوں سے بچا کر نکالی تھی اُسے آزادی کی پَو پھٹتے وقت خاک میں ملاتے ہو؟ ۔ ایسا نہ کرو۔ اسے بچاؤ اور تہیہ کرو کہ اپنی زندگی کو اس پیارے کام میں کھپادو گے جس کی ذمہ داری آزادی نے تمہارے کاندھوں پر رکھی ہے۔ یاد رہے اس کام کو نفرت کی گندگی میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں اور دلوں سے کبھی انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے محبت کی، بھروسے اور یقین کی"

نئی تعلیم کا کام دسمبر ۱۹۴۷ء میں مہاتما جی نے تعلیمی سنگھ سے تبادلۂ خیال

---

[1] 'کتاب نما'، اکتوبر ۱۹۶۷ء

کیا۔ ذاکر صاحب تعلیمی سنگھ کے صدر کی حیثیت سے اس میٹنگ میں شریک ہوئے نئی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم وغیرہ کے مسائل زیر بحث رہے گاندھی جی نے فرمایا:

"اس راہ میں آج ایک نئی رکاوٹ آگئی ہے یعنی ہمارے دیش میں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ ہندو مسلمان ساتھ نہیں رہ سکتے اور مسلمانوں کو ہندوستان سے یا تو چلا جانا چاہیئے یا ہندوؤں کی ماتحتی میں غلام بن کر رہنا چاہیئے۔ یہ ایک خطرناک اور زہریلا نقطۂ نظر ہے اور اس تصور میں پاکستان کی روح کام کر رہی ہے۔ پاکستان کا خواب پورا ہو گیا مگر اس کا زہر ابھی باقی ہے اور میں نے تہیہ کیا ہے کہ اسی زہریلے تصور کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان دوں گا لیکن لوگوں کے غلط اندازِ فکر اور ذہن کو درست کرنا 'نئی تعلیم' کا کام ہے"۔

ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں زیر بحث مسائل پر روشنی ڈالی اور کہا کہ جو کچھ گاندھی جی نے کہا وہ یقیناً ناگزیر اور ضروری ہے تاہم سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے "آزادی کے بعد حالات میں نمایاں تبدیلی آئی ہے" اُن کا خیال تھا کہ فلاحی تنظیموں کو جیسا کہ گاندھی جی نے مشورہ دیا ہے اگر ایک دوسرے میں ملا کر ختم کر دیا گیا اور اس سے صحیح نتائج برآمد نہ ہوئے تو بجائے فائدے کے نقصان ہوگا اس لیئے تجویز ہوا کہ وہ علیحدہ علیحدہ ایک درخت کی شاخوں کی طرح کام کریں۔

اس دن کانگریس کی تعمیری کام کرنے والی کمیٹی کی میٹنگ میں مہاتما جی

نے ایک لمبی تقریر کی اس میں آچاریہ کرپلانی ۔ شنکر راؤ دیو اور آر دیواکر وغیرہ شریک ہوئے ان لوگوں نے مہاتما جی سے پوچھا کہ کانگریس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد تعمیری کاموں کو اہمیت دینا چھوڑ دیا ہے تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تعمیری کام کرنے والی جماعتیں اپنی علیحدہ تنظیم کریں اور اس کے ذریعے حکومت کی باگ ہاتھ میں لیں۔ مہاتما جی نے جواب دیا کہ "تعمیری کاموں کی طرف سے حکومت کی توجہ ہٹنے یا ان کے نظر انداز ہونے میں قصور ہمارا یعنی تعمیری کارکنوں کا ہے کیونکہ ہمارے اندر عموماً سمجھ بوجھ اور دانش مندی کی کمی ہے" اُنھوں نے تفصیلی تقریر میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ "کیا آج ہمیں حکومت چلانے کے لیئے بااُصول آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے"؟ گاندھی جی نے کہا "ہم اپنی پسند کے آدمی بھیج سکتے ہیں بغیر اس کے کہ ہم حکومت میں داخل ہوں۔ آج ہر کانگریسی اقتدار کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے ہمیں ان اقتدار پرستوں کی ٹولی میں شامل نہیں ہونا چاہیئے اور حکومت کی طرف سے بے نیاز ہو کر یہ تعمیری اور اصلاحی کام کرنا ہیں۔ اُنہوں نے آگے چل کر کہا کہ ہم میں انتشار کے بجائے مقصدی اتحاد ہو جائے تو پھر ہمارے اندر خود شکتی نکھر آئے گی۔ آپ مجھے چھوڑیئے، ڈاکٹر ذاکر حسین اعلیٰ درجے کے منتظم ہیں ان کی تجویز ہے کہ کسی بات کا فیصلہ اسی وقت نہیں ہونا چاہیئے اور یہ معاملات بعد میں سیواگرام میں اٹھائے جائیں۔ مجھے اس سے اتفاق ہے کیونکہ وہ فضا پرسکون اور فرقہ وارانہ زہر سے پاک ہوگی"۔ [1]

---

[1] ٹنڈولکر: 'مہاتما' (انگریزی) جلد ۸ ص ۲۸۳

TENDULKAR V 8 P. 277 99

ایک دور

چاروں طرف نفرت اور فساد کی بھڑکی ہوئی آگ، نے ذاکر صاحب کے تصورات کو بھسم کرکے ان کی امیدوں پر یکسر پانی پھیر دیا تھا پھر بھی اس تاریکی میں ان کو اپنے فرض اور قومی لگن کی روشنی راہ دکھاتی رہی۔ مگر یہ دور اُن کے لئے سخت جسمانی اور دماغی محنت کا تھا۔ دہلی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطرار اور مایوسی۔ ہندو سکھوں کی بے وطنی اور پریشانی کے مناظر دیکھنا پڑے اور ان سب کی یکساں خدمت کرنے والوں کے ساتھ اَن تھک کام کرنا اور وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑا جس کو اگر آج بھی دہرایا جائے تو —— "نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز"

مہاتما گاندھی کو خط

حالات درست کرنے کے لیے مہاتما گاندھی کو جان کی بازی لگانا پڑی اور ۱۳ر جنوری ۱۹۴۸ء کو اُنہوں نے مرن برت شروع کر دیا۔ اس موقعے پر ذاکر صاحب نے اُنہیں ایک خط میں لکھا:

"آپ نے قوم کو اپنا دل صاف کرنے کے لیے بڑے صحیح وقت پر پکارا ہے۔ خدا نے آپ کو وہ طاقت اور اعتماد عطا کیا ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتا وہ مضبوط عقیدہ دیا ہے جس کو بدترین حالات بھی ڈگمگا نہیں سکتے خدا آپ کے ساتھ ہے، آپ یقیناً کامیاب ہوں گے ...... خدا کرے آپ اس بلندی اور آزادی کی طرف رہنمائی کے لیئے زندہ رہیں جس کے لیئے آپ جد و جہد کرتے رہے ہیں اور جس کے آپ ہمیں لائق سمجھتے ہیں ہماری تمام ناعاقبت اندیشیوں اور گمراہیوں کے باوجود بھی۔"[1]

---

[1] پیارے لال: "مہاتما گاندھی" (انگریزی) جلد ۲ ص ۱۲۷

باپو کی قربانی

حالات ٹھیک ہونے بھی نہ پائے تھے کہ ۳۰ر جنوری ۴۸ء کو فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے جنون نے مہاتما گاندھی کو شکار بنایا۔ ان کی اچانک جدائی ذاکر صاحب کے لیے ایک اور دل توڑنے والا صدمہ تھی جس کی جھلک ان کی اُس زمانے کی تقریروں میں نظر آتی ہے۔ ۱۲ر فروری کو مہاتما جی کے پھول بھسم کی رسم کے موقعے پر وہ رام پور میں تھے جہاں اس دن کوسی ندی کے کنارے یہ رسم نواب رضا علی خاں نے بڑے اہتمام سے ادا کی۔ اُسی دن تعزیتی جلسے میں ذاکر صاحب نے ایک پُرسوز تقریر کی[۱]۔ ایسی ہی ایک اور تقریر اسی سال دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کے جلسے کی ہے جس میں انہوں نے کہا:

"بڑی بھول میں ہے وہ جو سمجھتا ہے کہ یہ آواز چپ ہو گئی ہے۔ نہیں یہ ہمارے قومی جیون کے رونگٹے رونگٹے میں بس گئی ہے۔ سچ کے راستے پر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں گے تو یہ ہمیں للکارے گی ظلم کے لیے جب کبھی ہمارے ہاتھ اُٹھیں گے تو یہ روکے گی۔ ہم خود کبھی کبھی اس آواز کو دبانا چاہیں گے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر اس کے سننے سے بچیں گے مگر یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ یہ کانٹا بن کر ہمارے دل میں کھٹکے گی۔ ہماری نیند حرام کر دے گی اور اپنے کو منوا کر اور سنوا کر رہے گی۔ اور اگر کہیں ہم نے اسے دبا دیا، ہمارے

---

[۱] روزنامہ 'آغاز' رام پور ۱۵ر فروری ۴۸ء۔

کان اس کے لیے بہرے ہو گئے تو ہم چاہے کچھ اور بن جائیں مگر دنیا میں ایک اچھی، سچی اور نیک قوم نہ بن سکیں گے۔ خدا نہ کرے کہ ہم کبھی اس آواز کو دبا سکیں" [1]

---

[1] یادوں کی دنیا۔ ۱۲۷

باب ۵

علی گڈھ

کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

ذاکر صاحب کے آگے کامرانیوں کی بے شمار راہیں اب سے بہت پہلے کھل چکی تھیں وہ جس راہ پر چلتے سجھ داری، خلوص اور شخصی دل فریبی کی نگینیاں اُنہیں اپنے دائرے میں پورے عروج پر پہنچا تیں " وہ جس شعبۂ زندگی کو اپنے لیے اختیار کرتے اس میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت شہرت، مقبولیت اور کمال حاصل کر سکتے تھے" [۱] لیکن انہوں نے زندگی کی ان کامرانیوں سے منھ موڑ کر، تکلیف کو راحت پر، خدمت کو حکومت پر، ایثار

---

[۱] غلام السیدین: 'آندھی میں چراغ'۔

کو دولت پر اور درویشی کو خسروی پر ترجیح دی۔

تعلیمی کام کا تصور ذاکر صاحب کی نظر میں بہت وسیع ہے انہوں نے اسے اہم ترین قومی کام سمجھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قوموں کے بنانے میں اور افراد کے کردار میں انسانی خوبیوں کا بیج بونے کے لیے تعلیم و تربیت کا کام ہر قومی و سیاسی کام پر بھاری ہے۔

جامعہ کو چھوڑ کر علی گڑھ آنے میں بھی اُن کا ذہن قومی تعمیر کا یہی تصور لیے ہوئے تھا۔ کیونکہ ۴۸-۱۹۴۷ء کے نازک دور میں ہندوستان کے بے سہارا مسلمان کو اچانک اپنی کوتاہیوں کے بھیانک نتائج کا اژدہا منھ کھولے نظر آتا تھا، اس کے پراگندہ ذہن کو صرف اُبھرتے ہوئے جمہوری ہندوستان کے قومی سانچوں میں ڈھالنا اور اس کے ذہنی کردار کی از سرِ نو تعمیر کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی تاریک راہوں میں روشنی بھی بکھیرنا تھا۔ یہ راہ، غور کیجیے تو جامعہ کی ڈگر سے بھی زیادہ کٹھن، دشوار گذار اور زیادہ پُرخار تھی۔

یونیورسٹی کے معاملات میں حصہ

تحریک خلافت کے زمانے میں علی گڑھ کالج سے باغی بن کر علیحدہ ہو چکے تھے، بظاہر تعلق ٹوٹ ہی گیا تھا مگر یونیورسٹی کے معاملات سے بے تعلق نہ رہ سکے اور جرمنی سے واپسی کے چند سال بعد ہی عملی حصہ لینے پر مجبور ہوئے۔ یونیورسٹی کورٹ، اکزیکٹو کونسل، اکیڈمک کونسل اور شعبہ اقتصادیات کے ممبر رہے، جب بھی کوئی متعلقہ کمیٹی بنتی ذاکر صاحب کا نام پہلے پیش ہوتا اور بے چون و چرا منظور۔ وہ بیرونی اشخاص کے ممبر ہونے کی جہاں

کہیں ضرورت ہوئی ذاکر صاحب ضرور شریک کئے گئے اور ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جس نے ان کی معاملہ فہمی، خلوص اور قطعاً بے لوث ہونے کا اعتراف نہ کیا ہو" لہ

ایک بار اکزیکٹو کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے مذہبی عقیدے قابل گرفت ہیں۔ سر سلیمان مرحوم وائس چانسلر تھے۔ کونسل میں تقریریں ہر طرح کی ہوئیں مگر اُلجھن میں اضافہ ہی ہوا۔ مسئلے کی نوعیت یہ تھی کہ ہر مسلمان ممبر اسٹاف سے ایک تحریر لی جائے کہ وہ مذہبی عقائد اور اسلامی روایات کا احترام کرے گا لیکن سوال یہ تھا کہ تحریر کا مضمون کیا ہو۔ بحث طویل ہونے لگی تو سر سلیمان نے ذاکر صاحب سے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ نے تو ساری بحث سُن لی اب کوئی فارمولا ایسا وضع کیجئے کہ جس پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اتفاق ہو جائے" ذاکر صاحب نے فی الفور ایک مسوّدہ تیار کر کے مرحوم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بغیر کسی مزید گفتگو کے ہر شخص نے اسے قبول کر لیا۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اس تحریک کی موافقت میں سر بکف تھے اور وہ بھی تھے جو اس کی مخالفت میں شمشیر برہنہ ٢ے اسی طرح ایک اور معاملے میں جب بحث نے ناخوشگوار صورت اختیار کی تو سر سلیمان نے ذاکر صاحب سے فرمائش کی

لہ رشید احمد صدیقی : ذاکر صاحب ۱۴

٢ے ذاکر صاحب : ۱۵

کی اور انہوں نے یہ گتھی سلجھادی "ایک صاحب جو ذاکر صاحب اور جامعہ دونوں کو ہمیشہ شبے اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور قومی تحریکوں اور قومی سرداروں کو اسی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے یہ ملکۂ وکٹوریہ کے زمانے میں دیکھے جاتے تھے ذاکر صاحب کی گفتگیرے مصالحت سن کر ذاکر صاحب کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے میں نہیں سمجھتا تھا کہ ذاکر صاحب کا دماغ اتنا سلجھا ہوا ہے اور ذہن اس درجہ رسا" [1]

ایک لطیفہ

یونیورسٹی کورٹ کے ایک جلسے میں بڑا پر لطف واقعہ ہوا ذاکر صاحب نے ایک مسئلے پر تقریر کی جو بڑے غور و احترام سے سنی گئی ۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی ایک صاحب جو اپنے کو بڑا یگانۂ روزگار سمجھتے تھے، تلملا کر اٹھے اور بولے "جناب والا میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے ابھی جو تقریر کی ہے وہ بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی ......" کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب نے اٹھ کر کہا "جناب والا میں نے اپنی تقریر میں کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میری تقریر معزز ممبر کی سمجھ میں آئے گی" اس پر بے اختیار قہقہہ پڑا اور اعتراض کرنے والے صاحب سٹ پٹا کر رہ گئے ۔ [2]

یونیورسٹی نازک دور میں

تقسیم ہند سے کچھ پہلے اور بعد کا زمانہ مسلم یونیورسٹی کے لیے انتہائی نازک دور تھا

---

[1] ذاکر صاحب - ۱۶ [2] ذاکر صاحب - ۲۶

اس دور کی مکمل تصویر پیش کرنا یہاں ممکن نہیں ۔ صرف سرسری اندازہ کرنے کے لیے رشید صاحب کے الفاظ پر اکتفا کیجیے کہ شاید ہی کوئی اور ایسا ہوگا جس کی انگلیاں ہمیشہ علی گڈھ کی نبضوں پر رہی ہوں اور جس کی ہر ہر سانس میں علی گڈھ ہر رُخ سے رچ بس گیا ہو ۔

"سب جانتے ہیں کہ زبردست دشواریوں کے باوجود قوم اور ملک میں جامعہ نے اپنی ساکھ قائم رکھی اور مسلم یونیورسٹی نے سہولتوں کے ہوتے ہوئے اپنی ساکھ کھوئی ۔۔۔۔ ہم پر جو نئی اور اہم ذمہ داریاں یونیورسٹی ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتی تھیں اُن کا حق ہم ادا نہ کر سکے" ۔

اور ۱۹۴۷ء قریب آتے آتے :

"واقعتاً حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور تقسیم ملک سے پہلے کے چند سال تو یونیورسٹی میں ایسے دیکھنے میں آئے کہ پہلے کبھی نہ دیکھے تھے نہ سُنے تھے" [1]

یہی وہ زمانہ تھا جب سیاسی لیڈر علی گڈھ کے طلبار کو اپنے ناپاک فرقہ وارانہ مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے ۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ ان طلبار نے ملک کے گوشے گوشے میں جا کر عداوت اور نفرت کے شعلوں کو ہوا دی بلکہ وطن کے باوقار قومی لیڈروں کی شان میں انتہائی بدتمیزیوں سے بھی باز نہ رہے ۔

---

[1] آشفتہ بیانی ۔ ۴۷

یہی وجہ تھی کہ ملک آزاد ہونے کے بعد یونیورسٹی کے لیئے بعض دماغوں لین انتہائی نفرت کے جذبات تھے اور بعض کی رائے تو یہ بھی تھی کہ اسے بند کر دیا جائے لیکن اس موقعے پر یونیورسٹی کو بچانے والی شخصیت وہ تھی جسے یہاں کے گستاخ طلبار نے ۱۹۴۵ء میں اپنی بدتمیزیوں کا نشانہ بنایا تھا اور سال دو سال بعد ہی قومی حکومت قائم ہونے پر جس کی بارگاہ میں بصد عجز و نیاز عفو و کرم کی بھیک مانگنے گئے تو اُس سراپا کرم سے یہ الفاظ سُنے تھے کہ

"میرے بھائی مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو ہدایت دے"۔

چنانچہ اسی ہستی یعنی مولانا ابوالکلام آزادؒ کی نگاہیں اب علی گڈھ کے لیئے ذاکر صاحب کی طرف اُٹھ رہی تھیں اور اس شب کو سحر کرنے والا اُن سے بہتر کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ حالات و حادثات کا یہ ستم اور انقلاب بھی خوب ہے کہ ذاکر صاحب اور مولانا دونوں علی گڈھ کے خلاف تھے لیکن وقت آیا تو انہی دونوں کو اس کی حفاظت اور حمایت کے فرائض ادا کرنے پڑے [۱]

علی گڈھ میں آمد

مولانا آزادؒ کی خواہش تھی کہ ذاکر صاحب علی گڈھ جائیں اُنہوں نے دوبارا اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن ذاکر صاحب نے معذوری ظاہر کر دی اس کے بعد پنڈت نہرو نے ان سے اس معاملے میں بات کی۔ ذاکر صاحب صرف اس وقت وہاں جانے کو

---

[۱] رشید احمد صدیقی: "ہم نفسان رفتہ" ۱۱۳

تیار تھے جب یونیورسٹی میں متفقہ طور پر ان کا انتخاب ہوتا کہ انہیں یونیورسٹی پر ایک بوجھ کی طرح لادا نہ جائے چنانچہ یہی شکل درپیش ہونے پر وہ علی گڈھ آنے کے لیئے تیار ہوئے۔ مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ مولانا آزادؒ نے جب اُن سے علی گڈھ جانے کو کہا تو "یہ عذر کرنے لگے۔ اپنی گوناگوں مصروفیتو اور جامعہ کی ذمہ داریوں کا ذکر کیا اس پر مرحوم نے نفسیاتی ہتھیار استعمال کیا کہنے لگے اچھا آپ نہیں جانا چاہتے تو ہمیں مجبوراً فلاں صاحب کو بھیجنا پڑیگا یہ صاحب مرفوع القلم ہو چکے ہیں۔ ایسے چیلنج پر ذاکر صاحب بھلا کیونکر طرح دے جاتے اُن کا نام سُننا تھا کہ انہوں نے فوراً پیش کش قبول کر لی"[۱]

یہ نومبر ۱۹۴۸ء یا اُس سے کچھ پہلے کی بات ہے۔

نواب اسماعیل نے استعفا دیا، ذاکر صاحب کا نام زبانوں پر آیا اور ان کے علی گڈھ آنے کا غلغلہ بلند ہوا تو ان کے مخالف گروہ میں سخت بے چینی کے آثار پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یہ طبقہ اس موقعے پر مظاہرہ بھی کرنا چاہتا تھا مگر یہ سب افواہوں ہی تک رہا۔

علی گڈھ آنے کا مقصد

جس نے زندگی کے پچیس ۲۵ سال "دنیا کے تمام دوسرے حوصلے یا ہوس سے منہ موڑ کر اور اس عمر میں موڑ کر جب حوصلہ یا ہوس دونوں کا خاصا غلبہ رہتا ہے ہر طرح کی مصیبت جھیل کر جامعہ کی خدمت میں اپنی بہترین صلاحیتیں

---

[۱] ماہنامہ 'صبح' اگست ۶۵ء

صرف کر دیں" [1] اس نے اب جامعہ کو چھوڑ کر علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ قبول کر لی اور اس لیے کی کہ :

"مجھے دکھائی دیتا ہے کہ ہندوستانی قومی زندگی کی تعمیر میں اس ادارے کا ایک بہت اہم مقام ہے۔ مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو میں جامعہ کے کام چھوڑ کر جس کے ساتھ میری ساری ذہنی اور روحانی نشوونما وابستہ ہے علی گڑھ نہ آتا۔ میں یہاں آنے اور یہاں ٹھہرنے پر صرف اس لیے اپنے آپ کو راضی کر سکا کہ مجھے صاف محسوس ہوا کہ یہاں اہم قومی کام کا ایک نادر موقعہ ہے وہ کام ہندوستانی تدبر اور ہندوستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام ...... علی گڑھ جس طرح آج کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا علی گڑھ ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں کی خدمت کے لیے جو پیش کش دے گا اُس سے متعین ہو گا ہندوستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام۔ ہندوستان علی گڑھ کے ساتھ جو سلوک کرے گا اُس پر، ہاں بڑی حد تک اُس پر، منحصر ہو گی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی" [2]

---

[1] آشفتہ بیانی - ۶۲ [2] 'علی گڑھ میگزین' علی گڑھ نمبر

یونیورسٹی میں اصلاح وترتیب

یونیورسٹی کے ہر کام میں اب ہر پہلو سے باقاعدگی نظر آنے لگی، عمارتوں کی صفائی، نالیوں اور سڑکوں کی درستی، آرائش اور چمن بندی، جگہ جگہ خوب صورت پارکوں کی داغ بیل کے علاوہ تعلیمی اور تحقیقی سرگرمیاں مختلف شعبوں میں ترقی اور اصلاح، سماجی اور تعلیمی محفلیں۔ غرض یہ کہ ہر طرف نئی زندگی کی لہر محسوس کی گئی [1]

ذاکر صاحب کے آنے کے بعد یونین کی عمارت میں یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ ہوئی، خزانچی نے بجٹ پیش کیا جو بے حد خسارے میں تھا۔ تجویز ہوا کہ اخراجات کم کیے جائیں، اسٹاف گھٹایا جائے وغیرہ وغیرہ جب سب اپنی کہہ چکے تو ذاکر صاحب نے جواب تک خاموش بیٹھے تھے، اُٹھ کر کہا کہ یونیورسٹی کا معیار گرا کر قومی کردار میں پستی اور مایوسی پیدا کرنے سے یہ بہتر ہے کہ ہم اپنا معیار نہ گرائیں اور ختم ہو جائیں۔ ختم اگر ہمیں ہونا ہی ہے تو عزت اور آبرو کے ساتھ تو ہوں۔ حکومت ہمیں اگر گرانٹ نہیں دے گی، یونیورسٹی بند ہو جائے گی تو ہو جائے مگر پستی میں گرنا اور سسک سسک کر فنا ہونا ہمیں گوارا نہیں۔ اُن کے الفاظ نے پست حوصلوں کو بلندی اور شکستہ ہمتوں کو

---

[1] یہ علی گڈھ کے متعدد حضرات کے بیانات کا نچوڑ ہے۔ اسکے علاوہ ملاحظہ ہو: 'نقوش' شخصیات نمبر۔ 'انڈین اینڈ فارن ریویو' ۱۵ر مئی ۱۹۶۸ء (مضمون غلام السیدین)۔ اور انیس چشتی کی انگریزی کتاب ''پریذیڈنٹ ذاکر حسین'' وغیرہ

ڈھارس دے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کل تک ہر جگہ حالات "بد سے بدتر" ہو چکے تھے وہاں اب :

"جب سے یونیورسٹی ذاکر صاحب کی قیادت میں آئی اس پر وہ نقش و نگار اُبھرنے لگے ہیں جو مدرستہ العلوم اور اس کے بانی کے نصب العین کی یاد تازہ کرتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً ایک تہائی صدی تک ایک گونہ بے ثمر رہ کر اس ادارے میں برگ و بار کے آثار تیزی سے پیدا ہونے لگے ہیں"۔ ؎[1]

علی گڈھ کی ذمہ داریاں

دسمبر ۴۸ء میں جب ذاکر صاحب نے وائس چانسلر شپ کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت یونیورسٹی کی مالی حالت تو کمزور تھی ہی، طلبار کی تعداد بھی بہت کم رہ گئی تھی اور اسٹاف کے بھی اکثر لوگ واگہ کے اُس پار جا چکے تھے۔ یونیورسٹی کے سدھار کا کام بڑی عرق ریزی اور محنت چاہتا تھا۔ اُنہیں پوری طرح مصروف ہو جانا پڑا جس کی وجہ سے صحت اور زیادہ خراب ہوگئی اور نومبر ۴۹ء میں ڈاکٹروں نے مکمل آرام کی سخت تاکید کر دی مگر آرام ایسی حالت میں پوری طرح ممکن ہی کہاں تھا۔

سائنس کا کام

سائنس کی اہمیت کے پیش نظر سب سے پہلے اسی طرف توجہ کی گئی۔ ملک کے مشہور سائنس داں پی ایس گل

؎[1] آشفتہ بیانی - ۶۶

کو علی گڈھ بلایا گیا اور فزکس ڈپارٹمنٹ میں ان کی زیر نگرانی نیوکلیر فزکس میں اور کاسمک ریز وغیرہ پر ریسیرچ کا کام شروع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالبصیر خاں کی نگرانی میں جو اسی سال (۱۹۴۸ء) کناڈا سے ڈگری لے کر آئے تھے زوولوجی ڈپارٹمنٹ میں کام شروع کیا گیا اور پیراسائی ٹولوجی کا نیا سیکشن کھولا گیا کیمسٹری میں نیا بائیوکمیکل سیکشن کھولا گیا۔ ریاضی میں اپیلائڈ میتھمیٹکس پر ریسیرچ شروع کی گئی۔ انجینرنگ کالج کی عمارت کے لئے نئی عمارت کا خاکہ تیار کیا گیا۔ حکومت نے اس کی لیبورٹری (تجربہ گاہ) کے جدید سامان کے پندرہ لاکھ روپیہ دیا اور ڈھائی لاکھ کی مستقل گرانٹ۔ [۱]

لائبریری

ذاکر صاحب کی نظر میں یونیورسٹی کے لیئے ایک معیاری اور شایان شان لائبریری سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی اس کے لیئے وہ ایک خوشنما عمارت کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے چنانچہ یونیورسٹی کا چارج لیتے ہی حکومت سے جو مطالبات کیئے گئے اُن میں یونیورسٹی لائبریری کی عمارت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔

ڈیوٹی سوسائٹی

ڈیوٹی سوسائٹی کی حالت بھی باقی یونیورسٹی سے مختلف نہ تھی یعنی امداد کے طالب زیادہ اور مالیات کا معاملہ صفر!۔ لہٰذا اس سلسلے میں عطیات سے کچھ نہ کچھ کام چلایا گیا اور یہ عطیات تھے ذاکر صاحب، نواب چھتاری، مولوی عبیدالرحمن وغیرہ

---

[۱] سالانہ رپورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۴۹ء

جانب سے ایک ایک ہزار روپیہ فی کس۔

معزز مہمان

اب یونیورسٹی میں ملک کے علمی، ادبی اور سیاسی میدانوں کے معروف سربراہوں کے دورے شروع ہو گئے تھے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو کمانڈر انچیف جنرل کریپا لے آکر طلبار کی ہمت افزائی کی اور فوجی ٹریننگ کی تمام سہولتیں مہیا کرنے کا یقین دلایا۔ اسی سال یونیورسٹی نے ملک کے ذی علم حضرات کو توسیعی (ایکسٹنشن) لکچروں کے لئے مدعو کرنے کی اسکیم بنائی جسکے تحت ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ کے۔ جی سیدین (مشیر تعلیمات بمبئی) - ڈی۔ پی۔ مکرجی (لکھنو) ڈاکٹر میکلا (کابل یونیورسٹی) وغیرہ نے بڑے فکر انگیز عالمانہ لکچر دیئے [۱] اور علمی ذوق اور تحقیقی لگن کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیداری کا پیغام ملا۔

میڈیکل کالج

میڈیکل کالج کے قیام کے لئے پچھلے دس پندرہ سال سے کوشش ہو رہی تھی مگر اس کے لئے اسباب مہیا نہ ہو پاتے تھے اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے شروع ہی سے مرکزی حکومت اور یو۔ جی۔ سی (یونیورسٹی گرانٹس کمیشن) سے پورے اعداد و شمار سامنے رکھ کر بات چیت شروع کر دی تھی اور اس کے علاوہ چندہ بھی کیا گیا۔ مرکزی حکومت اور یو۔ جی۔ سی سے ہر امداد مل سکتی تھی لیکن مشکل یہ تھی ایک کونہ صوبائی حکومت سے بھی دبا ہوا تھا۔ آخر کار

۱- ANNUAL REPORT—1949

۵۵ء میں آپ تھلمالوجی (آنکھوں کا علاج) کا شعبہ یونیورسٹی میں کھولا گیا جس میں ڈاکٹر موہن لال اور ڈاکٹر ایس این متر نے پورا پورا تعاون کیا بعد میں اس کے لیے ایک نئی عمارت نئے ساز و سامان سے آراستہ ہو کر تیار ہوئی اور پنڈت نہرو نے آکر اس کا افتتاح کیا۔ لندن کے مشہور ماہر ڈاکٹر کیتھ لائل وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلائے گئے اور نہ صرف لکچر دیئے بلکہ اپنے عملی تجربات بھی طلبا کے سامنے پیش کیے [1]

میڈیکل کالج پر خرچ کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا تھا۔ اصل دشواری ہسپتال کے قیام اور اس کے اخراجات کے لیے درپیش تھی جس کا مہیا کرنا یوپی گورنمنٹ کے ذمّے تھا۔ یونیورسٹی اس پر تیار تھی کہ اس نے پچھلے دنوں جو پچاس لاکھ روپیہ اس کام کے لیے جمع کر لیا تھا وہ یوپی گورنمنٹ کو دے دیا جائے لیکن یوپی گورنمنٹ کا رویہ کچھ مایوس کن رہا یہاں تک کہ مشہور نشنلسٹ روزنامہ "قومی آواز" نے لکھا تھا:

"یہ چیز ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ اتر پردیش کی حکومت نے کانپور میں تو میڈیکل کالج بن جانا منظور کیا جو لکھنؤ میڈیکل کالج سے صرف ۴۵ میل دور ہے اور علی گڑھ میں منظور نہ کیا جو لکھنؤ سے ۲½سو میل دور ہے" [2]

---

[1] سالانہ رپورٹ ۱۹۵۶ء [2] بحوالہ 'صدق جدید' ۱۵ جون ۵۶ء

'یادوں کی دنیا/ ۱۳۵ - ۱۳۰' اے۔ جی نورانی - ۷۶

ادارۂ علوم اسلامیہ

یونیورسٹی میں اسلامی علوم اور مڈل ایسٹ (مشرقِ وسطیٰ) کے تہذیبی، سماجی اور تمدنی حالات پر ریسرچ کا ادارہ ۱۹۵۴ء میں قائم کیا گیا، ڈاکٹر عبدالعلیم (موجودہ وائس چانسلر) ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ذاکر صاحب کے ساتھ انہوں نے مڈل ایسٹ کا دورہ بھی کیا، مختلف ممالک سے تین پروفیسر اس ادارے کے لیئے بلائے گئے اور نئی معلومات اور تجربوں کی بنیاد پر توسیع و تنظیم کی گئی۔ پروفیسر سید حسن تقی زادہ ایران سے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آئے تھے، اُنہیں ڈاکٹر آف لیٹرز کی ڈگری بھی دی گئی۔ بعد میں مسٹر سعید نفیسی بھی ایران سے پروفیسر کی حیثیت سے آئے۔ اس ادارے سے جو انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز، کہلایا ایک رسالہ "مجلۂ علومِ اسلامیہ" بھی نکالا گیا اور بہت جلد تصنیف و تالیف اور ریسرچ کا کام شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر علیم نے امام ابو حنیفہ کی کتاب "معرفۃ المذہب" کو ایڈیٹ کیا۔ ریاض الرحمٰن شروانی نے اخوان الصفا پر ریسرچ کی۔ اس کے علاوہ امریکہ و عرب تعلقات، مسئلہ فلسطین۔ اخوان المسلمین، مصر کی نئی حکومت، جدید عربی شاعری وغیرہ پر کتابیں اور تحقیقی مقالے شایع ہوئے۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں "ڈوکومنٹس آن ویسٹ ایشیا ۱۹۴۷ - ۵۰" ایڈیٹ کی گئی۔ پروفیسر ڈبلو ایف ورتھیم (یونیورسٹی آف ایمسٹرڈم)، مصری عالم ڈاکٹر عبداللہ العربی اور پروفیسر امین الخولی نے مختلف اسلامی پہلوؤں پر گراں بہا لکچر دیئے اور اپنی ریسرچ کا نچوڑ پیش کیا۔

لائبریری کی نئی عمارت

یونیورسٹی لائبریری کے لیے جو کوشش کی گئی وہ رفتہ رفتہ کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ پروفیسر سید بشیر الدین کی نگرانی میں نئی عمارت کا پلان بنا کر اس کی تعمیر پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں سنگ بنیاد (۱۲ نومبر ۱۹۵۵ء) سے شروع ہوئی اور مولانا آزادؒ لائبریری کے نام سے تکمیل کو پہنچی۔

۱۹۵۵ء میں پروفیسر بشیر الدین نے یورپ اور امریکہ کی مشہور لائبریریوں اور لائبریری سائنس کا طریقۂ تعلیم دیکھنے کے لئے دورہ کیا اور اس طرح لائبریری کے تعلقات دنیا کے مشہور کتب خانوں مثلاً لائبریری آف کانگریس اور برٹش میوزم کے علاوہ پرنسٹن، شکاگو، الینائس، برکلے وغیرہ کی اہم لائبریریوں سے قائم ہو گئے۔ مخطوطات کا سیکشن از سر نو ترتیب دیا گیا، اس کا کٹیلاگ (فہرست) تیار ہوا۔ انڈیا آفس لائبریری کے نادر قلمی نسخوں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں، مختلف شاہی فرمان، خطوط اور سکّے جمع کئے گئے۔

مختلف کتابیں اور ریسرچ کا کام

ان چند سالوں میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے متعدد کتابیں برابر شائع ہوتی رہیں جن میں کچھ کا تذکرہ ان صفحات میں کہیں کہیں آیا ہے، سب کتابوں اور تحقیقی مقالوں (تھیسس) کے تذکرے کی گنجائش ان صفحات میں کہاں ہے، صرف ۵۶-۱۹۵۵ء میں جو کتابیں زیر طبع تھیں ان میں مثال کے طور پر شعبۂ تاریخ میں پروفیسر نور الحسن عہد اکبری کے مختلف پہلوؤں پر ایک کتاب کی تیاری میں مصروف تھے۔ پروفیسر خلیق احمد

نظامی کی "حیات شیخ عبدالحق"، "خیر المجالس"، ۱۰، "تاریخ مشائخ چشت" کے بعد تازہ انگریزی تصنیف "لائف اینڈ ٹائمز آف بابا فرید" ڈاکٹر اے۔اے۔ رضوی کی عہد تغلق کے آخذ پر (ہندی) اور پروفیسر عبدالرشید کی ایڈیٹ کردہ فارسی دستاویزیں یوپی ریکارڈ سروے کمیٹی کے لیے اس دوران میں شایع ہوئیں۔ اس کے علاوہ شعبۂ تاریخ میں میڈیول انڈین ہسٹری (عہد وسطیٰ) پر ریسرچ کا ایک خاص پروجیکٹ یو۔جی سی کی گرانٹ سے شروع کیا گیا اور ایک رسالہ 'میڈیول انڈیا' یہاں سے جاری ہوا۔

پولٹیکل سائنس کے شعبے میں اسٹاف نے فتاوائے جہانداری مؤلفہ ضیاء الدین برنی (جو مسلم عہد کی سیاست پر اب تک سب سے بڑی کتاب مانی گئی ہے) کے ترجمے اور ترتیب کا کام کیا۔ اس کے علاوہ مڈل ایسٹ میں تیل کی سیاست اور مغل سلطنت کے سیاسی نظریات وغیرہ پر تحقیق ہوئی۔

شعبۂ فارسی کی تیسری تصنیف "معربات رشیدی" مرتبہ ڈاکٹر صدیقی، ڈاکٹر ہادی حسن کی دو کتابیں یعنی کالی داس کی شکنتلا کا فارسی ترجمہ اور مجموعۂ مقالات کو حکومت ہند و ایران اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے شائع کیا۔ نایاب فارسی قلمی کتب کی ترتیب اور فارسی کی کلاسیکل کتابوں کا ہندوستانی زبانوں میں ترجمے کا کام شروع کیا گیا جس کے لئے شاہ ایران نے پانچ ہزار روپے سالانہ کی رقم منظور فرمائی تھی۔

شعبۂ اردو کے اسٹاف ممبروں نے پانچ کتابیں شائع کیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر پر کام ہو رہا تھا۔ ۵۴ء میں ذاکر صاحب

کے ایک کلاس فیلو اور دوست مسٹر عطاء اللہ خاں درّانی[1] نے ساڑھے سات لاکھ روپیہ عنایت کیا جس سے سید حسین ریسرچ اسکیم کے تحت نول کشور پر ضروری مواد جمع کیا گیا۔ ہندی میں ترجمے کا پلان زیر غور تھا۔

ہندی و سنسکرت کے شعبے میں قلمی کتابوں کا ایک سیکشن ریسرچ کے لیے قائم کیا جا چکا تھا، اہم موضوعات پر سمپوزیم کیئے گئے جس میں باہر سے ملنے ہوئے عالم حصہ لینے کے لئے جمع ہوئے، اُردو کے معیاری شعراء کے کلام کا ہندی ترجمہ اور بھگتی کال پر ریسرچ وغیرہ کی اسکیمیں بنائی گئیں

شعبۂ اقتصادیات (اکنامکس) دیش کے نامور اور تجربہ کار ماہر ڈاکٹر ڈی۔ پی مکرجی کی خدمات حاصل کر چکا تھا مسٹر شبیر احمد خاں نے سرمایہ داری کے ارتقا پر ایک انگریزی کتاب ترتیب دی۔ یو۔ پی گورنمنٹ نے ایک پروجیکٹ پر ریسرچ کے لیئے دس ہزار روپیہ منظور کیا اور اس پر تیزی سے کام ہو رہا تھا

سائنس کے مختلف شعبوں میں ریسرچ کے لیئے یو۔ جی سی نے گرانقدر امداد دی۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک اور ٹکنالوجی میں ریسرچ کے لیئے نو لاکھ روپیہ منظور کیا۔ مختلف شعبوں میں جو ریسرچ ہو رہی تھی اس کا مکمل سروے

---

[1] مسٹر درّانی آج کل امریکہ میں ہیں اور یہ وہی ہیں جن کا ذکر "مضامین رشید" میں 'مرشد' کے زیر عنوان مقالے میں ملتا ہے کہ ایک بار علی گڑھ میں ذاکر صاحب خان موصوف کے کمرے میں پہنچے، بھوک لگی تھی لیکن کھانے کو کچھ اور نہ ملا تو خان کی معجون جالینوس کو مرتبان سے معدے میں منتقل کر دیا۔

کرنا ان محدود صفحات میں ممکن نہیں مثال کے طور پر بوٹنی کے شعبے میں گنے، آم اور چاول کی بیماریوں پر، جیالوجی میں رانی گنج کے کوئلے پر اور فزکس میں کاسمک ریز وغیرہ پر کام ہو رہا تھا [1]

جنرل ایجوکیشن کا نیا سینٹر کھولا گیا، بزنس ایڈمنسٹریشن اور اسٹینوٹائپنگ کے لئے ڈپلوما کورس شروع کیئے گئے [2] ہوسٹلوں میں کامن روم، ریڈنگ روم اور لائبریری وغیرہ از سر نو بنائے گئے

یونیورسٹی کو مالی امداد اس دوران میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مختلف اسکیموں کے لئے یونیورسٹی کو برابر مالی امداد دی۔ چنانچہ صرف ۵۶-۱۹۵۵ء میں جن نئی عمارتوں اور دیگر اصلاحوں کے لئے امداد منظور کی اُن میں سے چند یہ تھیں:

۱ - جیالوجی لیبوریٹری
۲ - پالی ٹیکنک
۳ - یونیورسٹی لائبریری
۴ - انجینیرنگ کالج ہوسٹل
۵ - ادارۂ علوم اسلامیہ
۶ - فزکس لیبوریٹری
۷ - علی گڈھ ہسٹری آف اردو لیٹریچر
۸ - این-آر-ایس-سی کلب

---

[1] سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء فزکس میں کاسمک ریز (Cosmic Rays) پر ریسرچ کے لیے کشمیر یونیورسٹی کے تعاون سے سری نگر میں ایک تجربہ گاہ بھی قائم کی گئی تھی (ملاحظہ ہو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن رپورٹ ۵۸-۱۹۵۷ء)

2. Education in universities in India 1957 — 1958

۹ - اسلامی فلاسفی پر ریسرچ ۱۰ - یونیورسٹی علاقے میں ضروری سہولتیں
اسکے علاوہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے یونیورسٹی کی مستقل امداد پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دی - مرکز نے یہ رقم تین لاکھ سے بڑھا کر ساڑھے بارہ لاکھ اور صوبائی حکومت نے ساٹھ ہزار سے بڑھا کر تین لاکھ کر دی - زنانہ کالج، انجنیرنگ کالج (عمارت اور سامان وغیرہ) کے لیئے جو مرکز کی طرف سے امداد دی گئی وہ اس کے علاوہ ہے - یہی وجہ ہے کہ جب ذاکر صاحب یہاں آئے اس وقت یونیورسٹی کا بجٹ تقریباً تیرہ لاکھ تھا اور جب انہوں نے علی گڈھ چھوڑا تو ۸۳ لاکھ کے لگ بھگ پہنچ چکا تھا - وہ پرائیویٹ عطیات اس کے علاوہ تھے جو اُن کے اثر سے وصول ہوئے - اندازاً یہ رقم بیس لاکھ کے قریب ہے - [۵۸]

ریسرچ اور تصنیف کی ہمت افزائی

اس زمانے میں بے شمار بلند پایہ کتابیں شائع ہوئیں اور تخلیقی کام مختلف شعبوں میں ہوئے اُن کی وجہ بقول رشید صاحب یہ تھی کہ "ذاکر صاحب نے کسی شعبے یا محکمے کی اصلاحی یا توسیعی اسکیم کو مسترد نہیں کیا خواہ وہ معمولی اخراجات پر مشتمل ہوتی خواہ کثیر پر - یہی نہیں بلکہ اُس اسکیم کو کامیاب بنانے کی کوشش اس شوق اور حوصلے سے کرتے جیسے اس اسکیم کے مصنف اور کارپرداز بھی خود تھے - ہم میں سے کسی کی کوئی کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو پاتی تو کہیں نہ کہیں سے روپیہ فراہم کر دیتے - یہ نہ کر پاتے تو

---

[۵۸] 'یونیورسٹی گزٹ'، ذاکر نمبر - مضمون رشید احمد صدیقی

اپنی جیب سے ادا کرتے اور کبھی کبھی اچھی خاصی بڑی رقم!"[1]۔ مثال کے طور پر "علی گڑھ ہسٹری آف اُردو لٹریچر" کا حال سنیے:

"ایک اسکیم کا خاکہ تیار کرکے ذاکر صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا...... ذاکر صاحب نے ہم سے بڑھ کر اسکیم کا خیر مقدم کیا اور فرمایا اہتمام شروع کر دیجیے۔ اخراجات کا انتظام ہو جائے گا چنانچہ حکومت نے اسکیم منظور کی اور سارے مراحل طے پا گئے"[2]

مختلف ذمّہ داریاں

یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کے زمانے میں ذاکر صاحب کی مصروفیت اور انہماک کا کچھ اندازہ اُن مختلف ذمہ داریوں سے کیا جا سکتا ہے جو اس دوران میں انہیں سونپی گئیں مثلاً۔ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے ممبر، ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے سنہ ۳۸ء سے سنہ ۵۰ء تک صدر، سنہ ۵۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ممبر (جون سنہ ۵۷ء تک)[3] سنہ ۵۰ء سے سنہ ۵۷ء تک ورلڈ یونیورسٹی سروس (جنیوا) کے چیرمین۔ سنہ ۱۹۵۲-۵۴ء میں

---

[1] و [2] 'یونیورسٹی گزٹ' ذاکر نمبر۔

[3] ۲۸ر دسمبر سنہ ۵۲ء کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن وجود میں آیا۔ افتتاح مولانا آزادؒ کے ہاتھوں ہوا۔ اس کا مقصد حکومت ہند اور اعلیٰ تعلیمی اداروں (خصوصاً سنٹرل یونیورسٹیوں) کی مالی امداد کے لئے یا کسی اور معاملے میں جو حکومت کمیشن کے سپرد کرے مشورہ دینا تھا (یو۔جی۔سی رپورٹ سنہ ۵۳-۵۸ء)

انڈین پریس کمیشن کے ممبر، ۵۶-۱۹۵۰ء میں یونیسکو اگزیکٹو بورڈ کے ممبر، سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے ۱۹۵۰ء تک چیرمین، راجیہ سبھا کے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک نامزد ممبر رہے[1] ۱۹۵۴ء میں اُنہیں حکومت ہند نے "پدم وبھوشن" کا خطاب دیا۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اُردو اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ کی صدارت بھی اُنہیں سونپی گئی۔

علی گڈھ کے بارے میں غلط فہمیاں

مسلم یونیورسٹی کے متعلق بگڑے ہوئے نقطۂ نظر کو ذاکر صاحب نے بڑی حد تک سنوارا۔ اُن کی شخصیت اور کردار نے نہ صرف حکومت بلکہ پریس اور عوام پر بھی اثر ڈالا۔ "ہم میں سے بہتوں کو وہ دن یاد ہوگا جب مہاشے ونوبا بھاوے کا اسٹریچی ہال میں خیر مقدم کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے خلاف جھوٹی خبریں بھیجنے اور پھیلانے والوں کو ڈانٹا تھا اور کس سچائی سے، کیسے وقار سے، کتنے کھرے الفاظ اور نڈر لب و لہجے میں یونیورسٹی کی پوزیشن واضح کی تھی ..... مختصر یہ کہ گذشتہ ۳۶-۳۵ سال میں اسٹریچی ہال میں ایسی میٹنگ کم سے کم میری نظر سے نہ گذری تھی۔ اس تقریر کے بعد پھر جب تک ذاکر صاحب نے یونیورسٹی سے اپنی علیحدگی کا اعلان نہیں کر دیا، اشرار و انفار کے زبان و قلم کے فتنوں سے ہم اور

---

[1] جولائی ۱۹۵۲ء میں راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا گیا اور ۱۱ اگست ۱۹۵۲ء کو حلف لیا۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں دوبارہ ممبر نامزد ہوئے۔

ہماری یونیورسٹی نہ صرف محفوظ رہی بلکہ ہر جگہ اور ہر موقعے پر یونیورسٹی اسٹاف اور طلبار کے بارے میں تحسین و تہنیت ہی کے کلمے سُنے گئے،،[۱]

سید محمد ٹونکی صاحب علی گڑھ کی ایک معزز اور معروف شخصیت ہیں۔ انہوں نے یہاں کی مجلسی، سماجی اور تمدنی زندگی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ مجھ سے آپ نے فرمایا کہ ذاکر صاحب نے نہ صرف غلط انداز نظر کو درست کیا بلکہ یونیورسٹی میں حقیقی علمی ماحول کی طرح ڈالی، غیر فرقہ وارانہ لائنوں پر روا داری کی فضا تخلیق کی، یونیورسٹی کی خود مختاری کے لیے جی جان سے کوشش کی اور اس طرح یونیورسٹی کی اندرونی و بیرونی اصلاح کی بنیاد رکھی۔ ٹونکی صاحب ہی نے یہ واقعہ مجھے سنایا کہ "ایک مرتبہ باہر کے ایک صاحب (غیر مسلم) ذاکر صاحب سے ملنا چاہتے تھے میں اُنہیں ساتھ لے گیا اور ان سے ملایا۔ درمیان گفتگو میں اُن صاحب نے ایک بے وقوفی کا سوال پوچھا یعنی یہ کہ یہاں ہندو طلبار اور اسٹاف کی تعداد کیا ہے؟۔ ذاکر صاحب کو یہ سوال ناگوار ہوا، اُنہوں نے پہلے تو اسی انداز کا جواب اُنہیں دیا اور پھر کہا کہ "یہ ایک فضول سا سوال ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں آزاد اور غیر فرقہ وارانہ ماحول پیدا ہو۔ ایک طالب علم، خواہ وہ کوئی بھی ہو یہ محسوس کرلے کہ اس کو یہاں تعلیمی سہولتیں پوری طرح میسر ہیں اور وہ آزادی کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ میں یہ ماحول پیدا کرنے کی یہاں کوشش

---

[۱] "مسلم یونیورسٹی گزٹ"، ذاکر نمبر (مضمون رشید احمد صدیقی)

کررہا ہوں دوسرے کوئی صاحب بنارس میں یہی کام کریں"۔

علی گڈھ کی فضاؤں میں

ذاکر صاحب کی کوششوں اور اُن کی شخصیت کے اثرات سے علی گڈھ کی فضا میں رفتہ رفتہ جو خوشگوار تبدیلی آرہی تھی، یونین کا ایک الکشن اس کی چھوٹی سی مثال ہے، زمانہ ۱۹۵۱ء کا تھا، یونین کی نائب صدارت کے لئے دو امیدوار تھے جن میں سے ایک صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ فرقہ وارانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہوا کہ کشمیر کے معاملے میں بھی وہ پاکستانی نظریات کے حامی ہیں۔ اُن کے مقابلے میں دوسرے صاحب جن کو یونیورسٹی کے آزاد خیال طبقے کی حمایت حاصل تھی سید عنایت حسین آفتاب تھے۔ حسب دستور مخالفوں کی طرف سے اُن پر کمیونسٹ ہونے کے الزامات لگے جو سراسر غلط تھے۔ ۲۹ اکتوبر کو الکشن ہوا جس میں عنایت آفتاب غالب اکثریت سے کامیاب ہوئے اور اگلے دن شام کو روایات کے مطابق ہارنے والوں کا جنازہ پیٹا گیا۔ یہ منظر مجھے اب تک یاد ہے کہ مخالفوں کے جنازے پر عنایت آفتاب کے ساتھی یہ کہہ کر اپنا سر پیٹتے تھے کہ "لوگو تم ہنس رہے ہو۔ ارے رونے کا وقت ہے۔ علی گڈھ سے غنڈہ گردی اور فرقہ پرستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ ارے یہ مغرب سے جو لعنت آئی تھی اس کا آج مغرب کے وقت خاتمہ ہو گیا ہُو ہُو ہُو ...... اب فرقہ پرستی نہیں چلے گی ...." (تالیاں) اس موقعے پر عنایت آفتاب نے اپنی تقریر میں کہا کہ "اُن کی جیت ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارے کی جیت ہے"۔ [1]

---

[1] ذاتی ڈائری سے

نئی کیبنٹ کے سامنے

۱۵ نومبر ۱۹۵۱ء کو اس نئی کابینہ نے چارج لیا۔ پرانی کابینہ نے نئے ممبروں کو جگہ دی، انعامات تقسیم ہوئے اور آخر میں ذاکر صاحب کی تقریر:

"عزیزو — پچھلے چار ہفتے میں جتنی تقریریں کرنے کی مجھے اجازت تھی اس سے کہیں زیادہ کر چکا ہوں۔ یہ موقعے تقریریں کرنے کے آتے ہی رہتے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ کچھ الفاظ کا ذخیرہ بچا لوں تاکہ آئندہ کام آسکے لیکن کچھ نہ کہنا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا ..... سب سے پہلے تو میں نئے عہدیداروں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ لیکن میں ان کو یہ بتا دوں کہ یہ بڑا مشکل کام ہے کہ کسی پر اُس کے ساتھی اعتماد کریں۔ اس سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ بڑی اچھی بات ہے کہ یہ اعتماد قائم رہے۔ اعتماد ہو کر پھر بے اعتمادی پیدا ہونا بہت برا ہوتا ہے"۔

یونیورسٹی کو بدنام کرنے والے اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"مجھے اپنی قوم کی جہالت پر افسوس ہے کہ میری قوم کا پریس اس قدر جاہل اور نادان ہے کہ وہ ایک ایسے تعلیمی ادارے کو بدنام کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا جس سے ملک و قوم کو بہت کام لینا ہے ..... حالات رفتہ رفتہ ٹھیک ہوں گے۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ ہم ایسے بن جائیں کہ کوئی ہمیں بدنام کر ہی نہ سکے پھر بدنام کرنے والے خود ہی بدنام ہوں گے اور ہمارا سر اونچا ہوگا ..... "[1]

---

[1] ذاتی ڈائری سے۔

علی گڈھ کا قومی کام

علی گڈھ میں جو اہم قومی کام اب انجام دیا جانا تھا اس کی اہمیت کو انہوں نے اپنی اکثر تقریروں میں واضح کیا اور اعلان کیا کہ وہ اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر چکے ہیں ۔ چنانچہ ۱۷؍ اگست ۱۹۵۲ء کو وی ایم ہال کے ایک ڈنر میں جہاں ان کی خدمت میں ایک منظوم سپاس نامہ :

"مہاں ہمارا ذاکرِ عالی گہر ہے آج"

پیش کیا گیا ، تقریر کرتے ہوئے کہا :

"میری پوری زندگی علی گڈھ سے وابستہ رہی ہے ۔ یہیں پڑھا لکھا اور انسان بنا اور اب یہیں کی خدمت کر رہا ہوں ۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں یہاں سے نکالا بھی گیا تھا ...... اس کے بعد ہم لوگوں نے جامعہ کے کام کو سنبھالا ، میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی علی گڈھ ہی کا کام تھا میں نے کبھی علی گڈھ اور جامعہ کو علیحدہ نہیں سمجھا وہ علی گڈھ کی اصلاح کی تحریک تھی ...... اب یہاں بھی اسی مقصد سے اور اس کو ایک اہم قومی خدمت سمجھ کر کر رہا ہوں ۔ علی گڈھ میں قومی کردار پیدا کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جو لوگ اس کام کو انجام دیں گے ان کا نام محسنوں کی فہرست میں لکھا جائے گا میں چاہتا ہوں کہ اس فہرست میں میرا بھی نام ہو" ۔

علی گڈھ میں گھریلو زندگی اور برتاؤ

روزمرہ زندگی اور رہن سہن کی سادگی

کا وہی عالم علی گڑھ میں بھی رہا جو اس سے پہلے رہا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی تنخواہ میں سے پانچ سو روپیہ چھوڑ دیتے اور جو کچھ لیتے اس میں بھی بڑا حصہ غریب طلبار کی امداد میں چلا جاتا اور گھریلو اخراجات کے لئے بہت کم رقم بیگم صاحبہ کو دے پاتے ۔ خود اُن کی جیب مہینے کے دوسرے ہفتے تک یقیناً خالی ہو جاتی۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں کہ "نجی زندگی میں بے اندازہ خرچ کرنے سے نہ صرف عسرت کے زمانے میں سخت دقتیں اٹھانا پڑیں بلکہ اب ایک گونہ فراغت کے زمانے میں بھی اٹھانا پڑتی ہیں اس لیے کہ جس نسبت سے آمدنی بڑھی اُسی نسبت سے جا و بے جا خرچ خصوصاً داد و دہش بھی بڑھتی چلی گئی "۔ [1]

علی گڑھ میں غریب اور نادار طلبار کی کمی نہ تھی ۔اُن میں نہ جانے کتنوں کو تعلیم کے لیے امداد خاموشی سے ملتی رہی ۔ صرف ایک واقعہ بطور مثال سن لیجئے جو مجھے ٹونکی صاحب نے سنایا کہ ایک غریب لڑکا بی ایس سی کا طالب علم ٹیوشن کر کے اپنا گذارہ کرتا تھا لیکن امتحان میں فرسٹ آیا ۔ اب سوال یہ تھا کہ ایم ایس سی میں تعلیم کے ساتھ ٹیوشن کرنا دشوار تھا، نہ کرے تو اخراجات کیسے پورے کرے۔ ٹونکی صاحب جو ایسے لڑکوں کی امداد و پشت پناہی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں ، اُسے ذاکر صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ بہت خوش ہوئے ، کہا کہ اچھا ہوا آپ یہاں لے آئے ۔اُس لڑکے سے اُنہوں نے

---

[1] نقوش ، شخصیات نمبر۔

کہا کہ تم اطمینان سے اپنی پڑھائی جاری رکھو تمہیں ہوسٹل کے اخراجات دینے نہیں پڑیں گے اور جیب خرچ بھی تمہارے پاس پہنچ جایا کرے گا۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے "معلوم نہیں کتنے نادار طلبار اور کبھی کبھی ان کے والدین یا سرپرستوں کی طرح طرح کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے اپنے پاس سے رُوپے دیا کرتے ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے اکثر عرض کیا گیا کہ جیب خاص سے دی ہوئی رقوں کی واپسی کے لیے حسب دستور انجمن کوئی دستاویز لکھائی جایا کرے تاکہ وصول شدہ رقم دوسرے مستحق طلبار کو دی جا سکے۔ لیکن اُنہوں نے اس تجویز کو منظور نہ کیا۔" [۲]

طلبار سے برتاؤ

یونیورسٹی کے طلبار سے اُن کے حُسن سلوک نے اکثر بار پیچیدہ مسئلوں اور اُلجھنوں کا حل نکالا۔ طلبار میں ان کی ہردل عزیزی کی مثال ایک ایجی ٹیشن کے موقعے پر سامنے آئی جو کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں فیس میں اضافے کے خلاف ہو رہا تھا اور اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ ایجی ٹیشن کوئی خطرناک صورت اختیار کرے گا لیکن ۱۸ اگست کو لڑکوں کے پیش کردہ میمورنڈم کا جواب دینے کے لیے یونین ہال میں جلسہ اور اُن کی تقریر ہوئی۔ پہلے یونین کے صدر نے ایک مفصل تقریر کی جس میں تمام ضروری اور غیر ضروری مسائل کا تذکرہ کیا۔ بعد میں ذاکر صاحب نے

---

[۱] یہ سوسائٹی ضرورت مند طلبار کی مالی امداد کرتی ہے۔

[۲] 'یونیورسٹی گزٹ' ذاکر نمبر (مضمون رشید احمد صدیقی)

تقریر کی :

" میں صدر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے ایک مفصل تقریر سے میرا استقبال کیا ..... میمورنڈم میں بعض اُمور واقعی ایسے تھے کہ اگر اُن پر طلبار اظہار خیال نہ فرماتے تو اچھا تھا۔ جیسا کہ صدر صاحب نے فرمایا کہ یہاں کی ہر چیز سے طلبار کی وابستگی ہے تو یوں تو کائنات کی ہر شے ایک دوسرے سے وابستہ ہے تو کیا یہ اچھا ہوگا کہ آپ اس میں ہندوستان بھر کے مسائل بلکہ دنیا بھر اور کل کائنات کے مسائل کا تذکرہ کرتے ..... حکومت نے ہمارے ساتھ بے حد فیاضانہ سلوک کیا ہے لیکن اس کے ساتھ انھوں نے کچھ تجویزیں ہمارے اخراجات کو کم کرنے اور آمدنی بڑھانے کے لئے پیش کی ہیں اس میں فیس بڑھانے کا مسئلہ بھی تھا یہ سب کچھ مجھ سے پیچھے نہیں، میرے سامنے میری موجودگی میں اور میری رائے سے ہوا ہے اب میں آپ کے مطالبے پر غور کرنے کو تیار ہوں۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ناگوار باتوں کو برداشت کرنے کی عادت ڈالیں۔ زندگی ناگواریوں کا مرکب ہے ..... اگر ایگزیکیٹو کونسل میں یہ مسئلہ ۲۴ر اگست کو پیش ہونے والا ہے میں اس میں آپ کی وکالت کروں گا اور جو کچھ آپ کے مطالبات ہیں وہ سب سامنے رکھ دوں گا۔ زبان تو آپ کی جیسی نہیں ہوگی مگر باتیں سب کہہ دوں گا لیکن آپ سے یہ کہوں گا۔ کہ اگر یہ مطالبات منظور نہ کیے جائیں تو پھر آپ برداشت کریں اور

نظم وضبط کا ثبوت دیں۔ ... سوچیے کہ دوسری یونیورسٹیوں میں کیا ہوتا ہے ...... غل شور مچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حق بات سنجیدگی سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ غل وہ لوگ مچاتے ہیں جو اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اس کے مخالف پہلو سننے والوں کے سامنے نہ آجائیں"...

اسی زمانے کی ایک اور تقریر، فیس پر ایجی ٹیشن کے سلسلے میں:

"ہمارے پاس جو کچھ سرمایہ محفوظ تھا وہ پچھلے تین سالوں میں ختم ہو گیا۔ اس کے پیش نظر ہم نے حکومت سے گرانٹ بڑھانے کا مطالبہ کیا تھا۔ حکومت نے بہت ہمدردی سے سنا اور ایک کمیٹی اخراجات کی تحقیق کے لیے مقرر کی۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں جہاں مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے گرانٹ بڑھانے کو کہا وہیں یہ بھی کہا کہ یونیورسٹی اخراجات گھٹائے اور فیس میں قدرے اضافہ کرے ... کوئی مطالبہ اس طرح شور وغل مچانے سے حاصل نہیں ہوتا جو قومیں شور مچاتی ہیں وہ اپنی پوزیشن اور مطالبے کو کمزور کرتی ہیں اور جو لوگ شور وغل سن کر مطالبات مانیں وہ اعتماد کے قابل نہیں"۔

ان دو تقریروں نے سارا ہنگامہ دم بھر میں ختم کر دیا اور معاملہ خوشگواری کے ساتھ طے ہو گیا [1]

جب کبھی موقعہ ملتا اور لڑکوں سے خطاب کرتے ــــ سالانہ ڈنر پر،

---

[1] ذاتی ڈائری سے

۱۵ راگست یا ۲۶ رجنوری پر یا اور موقعوں پر ـــــ تو ہمیشہ اپنی روزمرہ زندگی کو با اصول اور باسلیقہ بنانے کے لئے مثالیں دے کر زور دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ طلبار کی اکثر بری عادتوں اور بعض ناروا قدیم روایات کا یا تو خاتمہ ہوا اور یا وہ تہذیب کے دائرے میں آگئیں۔

مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسئلے

۱۲ رمارچ ۵۲ئہ کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پچپنویں ۵۵ سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں ذاکر صاحب نے جہاں مسلمانانِ ہند اور قومی تعلیم کے مسئلوں کو چھیڑا وہاں مسلم یونیورسٹی سے متعلق بھی اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار کیا:

"اس کے بنانے میں ہندی مسلمانوں کی بہت کچھ محبت، محنت، دولت اُن کا بہت جوش اور خلوص کام آیا ہے اگر یہ قومی زندگی میں وہ مرتبہ حاصل کرے جس کا یں"!، میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان آرزومند ہے تو ملک میں مسلمانوں کے لیے باشرف و باعزت شہریت کی ضمانت ہو جائے"

اسی زمانے میں یونیورسٹی کورٹ کے قانون میں دو اہم تبدیلیاں کی گئی تھیں ایک تو یہ کہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی ہو سکیں گے اور دوسرے یہ کہ دینیات کی تعلیم لازمی نہ ہوگی۔ یہ تبدیلیاں بنارس اور علی گڑھ دونوں جگہ کی گئیں اور یو۔جی سی کی سفارش پر عمل میں آئیں۔ کچھ لوگ ان کے غلط معنی نکال رہے تھے لیکن اس سے یونیورسٹی کی ماہیت بدلنا مقصد نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ "یہ ادارے اپنی خصوصیت قایم رکھ سکیں گے لیکن ان کے کام میں

دوسرے ملک کا مشورہ ممنوع نہ ہو" اسی طرح دوسری تبدیلی بھی ضروری تھی کیونکہ جن اداروں کو حکومت سے مدد ملتی ہے وہ دستور کے مطابق اپنے طلبار کو کسی مذہبی تعلیم کے لئے مجبور نہیں کر سکتے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ :

"اس تبدیلی سے ہمارے یہاں دینی تعلیم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا امید ہے کہ فائدہ ہوگا۔ اس سے دینی تعلیم کا معیار اونچا ہوگا۔ طریقۂ تعلیم بہتر ہوگا۔ اس کی تاثیر بڑھے گی۔ لازم کر دینے کے بعد تعلیم کو دل کش اور دل نشین، موثر اور کارگر بنانے کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہٹی رہی ہے۔ اختیاری ہونے کی صورت میں اس کی نہج کو درست کرنے اور جاذب توجہ بنانے کا خاص اہتمام کرنا ہوگا اور انشاء اللہ کیا جائے گا...... میرا ارادہ ہے کہ بہترین مفکروں اور معلموں کی مدد سے یہ نصاب مرتب کراؤں اور اس کے طریقۂ تعلیم میں بھی ضروری تبدیلیاں کروں۔ اگر ایسا ہو سکا، اور اس میں آپ سب کی مدد شامل رہی تو انشاء اللہ ضرور ہو سکے گا، تو اختیاری ہونا دینی تعلیم کے لیے مبارک ثابت ہوگا۔ مذہب لڑنے لڑانے کا ہتھکنڈا نہ ہوگا بلکہ زندگی کو معنی و مقصد بخشے گا، اس کے لئے ایک اخلاقی اور روحانی اساس مہیا کرے گا، اقدار عالیہ سے تعلق و شیفتگی پیدا کرے گا، اپنی تنویری قوت سے زندگی کو روشنی اور اپنی تخلیقی طاقت سے اسے مالا مال کر سکے گا"۔

یہاں اُنہوں نے علی گڑھ کے قومی کام کو پھر واضح کیا جو اُسے قومی زندگی میں انجام دینا ہے۔ یہ عظیم قومی کام ان کے نزدیک یہ ہے کہ "سب کو ایک مشترک ماضی سے مالا مال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جد وجہد کا ولولہ بخشنا، ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ اُن کا دین اور ہندوستانی زندگی کو صالح بنانے میں اُن کا مخصوص منصب، یہ اُن پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور خدمت کا ایک نادر موقعہ پیش کرتے ہیں"۔

انجمن ترقی اُردو سے تعلق

دہلی کے فسادات میں انجمن ترقی اردو کا دفتر اور کتب خانہ لُٹا، مولوی عبدالحق صاحب کراچی چلے گئے اور جنوری ۴۸ء میں پھر ہندوستان آئے، اُنہیں اپنے کتب خانے کی فکر تھی۔ مرحوم رفیع احمد قدوائی کے مشورے پر وہ ذاکر صاحب سے ملے جو اُس وقت دہلی کالج کی کمیٹی کے صدر تھے۔ ذاکر صاحب نے کتب خانے کو دہلی کالج میں جگہ دے دی اور اکتوبر ۴۸ء میں کتب خانہ یہاں آ گیا لیکن جلد ہی پھر دریا گنج میں منتقل کر دیا گیا۔ انجمن کے بارے میں بڑی اُلجھن پیش آ رہی تھی، مولوی عبدالحق دونوں جگہ کام کرنا چاہتے تھے اور مولانا آزاد کا خیال تھا کہ دونوں جگہ الگ الگ انجمن بنائی جائے، ایک نہو۔ یہی رائے ذاکر صاحب کی تھی، اُنہوں نے مولوی عبدالحق سے کہا ——
"ظاہر ہے کہ آپ اپنا اصول نہیں بدلیں گے اس لیئے یہاں کام کرنا آپ کے لیئے مناسب نہ ہوگا" مولوی عبدالحق نے اکتوبر ۴۸ء میں جلسے بھی کیے مگر ذاکر صاحب مصروفیت کے باعث شرکت نہ کر سکے اور ایک خط میں اپنی

مجبوری کا اظہار کرنے کے بعد لکھا:

" میری رائے ہے کہ اُردو کی ترقی و ترویج کا کام ہندوستان میں اب پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے اسلیئے اس کا کوئی نہ کوئی انتظام ہونا چاہیئے لیکن ساتھ ہی میری یہ رائے بھی ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے کام کی جو نوعیت گذشتہ چند سال میں رہی ہے اس کے پیش نظر موجودہ کارکنوں کا یہاں کام کرنا بہت دشوار ہوگا ...... پاکستان و ہندوستان کے سیاسی تعلقات کی موجودہ حالت میں یہ غیر مناسب ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان کے اس کام میں کوئی انتظامی یا شخصی تعلق رہے " [۱]

تقسیم وطن کی زہریلی فضا صاف ہوئی، تو مولانا آزادؔ نے یہاں انجمن کی پھر سے تنظیم کی، قاضی عبدالغفار کو یہ کام سونپا، سر تیج بہادر سپرو کے بعد ذاکر صاحب انجمن کے صدر بنائے گئے۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں جب انجمن نے اُردو کی حمایت میں دستخط فراہم کرنے کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو لکھنؤ میں ذاکر صاحب کی صدارت میں انجمن کے ورکرز کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں ذاکر صاحب نے انجمن کے طریقۂ کار اور مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اُردو کی تحریک کے بارے میں اُنہوں نے کہا:

" دوستو! اس کی تہہ میں تو ہماری جمہوری زندگی کا بنیادی سوال

---

[۱] ہاشمی: پنجاہ سالہ تاریخ انجمن، باب ۲ - یادداشت مولوی عبدالحق

پنہاں ہے کہ کیا اس دیس میں جس کی لاٹھی ہو گی بھینس اُسی کی ہانی جائے گی ؟ کیا ایک زبان دوسری زبان کو یا زبانوں کو، ایک اسلوبِ زندگی دوسرے اسلوب کو، ایک طرزِ فکر دوسرے طرزِ فکر کو اپنے زور سے دیس نکالا دے سکے گا ؟ یا سب کے میل جول، باہمی رواداری اور تعاون سے اُس کی زندگی ترقی کرے گی ؟ کیا یہاں زندگی کے مسئلے زور و جبر، ڈراوے اور دھمکاوے سے حل کیے جائیں گے یا محبت اور سمجھنے سمجھانے سے ؟

اردو تحریک پر اعتراضات کا بھی انہوں نے جواب دیا:

"کہنے والوں نے کہا کہ اُردو کو اس کا جائز حق دلانے کی تحریک ہندستانی قومیت میں تفرقہ ڈالنے کی تحریک ہے۔ اس کا کیا جواب دوں ؟ کون نہیں جانتا کہ اس تحریک کے حامیوں نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اُردو کو قومی سرکاری زبان مان لو۔ اگرچہ تقسیم ہند سے پہلے کے سیاسی بحران سے ملک بچا رہتا تو یہ مطالبہ بھی چنداں بے جا نہ ہوتا ..... پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُردو تو کوئی الگ زبان نہیں وہ تو ہندی کا ایک خاص اسلوب ہے۔ یا مظہر العجائب! اس زبان کی حمایت مسلم لیگی ذہنیت کا مظاہرہ بھی ہے، اُس کے حامیوں کو ہجرت کا مشورہ بھی ہے، وہ بدیشی زبان بھی ہے، ایک غیر ملکی تسلط کی ناقابل برداشت یادگار بھی ہے اور وہ کوئی الگ زبان بھی نہیں ہے۔ یہ خوب ہے صاحبو! اس سے ٹھنڈا اور اس سے گرم دونوں قسم کے الزامات تو درست نہیں

ہو سکتے .... دلیل میں اسی قسم کا باریک نکتہ وہ لوگ بھی نکالتے
ہیں جو فرماتے ہیں کہ اُردو کو علاقائی زبان بنانے کے کیا معنی، اس کا
علاقہ کہاں ہے؟۔ اس نکتے کے سلسلے میں ایک لطیفہ بیان کر دوں
تو معاف فرمائیں۔ ابھی دو روز ہوئے اسی مسئلے پر ایک دوست سے
گفتگو ہو رہی تھی اُن کے ہاتھ میں اقبال کے بال جبریل کا نسخہ تھا۔
اُنھوں نے اُسے جھٹ کھولا اور بتایا کہ بہ نیت فال کھولا ہے تو اس
قطعے کا دوسرا شعر سامنے آیا:

وہی اصل مکان و لامکاں ہے	مکاں کیا شے ہے، اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے	اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

اور آخر میں اُنھوں نے ہندی کے ادیبوں سے اپیل کی کہ:

"آپ کو لوگوں کو تالیوں اور جے کاروں کی ضرورت نہیں ہے، آپکو
ووٹ بھی شاید ہی کبھی درکار ہوں، سچی بات پر آپ اڑ سکتے ہیں۔
آپ اڑیں گے تو آپ کو کوئی مسلم لیگی بھی نہ کہہ سکے گا۔ اردو کو اس کا حق
دلا دیئے، پھر آپ دیکھیں گے کہ بھروسے اور محبت کے ایسے سوتے ہمارے
دیس میں پھوٹتے ہیں جن سے ساری قومی زندگی سیراب ہوگی اور ایک
طرح سے زندگی کی رُت ہی بدل جائے گی" [1]

اس کانفرنس کے بعد دستخطوں کی مہم شروع ہوئی اور ۱۵ فروری ۵۴ء

---

[1] ہماری زبان، علی گڑھ ا یکم اگست ۵۳ء

کو یو پی کے بائیس لاکھ بالغوں کے دستخطوں سے صدر جمہوریہ ہند (ڈاکٹر راجندر پرشاد) سے اردو کی وہ تاریخی فریاد کی گئی جس کا ذکر صرف تاریخ ہی کے صفحات کی زینت بن سکے گا۔ یہ وفد جو صدر جمہوریہ کی خدمت میں اردو کے چند مطالبات لے کر حاضر ہوا، ذاکر صاحب کی سربراہی میں تھا اور اس میں قاضی عبدالغفار، پنڈت سندر لال، مولانا حفظ الرحمٰن، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، پنڈت کیفی، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر تارا چند، شریمتی اوما نہرو وغیرہ صاحبان شامل تھے۔[1]

ذاکر صاحب انجمن کے ۱۹۵۶ء تک صدر رہے انجمن کا دفتر انہی کے ایما سے علی گڑھ آیا، نئی تنظیم ہوئی اور مالی حیثیت مضبوط ہو گئی۔ علی گڑھ چھوڑنے کے ساتھ ہی انہوں نے انجمن کی صدارت سے بھی استعفیٰ دیدیا۔

یونیورسٹی میں معزز مہمان

ذاکر صاحب کے علی گڑھ آنے کے بعد سے برابر یونیورسٹی میں مختلف مہمانوں اور غیر ملکی سربراہوں کی آمد و رفت ہوتی رہی لیکن اس لحاظ سے ۱۹۵۵-۵۶ء غالباً سب سے اہم تھا کیونکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ غیر ملکی مہمانوں میں بھی معزز اور اہم شخصیتیں تشریف فرما ہوئیں۔ ۱۹ اگست ۱۹۵۵ء کو صدر کانگریس مسٹر یو-این ڈھیبر علی گڑھ آئے۔ طلبا کے درمیان تقریر کرتے ہوئے انہوں نے

---

[1] اس سے پہلے ذاکر صاحب نے ۱۹۵۱ء میں صرف لکھنؤ شہر کے دس ہزار والدین کی درخواستیں یو پی کے وزیر تعلیم کو پیش کی تھیں کہ ان کے بچوں کو اردو میں تعلیم دی جائے۔

کہا :

"علی گڑھ آنے سے پہلے مجھے یہاں کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں تھیں، یہاں آکر وہ سب ختم ہو گئیں ..... اس بڑے ادارے میں ہمیں جمہوریت کو طاقت ور بنانے کے پورے موقعے ملے ہیں۔ اس یونیورسٹی نے ہمیشہ غیر معمولی صلاحیتوں کے پیکر پیدا کر کے ہندوستان پر اپنا وقار اور بھرم قائم رکھا ہے"۔

اس موقعے پر یونین کے صدر نے اپنی تقریر میں کہا :

"آج شاید ماتر بھومی ہمارے خون کی قربانی چاہتی ہے .... ہم عہد رفتہ کی قسم کھا کر آج یہ اٹل ارادہ کرتے ہیں کہ جب تک گوا کو مکمل طور پر آزاد نہیں کرا لیں گے سکھ کی نیند نہیں سوئیں گے"۔

اور یہ عہد فقط زبانی جمع خرچ نہیں تھا بلکہ طلبا نے اپنے خون سے دستخط پیش کر کے یہ عہد کیا۔ [1]

مصر کے ڈپٹی پرائم منسٹر کمانڈر جمال سلیم ۱۳ ستمبر کو یونیورسٹی آئے ـــــ

---

[1] "علی گڑھ میگزین" : مجاز نمبر۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں اس دور میں نظر آتی ہیں مثلاً طلبا نے گوا کی جنگ آزادی میں شہید ہونے والوں کے بچوں کے لئے ایک وقت کا فاقہ کر کے ایک معقول رقم جمع کی۔ یو۔پی اور بہار کے سیلاب زدہ بے گھر بے در انسانوں کے لیے اپنے کپڑے بھیجے اور اپنے جیب خرچ میں سے بچا بچا کر "نہرو فنڈ" کے لئے رقم پیش کی وغیرہ وغیرہ (مجاز نمبر۔ ۱۸۳)

۲۹ر اکتوبر کو انڈونیشیا کے نائب صدر ڈاکٹر محمد حتیٰ مع اپنے ساتھیوں کے آئے اور اسی شام کو یونین میں تقریر کی۔ ۸ر نومبر کو لنکا کے سفیر سر رتنا ایڈون علی گڈھ کی محبت کا جذبہ اپنے ساتھ لے گئے اور ۱۲ر نومبر ۵۵ء کو وزیر اعظم نہرو نے آکر یونیورسٹی لائبریری اور آفیتی ہوسٹل کی بنیاد رکھی۔ پنڈت نہرو کا زبردست سواگت ہوا۔ وہ علی گڈھ کی فضاؤں میں بڑے متاثر اور خوش ہوئے اور اپنی تقریر میں اس کا اظہار کیا۔

۳ر دسمبر ۵۵ء کو شاہ سعود تشریف لائے۔ سارا شہر نعرۂ تکبیر سے گونجا علی گڈھ دلہن کی طرح آراستہ ہوا، یونیورسٹی کی زیب و زینت اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور ہزاروں ہزار کی تعداد میں عوام شاہ سعود کو دیکھنے اُمنڈ آئے استقبالیہ جلسہ میں ذاکر صاحب نے سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے علی گڈھ کی مختصر تاریخ، عرب و ہند کے تعلقات اور پھر یونیورسٹی کی موجودہ پوزیشن واضح کی۔ اپنی تقریر میں اُنہوں نے کہا:

"عالم انسانی کے ساتھ ہندوستان بھی عرب کے اس احسان عظیم سے گردن نہیں اٹھا سکتا کہ رسول عربیؐ کی تعلیمات نے انسانیت کو توحید بخشی، ارباب متفرق سے چھٹکارا دلا کر ایک واحد القہار کے سامنے ان کا سر جھکایا، توہمات باطل سے نجات دلائی، صالح افراد کی بنیاد پر صالح جماعتی زندگی کی تعمیر کا سبق سکھایا، اخلاق کو سدھارا، روح کو نکھارا، اور انسانی برابری کو ایک عملی حقیقت بنا دیا۔ ہمارا وطن بھی اس فیض سے محروم نہیں رہا اور آج یہی نہیں کہ اس کے تقریباً پانچ کروڑ

باشندے رسول عربیؐ کے حلقہ بگوش ہیں بلکہ ہماری ساری قومی زندگی میں رحمتہ للعالمینؐ کی تعلیمات کی روح کسی نہ کسی انداز سے کارفرما ہے" [1]

ایران کے شاہ

۲۵ فروری ۱۹۵۶ء کو شاہ ایران اور ملکہ ثریا علی گڈھ پہنچے۔ اس موقعے پر اسٹیشن بھی خوب سجایا گیا۔ یونیورسٹی میں تو عجیب سماں تھا۔ طرح طرح کے رنگین دروازوں پر اُردو ہندی میں لکھا گیا تھا "شاہِ جاوید"۔ "خوش آمدید"۔ "جگ جگ جیویں شہنشاہ"۔ "بھارت ایران ایکتا کی جے" وغیرہ۔ اسپیشل کانووکیشن میں شاہ کو ڈگری دی گئی۔ ذاکر صاحب نے سپاس نامہ پڑھا، ایران و ہند کے تعلقات کی کہانی دہرائی اور اپنی تمناؤں کو الفاظ کا روپ دیا:

"علی گڈھ کی تعلیم و تربیت سے اور اس کے پیام و عمل سے ہندستانی مسلمانوں کا کردار بنے گا اور وہ اپنے خونِ جگر کی کاوشوں سے جدید ہندوستان کی حسین تصویر میں جلال و جمال کا رنگ بھرینگے"

شاہِ ایران علی گڈھ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ یونین ہال میں اپنی تقریر میں یہ تمنا ظاہر کی کہ "کاش میں پھر سے بیس سالہ نوجوان طالب علم بن جاؤں اور علی گڈھ کو اپنی تعلیمی زندگی کے لئے منتخب کروں"۔ [2]

---

[1] یادوں کی دنیا' - ۱۱۲ ' علی گڈھ میگزین' مجاز نمبر۔ [2] علی گڈھ میگزین مجاز نمبر

سمپورنانندجی کی زبان سے

۱۳ر دسمبر ۵۵ء کو کانوکیشن ہوا تو ڈاکٹر سمپورنانند نے ایڈریس پڑھتے ہوئے کہا:

"نئے ہندوستان کا سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ بنانے کے لیے مختلف فرقوں اور گروہوں میں میل جول بے حد ضروری ہے ہمارا کلچر ہندو مسلم تہذیب کے سنگم سے بنا ہے۔ ہندوستان کی اور بھی یونیورسٹیاں اس کلچر کو سنوارنے میں اپنا فرض انجام دیں گی مگر ایک فرض ایسا ہے جسے علی گڈھ ہی پورا کر سکتا ہے اور وہ فرض ہندوستان کی آزادی اور کلچر کے تحفظ کے لئے تمام ذاتوں، جماعتوں اور مذہبوں کو ہم آہنگ اور یک جا کرنا ہے" [1]

یونیورسٹی سروس سیمینار

۲۵ر دسمبر کو علی گڈھ میں ایک اہم تعلیمی میلہ ہو رہا تھا اور یہ تھا ورلڈ یونیورسٹی سروس کا انڈین نیشنل سیمینار، جس میں چھبیس ۲۶ یونیورسٹیوں نے حصہ لیا۔ اس سیمینار سے علی گڈھ کی اہمیت نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری علمی دنیا میں محسوس کی گئی۔

جغرافیائی سیمینار

چند ہی دن بعد یعنی ۹ سے ۱۷ر جنوری ۵۶ء علی گڈھ میں انٹرنیشنل جیاگرافیکل سیمینار

---

[1] سالانہ رپورٹ ۵۶-۱۹۵۵ء

منعقد ہوا جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے کیا جارہا تھا۔ اس میں ۲۹۷ ڈیلی گیٹ شریک ہوئے جن میں ۶۵ ڈیلی گیٹ دنیا کے اٹھارہ ملکوں سے آئے تھے۔ یہ دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر پہلا جغرافیائی سیمینار تھا۔ "اسٹریچی ہال کے سامنے دونوں طرف تمام مدعو ملکوں کے پرچم لہرا رہے تھے اور سامنے کی سڑک پر دورویہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے جھنڈے اُڑ رہے تھے اندرایک عجیب سماں تھا۔ سامنے اسٹیج پر کیشو دیو مالویہ، ذاکر صاحب، اور نور اللہ صاحب براجمان تھے۔ سیدھی طرف ڈیلی گیٹوں کا انتظام اور باقی ہال میں طلبا نہایت سکون سے افتتاحی منظر دیکھنے بیٹھے تھے" [1]

۱۷ر جنوری کو یہ ختم ہوا اور ۱۸ر جنوری کو گورنر یو پی (مسٹر کے۔ ایم۔ منشی) آئے اور یونیورسٹی کی عظمت ورفعت کا گہرا نقش اپنے ساتھ لے گئے۔

کُل ہند وائس چانسلرز کانفرنس

یہ ہنگامے ہو ہی رہے تھے کہ ۱۹ر جنوری کو ذاکر صاحب کی صدارت میں آل انڈیا وائس چانسلرز کانفرنس اسٹریچی ہال میں منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اکٹھا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم کے موجودہ مسائل پر سوچ وچار اور بحثیں ہوتی رہیں۔

علی گڈھ کی اہمیت

شاید انہی رنگارنگیوں کا جائزہ لے کر رشید صاحب نے اپنے خیالات کو اِن

---

[1] علی گڈھ میگزین، مجاز نمبر ۱۴۰ سالانہ رپورٹ ۱۹۵۶ء

الفاظ میں سمیٹتا ہے :

"اُن کی وائس چانسلری ایک عالی صفات شخص کی قیادت تھی جس پر نہ صرف علی گڈھ بلکہ اس کے باہر بھی ہر چھوٹے بڑے کو اعتماد وافتخار تھا۔ اس طور پر ذاکر صاحب کے عہد میں علی گڈھ نے ہندوستان میں اعلیٰ علمی، تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا" [۱]

عرب ملکوں کا دورہ

اسی سال مئی ۵۶ء میں ذاکر صاحب، کرنل بشیر حسین صاحب زیدی اور نواب صاحب چھتاری نے شاہ سعود کی دعوت پر سعودی عرب کا دورہ کیا اور تقریباً پندرہ دن وہاں قیام کیا۔ اس دوران میں شاہ ابن سعود نے علی گڈھ میڈیکل کالج کے لیے دس لاکھ روپے کی گراں قدر رقم عنایت کی۔ [۲]

یہاں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جب یہ سب لوگ مقدس مقامات کی زیارت کر رہے تھے تو ایک صاحب مولانا کرم علی خانۂ کعبہ کے مختلف مقامات پر لے گئے۔ مولانا ان مقامات کی مناسبت سے مختلف دعائیہ آیتیں پڑھتے اور پڑھاتے جاتے تھے۔ بالآخر ذاکر صاحب نے فرمایا "مولانا عربی میں تو بہت سی دعائیں مانگ لیں اب مجھے کچھ اُردو میں مانگ لینے دیجیے" [۳]

عرب ملکوں کے اس دورے میں ایک جگہ سپاس نامے کا جواب دیتے

---

[۱] "نذر ذاکر" - ۳۸ - [۲] سالانہ رپورٹ ۱۹۵۷ء

[۳] "ہماری زبان" (علی گڈھ) یکم نومبر ۱۹۵۶ء

ہوئے ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا :

"مسلمانانِ ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیر اقتدار نہیں لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے۔ وہ ایک آزاد جمہوریہ میں آزاد شہری کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی آبادی مختلف مذاہب و مسالک، مختلف زبانوں اور مختلف تاریخی و تمدنی عناصر پر مشتمل ہے۔ اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونا چاہیئے مسلمانوں کی وہی حیثیت ہندوستانی زندگی میں ہے۔ جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے سے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور اپنی مثال، اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مندانہ زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے اسی طرح مسلمانانِ ہند پر یہ ذمے داری عاید ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیاتِ طیبہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے اُن کے ہم وطنوں کے دل میں اُن کے دین کے لیئے جگہ پیدا ہو۔ زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں جن کے یہ حامل ہوں عام ہندی زندگی کو متاثر کریں اور ہم کہ رحمۃ للعالمین کے نام لیوا ہیں اپنے وطن اور اہل وطن کے لئے مثال اور رحمت کا کام دیں" [1]

یونیورسٹی میں کلچرل سرگرمیاں

ذاکر صاحب کا نظریہ یہ تھا کہ

---

[1] "یادوں کی دنیا" - ۱۱۵

وطن کی آزادی کے بعد علی گڑھ کے سامنے ایک خاص مقصد ہے اور اسی مقصد کو سامنے رکھ کر یہاں قومی اتحاد کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ مذہب، زبان اور کلچر کی نیرنگیوں کو ہم رنگیوں کے سانچوں میں ڈھال کر ملکی سیاست کے اندھیروں کو روشنی دکھانا علی گڑھ کا اصل کام ہے۔ یہاں ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہر مذہب و ملت کے ہی نہیں، دوسرے ملکوں مثلاً چین، انڈونیشیا، ملایا، برما، نیپال، انڈوچائنا، سیلون، عراق، پاکستان، وسط افریقہ، مصر، سوڈان وغیرہ کے طلبار کثیر تعداد میں تعلیم پا رہے تھے۔ مذہبی اور ثقافتی میل جول کا طریقہ جو یونیورسٹی میں شروع کیا گیا وہ مختلف ہندوستانی تہواروں پر کلچرل پروگرام یعنی ملے جلے موسیقی کے جلسوں اور ڈراموں وغیرہ کا انتظام تھا[1] جن میں ہر مذہب و ہر فرقے کے لوگ شرکت کریں اور ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ یہ سب اس لیے بھی ضروری تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی وزارتِ تعلیم نے ہر سال نوجوانوں کا ایک میلہ "یوتھ فیسٹیول" کے نام سے شروع کیا تھا جس میں تمام یونیورسٹیاں حصہ لیتی تھیں۔ اسی وجہ سے مارچ ۵۶ء میں ایک کمیٹی بھی کلچرل سرگرمیاں ترتیب دینے کے لیے بنائی گئی اور طلبار کو موسیقی

---

[1] اکثر اس طرح کے رنگا رنگ پروگرام ہوسٹلوں میں روا رکھے گئے اور خود ذاکر صاحب نے ان میں پوری طرح حصہ لیا۔ میگزین ۵۶-۵۵ء میں ان سرگرمیوں کے چند فوٹو بھی شائع ہوئے۔

سکھانے کا انتظام بھی کیا گیا۔ [1]

یونیورسٹی نے جو اہم انٹرنیشنل (بین الاقوامی) پوزیشن اور قومی زندگی میں جو وقار حاصل کر لیا تھا اس کے پیش نظر یہ سب کچھ ضروری سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس طرح کے پروگرام یونیورسٹی میں ایک نئی چیز تھی اور صرف علی گڑھ ہی میں نہیں پورے ملک کے ایک طبقے کی طرف سے اس کی مخالفت بھی قدرتی تھی چنانچہ بعض اخبارات میں بھی یہ اعتراضات نمایاں طور پر آنے لگے۔ [2] اس طبقے کا کہنا تھا اس سے یونیورسٹی کے مخصوص بنیادی مقاصد اور قدیم کیریکٹر داغدار ہوتا ہے۔" وہاں مسلمان اپنے فرزندوں اور نوجوانوں کو اس توقع پر تعلیم حاصل کرنے بھیجتے ہیں کہ وہ نئے زمانے کی ایک ترقی یافتہ یونیورسٹی ہونے کے ساتھ مسلمانوں کا ایک تعلیمی اور تربیتی مرکز بھی ہے اور وہاں رہ کر مسلمان نوجوان اپنے عقاید اور تہذیب کے بارے میں زیادہ اعتماد اور زیادہ روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ [3]
غرض یہ کہ اس بحث مباحثے نے کافی طول کھینچا اور اس سے ذاکر صاحب کے

---

[1] سالانہ رپورٹ ۵۷ء۔

[2] ایک مضمون "کلچرل پروگرام کا فتنہ" میں اس پر بھی اعتراض کیا گیا کہ اب لڑکیاں اور لڑکے یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ گھومتے نظر آتے ہیں (دعوت، بحوالہ صدق جدید، ۲ رجولائی ۵۶ء، ترجمان، علی گڑھ ۲۰ را پریل ۵۶ء)

[3] 'صدق جدید' ۱۲ اگست ۵۶ء مضمون مولانا ابوالحسن علی ندوی

ذہن کو جس کرب واضطراب سے گذرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ دشوار نہیں۔

خیالات اور نظریات کا ٹکراؤ

یونیورسٹی اسٹاف اور طلبا میں رفتہ رفتہ دو انتہا پسند گروہ نمایاں ہو گئے تھے۔ایک وہ جو مذہب کی طرف بے انتہا رجحان رکھتا اور دوسرا وہ جس کو ماحول، حالات اور پروپیگنڈے کے اثر نے مذہب اور اس کی اہمیت سے بالکل بیگانہ بنا دیا تھا۔ تقسیم ہند نے مسلمانوں میں جو ہراس اور مایوسی پیدا کی تھی کچھ اس کا ردّ عمل اور کچھ دوسرے اسباب نے جن کا ڈاکٹر سید عابد حسین نے اپنی کتاب (" ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں ") میں تفصیلی تجزیہ کیا ہے[۵۱] نوجوانوں کو نئی راہیں دکھائی تھیں اور انہی اثرات کے تحت یونیورسٹی میں کمیونزم کا پرچار رفتہ رفتہ شروع ہوا اسٹاف میں یہ رجحان رکھنے والوں کی تعداد بڑھنے پر منظم ہو گیا اور پھر اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے یہ سب کچھ یونیورسٹی کے کچھ " بڑوں " کی سرپرستی میں ہونے لگا۔ جب بعض ایسے لوگوں کو جو کھلے طور پر اپنے عقاید کے لیے مشہور تھے اہم عہدے سپرد کیے گئے تو اس تحریک کو سہارا ملا اور دوسرے گروہ نے بھی نہ صرف زیادہ سے زیادہ تنظیم کے ساتھ کام شروع کیا بلکہ نظریات کا یہ ٹکراؤ ہر جگہ اُبھر کر آنے لگا۔ خصوصاً یونین کے الکشن تو اس کشمکش کا خاص نشانہ بن گئے۔ اب اگر ایک طرف سے اپنے ہر مخالف پر رجعت پسند

---

[۵۱] عابد حسین : " ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں " باب ۹

اور فرقہ پرست ہونے کے الزام تھے تو دوسری طرف سے ہر روشن خیال شخص پر کمیونزم کے زیر اثر ہونے کا شبہ۔ نظریات کی اس بڑھتی ہوئی ٹکر نے جو پیچیدگیاں پیدا کیں وہ نا قابل بیان ہیں اور ذاکر صاحب کے لئے جس قدر ذہنی کوفت کا باعث ہوں گی وہ نا قابل اظہار۔

فرقہ وارانہ سوال

۱۹۴۷ء سے پہلے مسلم لیگی سیاست نے علی گڈھ کے اسٹاف اور طلبا کے ایک بڑے حصے کو متاثر کر دیا تھا۔ جسکے نتیجے میں یونیورسٹی کی ساکھ غارت ہوئی، تعلیمی قدریں خاک میں مل گئیں، معیار گرتا چلا گیا اور بقول رشید صاحب "تقسیم ملک سے پہلے کے چند سال تو یونیورسٹی میں ایسے دیکھنے میں آئے کہ پہلے کبھی نہ دیکھے تھے نہ سُنے تھے"[1] چنانچہ وطن کی تقسیم نے علی گڈھ کو عجیب ہراساں اور معلق حالت میں چھوڑا تھا۔ جب ذاکر صاحب یہاں آئے تو اُن کے سامنے تین اہم مقاصد تھے:

(۱) فرقہ وارانہ روایات اور نظریات سے مقابلہ۔

(۲) یونیورسٹی کی قومی اور جمہوری لائنوں پر راہ نمائی۔

(۳) تعلیم اور تحقیق کے کام کی تنظیم۔

فرقہ وارانہ سیاست سے ٹکرانے میں کب اور کون بخیر و عافیت رہا ہے مہاتما گاندھی تو خیر شکار اسی تیر سے ہوئے۔ مگر مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولانا

---

[1] "آشفتہ بیانی۔ ۴۳

محمد علیؒ، پنڈت نہرو اور دیگر قابل احترام شخصیتوں کو ذہن میں رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اگر یہی سب کچھ ذاکر صاحب کے حصے میں بھی آیا تو کوئی نئی اور عجیب بات نہیں بلکہ ان کے حصے میں تو اتنا آیا بھی نہیں ۔

جہاں تک غیر مسلم طلبار اور اسٹاف کا سوال ہے مسلم یونیورسٹی آج سے نہیں ہمیشہ سے اس معاملے میں فراخ دل رہی ہے ۔ ایم ۔ اے ۔ او کالج کے زمانے میں یہاں غیر مسلم طلبار کی تعداد ۷۵ تھی اور یہ کُل کا ایک چوتھائی تھے[۱] اسی طرح ہمیشہ یہاں ہندو، سکھ، عیسائی طلبار برابر تقریباً اسی نسبت سے موجود رہے ہیں ۔ اس کے بنانے میں بھی سیکڑوں ہندوؤں نے بڑے کھلے دل سے حصہ لیا ہے (جن میں کچھ نام ایس ایس ہال میں کمروں پر آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں) ذاکر صاحب کے آنے کے بعد صرف یہ ہوا کہ طلبار اور اسٹاف میں یہ تعداد پہلے سے کچھ بڑھ گئی یعنی اب ایک تہائی ہو گئی[۲] یونیورسٹی کورٹ میں یہ فیصدی تعداد ۱۱ سے ۲۵ اور ایگزیکٹو کونسل میں ۔ اسے بڑھ کر ۳۳ ہو گئی ۔ غالباً سب سے زیادہ نمایاں تبدیلی ایگزیکٹو کونسل میں آئی ۔ یہ کونسل ہی

۱؎ رسالہ "سیمینار" (SEMINAR) (نئی دہلی) جون ۱۹۶۸ء نمبر ۱۰۶ ۔ مضمون SEMINAR, No. 106 June 1968, 'Task Ahead' by Danial

۲؎ انگریزی رسالہ "لنک" کے نمائندے نے ۱۹۵۹ء میں علی گڑھ کا دورہ کیا تھا۔ اس وقت یہاں ۳۴ فیصدی طلبار مختلف ۲۲ شعبوں میں سے ۹ کے صدر اور مینجنگ اسٹاف میں ۶۰ غیر مسلم تھے ۔ ("لنک" ، ۷ رجون ۱۹۵۹ء)

سب سے زیادہ بااختیار تھی لیکن اگر شروع سے اب تک اس سے یونیورسٹی کے کردار یا کاز کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تو اب بھی اس کا امکان نہ تھا بلکہ یہاں کی فضا میں غیر فرقہ وارانہ قومی نقطۂ نظر کا پیدا ہونا اور اس ماحول کا تنگ دلی سے پاک ہو کر تعلیمی آزادیاں اور یکسوئی حاصل ہو جانا غور کریں تو کس قدر مفید تھا اور رفتہ رفتہ یہ ماحول پیدا بھی ہوتا جا رہا تھا جسکی کچھ مثالیں ان صفحات پر آچکی ہیں۔ یہاں یونیورسٹی کے ایک غیر مسلم اولڈ بوائے کا بیان ملاحظہ کیجیے:

"کبھی کبھی بیرونی ذرائع سے یونین کے الکشن میں فرقہ وارانہ پروپیگنڈے کے باوجود طلبار اور اسٹاف کا عام برتاؤ (غیر مسلم طلبار کی طرف) برادرانہ تھا اور فرقہ پرستی سے پاک تھا" [۲]

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فرقہ پرستی جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دی گئی تھی۔ علی گڈھ آخر ہندوستان ہی کا ایک حصہ ہے کوئی الگ تھلگ نہیں ہے۔ ملک میں تقسیم کے بعد سے ہمیشہ علی گڈھ کے بارے میں دو رائیں رہی ہیں نیشنلسٹ گروہ کی رائے میں:

---

[۱] "ریڈینس" ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

WRIGHT (Theodore P) Jr: Muslim Education in India at the Crossroads, 'Pacific Affairs' V. 39 (1-2) Spring-Summer 1966

2. SEMINAR, No. 106 June 1968, 'Task Ahead' by Danial

"یونیورسٹی کی ترقی اور اصلاح ضروری ہے۔ اُسے ہمارے دیش کے ملے جلے کلچر میں مسلمانوں کے اہم کردار پر مطالعہ کا مرکز بنایا جانا چاہیئے یہ حقیقت کہ اسلام نے ہمارے کلچرل ورثے اور روایات کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ زمانے میں بڑا ٹھوس اور نمایاں رول ادا کیا ہے، اتنی واضح ہے کہ کوئی اس سے انکار کی جرات نہیں کر سکتا یہی وہ زندہ اور پائندہ روایت ہے، یہی وہ متحرک قوت ہے جسکو ہم اس یونیورسٹی میں پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں" [1]

اور اس کے مقابلے میں دوسرا وہ گروہ جسکے خیال میں :

"ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ایک مسلم یونیورسٹی کے لیئے کوئی جگہ نہیں۔ علی گڈھ یونیورسٹی جب تک مسلم کلچر کی نمایندگی کے غلط مقصد کی تکمیل میں لگی رہے گی تب تک اُسے شک و شُبے کی نظر سے دیکھا جائیگا" [2]

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ فرقہ پرستوں کا منشا یہ تھا کہ یونیورسٹی کے ساتھ مقامی کالجوں کو ملا دیا جائے اور اس طرح اس کے قدیم کردار کو بالکل ملیا میٹ کر دیا جائے اس کا ردِ عمل اسی قسم کا انداز فکر رکھنے والے مسلم حلقوں میں ہونا لازمی تھا اور ان کی طرف سے یہ مطالبہ بھی اسی جذبے کے تحت تھا کہ یونیورسٹی کے سابقہ کردار

---

[1] رپورٹ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی انکوائری کمیٹی ۱۹۶۱ء - ۴۲

[2] "آرگنائزر" ۶ر فروری ۱۹۶۱ء

SMITH (D E.): India as a Secular State, P. 394

اس کے کورٹ یا کونسل میں کوئی تبدیلی نقصان کا باعث ہوگی اور یہ کہ ۱۹۵۱ء کا ترمیمی ایکٹ واپس لیا جائے۔ لیکن یونیورسٹی میں ایک بڑا طبقہ ایسا موجود تھا جو کہ فرقہ وارانہ انداز فکر سے مقابلے کے لئے تیار رہتا تھا چنانچہ انگریزی رسالے 'لنک' کا نامہ نگار جو ۱۹۵۹ء میں علی گڈھ گیا تھا، یہاں جن لوگوں سے ملا اُنہوں نے اُسے بتایا کہ "ہم لوگ یہاں مسلم فرقہ پرستی کا مقابلہ کر سکتے ہیں مگر ہندو فرقہ پرستی سے لڑنا ہمارے لئے ممکن نہیں، یہ کام سوجھ بوجھ رکھنے والے ہندوؤں ہی کے کرنے کا ہے" [1]

اختلاف اور اعتراضات

ذاکر صاحب کے مخالفین ہمیشہ رہے ہیں لیکن علی گڈھ میں ان کی تعداد کچھ زیادہ رہی۔ نقطۂ نظر کا فرق بھی اس کی ایک وجہ ہے کیونکہ یقیناً علی گڈھ میں دماغی تنگ دامانیوں کا حامل ایک گروہ طلبا میں بھی موجود رہا اور اساتذہ میں بھی۔ اس کے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ چونکہ مختلف تھا اس لیے یونیورسٹی میں کسی پہلو سے کوئی تبدیلی خواہ وہ اُس کے سدھار کی خاطر ہو، اس گروہ کو گوارا نہیں تھی۔ یہ گروہ تو خیر تھا ہی مخالفت اور اعتراض کے لئے لیکن بعض اعتراض اس دوران میں ایسے بھی ہوئے جن میں وزن تھا، جن کے ساتھ دلیل تھی اور غور و فکر کی دعوت۔

---

[1] 'لنک' ویکلی نئی دہلی ۷ جون ۱۹۵۹ء

LINK. 7 June, 1959

ذاکر صاحب کے علی گڑھ آنے کے تین چار سال بعد سے اعتراضات اور تنقیدوں کی گنجائش اس طرح نکل آئی کہ ۱۹۵۱ء میں حکومت ہند نے یونیورسٹی کے لیے ترمیمی ایکٹ جاری کیا جسکی رو سے یونیورسٹی کے قانون میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں مثلاً :

(۱) یونیورسٹی کورٹ کا دروازہ غیر مسلموں کے لیے بھی کھول دیا گیا
(۲) پریسیڈنٹ آف انڈیا کو یونیورسٹی کا "وزیٹر" بنلاتے ہوئے وائس چانسلر مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا (کورٹ کے نامزد تین ناموں کی فہرست سے)
(۳) دینیات کو لازمی کے بجائے اختیاری مضمون کر دیا گیا۔
(۴) یونیورسٹی رجسٹرار کو کافی اختیارات سونپ دیئے گئے۔

کہا یہ گیا کہ یہ ایکٹ یونیورسٹی کے کردار میں پہلا شگاف ہے اور اس کا مقصد آہستہ آہستہ اختیارات سلب کرنا اور یونیورسٹی کے مسلم کیریکٹر کو ختم کرنا ہے جو نا واجب اس طرح بھی ہے کہ ہندوستانی قانون میں آرٹیکل نمبر ۳۰ کی رو سے لسانی اور مذہبی اقلیتوں کو اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق دیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی تشریح کی گئی ہے کہ حکومت کسی ادارے کی امداد میں اس بنا پر امتیاز نہیں کرے گی کہ یہ اقلیت کی طرف سے چلایا جا رہا ہے چاہے وہ اقلیت مذہبی ہو یا لسانی [1]

---

1. SMITH (D E.): India as a Secular State, P. 114

ان اعتراضات کا جو جواب ذاکر صاحب نے اپنی ایک تقریر میں دیا تھا وہ انہی صفحات پر ہماری نظر سے گذرا ہے۔ کورٹ کی رکنیت کے بارے میں یہ ہے کہ "پرانے قانون کی رُو سے کوئی غیر ہندو، ہندو یونیورسٹی میں اور کوئی غیر مسلم، مسلم یونیورسٹی میں کورٹ کا رکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اب یہ قید دونوں جگہ سے ہٹا دی گئی ہے ...... پرانے قانون میں یونیورسٹی کے جو اختیارات تھے وہ ویسے کے ویسے ہی نئے قانون میں بھی رکھے گئے ہیں... صرف اس بات کا اہتمام مقصود ہے کہ اہم قومی مرکزوں میں یہ جدائی قانونی طور پر لازمی قرار نہ دی جائے۔ یہ ادارے اپنی خصوصیات قائم رکھیں لیکن اُن کے کام میں دوسرے اہل ملک کا مشورہ ممنوع نہ ہو۔ یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ جن لوگوں نے یہ ادارے بنائے ہیں، اُن کی روایات بنائی ہیں، اُن کے مقاصد متعین کئے ہیں وہ ان سے ہٹائے جائیں اور دوسرے لوگ ان کی جگہ لے لیں" [1]

علی گڈھ کے ساتھ ایک مصیبت یہ تھی کہ وہ اپنے اسٹاف اور طلبا کی اکثریت کے سابقہ نظریات اور کردار کے کارن ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کا نشانہ بنا رہا۔ ایک طرف یہ خیال کہ علی گڈھ پاکستانی جاسوسوں کے پرچار کے اڈہ ہے اور دوسری طرف یہ یقین کہ علی گڈھ کو سیکولرازم کی آڑ لیکر ہڑپ کیا جا رہا ہے اور وہ کمیونزم کا گڈھ بن چکا ہے۔ صرف

---

[1] تعلیمی خطبات طبع ۱۹۶۱ء - ۲۶۳

یہیں تک بس نہیں، دونوں طرف سے علی گڑھ پر ناقابل بیان دباؤ اور کش مکش۔! ادارۂ علوم اسلامیہ قائم ہوا تو ہندو فرقہ پرستوں کے لیے تو یہ "ہوّا" کہ اسلامی پرچار کا مرکز قائم ہوا جاتا ہے اور مسلمان جنونیوں کو یہ فکر کہ اسلام اور مسلم ممالک کے تہذیب و تمدن کو "سیکولر" انداز میں پیش کر کے اُن کی مٹی پلید ہو گی [1]

ادارۂ علوم اسلامیہ پر اعتراضات کی بوچھاروں میں ایک یہ بھی تھا کہ اس کا ڈائرکٹر ایک ایسے شخص کو بنا دیا گیا جو نظریات کے اعتبار سے کھلا ہوا کمیونسٹ ہے، خدا اور رسولؐ کا منکر ہے اور جس نے اپنے تھیسس (تحقیقی مقالے) میں قرآن و حدیث کو نشانہ بنایا ہے جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس ادارے کا سربراہ کوئی ایسا شخص ہو جو اسلامی علوم اور عقائد سے لگاؤ اور دل میں احترام رکھتا ہو [2] لیکن دراصل یہ ادارہ دین و مذہب کی کوئی درسگاہ نہیں تھا بلکہ حکومت ہند کا پروجیکٹ تھا۔ ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں افریقی ملکوں، چین اور جاپان وغیرہ پر ریسرچ کے ادارے قائم ہیں اسی طرح یہ مڈل ایسٹ (مشرق وسطیٰ) پر ریسرچ کا ادارہ تھا [3] نام اسلامک اسٹڈیز نہ جانے کیوں رکھ دیا گیا۔

---

[1] 'لنک'، ۲ جون ۵۹ء۔ ص ۴۰۔ ۳۹۔

[2] ملاحظہ ہوں اُس زمانے کے اخبارات و رسائل مثلاً 'دعوت'، 'صدق جدید'، 'ترجمان' وغیرہ۔ [3] 'لنک'، ۲ جون ۵۹ء

یونیورسٹی میں باہمی میل جول اور جمہوری قدروں کا جو نیا تجربہ کیا جا رہا تھا اس کی وجہ سے ہندو طلبار کو پہلے کی طرح الگ ہوسٹل کی بجائے مسلم طلبار کے ساتھ ہی جگہ دی گئی اور اکثر ایک ہی کمرے میں وہ اپنے مسلم دوستوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے علاوہ باہر ملکوں کے بھی بہت سے طلبار تھے تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے ان کو قریب لانے کی غرض سے کلچرل پروگرام شروع کیے گئے[1] جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کو حصہ لینے پر ایک کو دوسرے سے قریب آنے کی آزادی ملی۔ یہ رنگینیاں مذہبی رجحان رکھنے والوں کے لیے سخت ناگواری کا باعث ہوئیں اور ایک مرتبہ تو یونیورسٹی کے ایک ایسے ہی کلچرل پروگرام کو طلبار کے ایک گروہ نے احتجاج کر کے بند کرا دیا تھا[2] اس سلسلے میں مختلف اعتراضات پر علیحدہ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

ذاکر صاحب پر ایک اور اعتراض اسی مذہبی رجحان رکھنے والے گروہ کی جانب سے یہ تھا کہ انھوں نے پرو کمیونسٹ (کمیونسٹ نواز) پالیسی اختیار کی اور اسٹاف میں یہ رجحان رکھنے والوں کو اونچی اور با اختیار جگہیں دیں۔ فیکلٹی کے اکثر مسلم لیگی ذہن رکھنے والے اسٹاف ممبر جب پاکستان چلے گئے تو یہ خالی جگہیں اُن لوگوں سے پُر کی گئیں جو کھلے ہوئے مارکسسٹ تھے۔ اسٹاف

---

[1] 'لنک'، ۵ نومبر ۱۹۶۱ء

WRIGHT (Theodore P) Jr: Muslim Education in India at the Crossroads. Pacific Affairs V. 39 (1-2).

2. LINK, 7 June, 1959

کے انہی ممبروں کے سبب طلبار میں بھی کمیونسٹ رجحان کو بڑھاوا ملا[1] اور ناخوش گوار صورت حال پیدا ہوتی چلی گئی ۔

ذاکر صاحب تعلیمی میدان میں سیاسی اور مذہبی عقیدے کو نظر انداز کرنے کے حامی ہیں یہی اصول وہ جامعہ میں برت رہے تھے اور یہی یہاں اپنایا۔ دوسرے یہ کہ وہ ذہنی تنگ نظری کے جس قدر مخالف اور غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کے جس درجہ حامل ہیں وہ ہر ایک پر روشن ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اس ذہن سے اُنہوں نے یہ تقرر کیئے ہوں کہ روشن خیالی، رواداری اور قومی انداز فکر انہیں جہاں نظر آیا اُنہوں نے اُسے چُن لیا۔ اب یہ ممکن ہے کہ یہ خصوصیات کمیونسٹ عقائد رکھنے والوں میں نظر آئے ہوں یا ان خصوصیات کے حامل زیادہ تر کمیونسٹ ہی ہوں ۔

اسٹاف کی خفیہ فہرستیں

ایک لطیفہ اس دوران میں یہ ہوا کہ دو مختلف خیالات رکھنے والے گروہوں کی طرف سے ان کے پاس خفیہ فہرستیں بھیجی گئیں ۔ ایک گروہ کی طرف سے فرقہ پرست اسٹاف کی فہرست اور اس کے ساتھ یہ تقاضہ کہ یہ عنصر یونیورسٹی سے خارج کیا جائے دوسری طرف سے کمیونسٹ اسٹاف کی فہرست اور یہ اصرار کہ مسلم یونیورسٹی سے

---

[1] WRIGHT (Theodore P) Jr : Muslim Education in India at the Crossroads, 'Pacific Affairs' V. 39 (1–2) Spring Summer 1966

یہ عنصر تو نیست و نابود ہونا ہی چاہیئے ۔! ذاکر صاحب کا کہنا ہے کہ اگر دونوں فہرستوں پر عمل کیا جاتا تو ایک بھی آدمی یونیورسٹی کے اسٹاف میں باقی نہ رہتا ۔

مصر اور ہندوستان

اپریل ۱۹۵۵ء میں جب کرنل ناصر بینڈونگ کانفرنس سے واپس ہوئے تو ہندوستان میں قیام کیا اور ۲۸ اپریل کو نئی دہلی میں " انڈو ایجپشین فرینڈ شپ سوسائٹی" کا افتتاح کرتے ہوئے ہندوستان اور مصر کے قدیم تعلقات کا ذکر کیا ۔ یہ سوسائٹی ذاکر صاحب کی صدارت میں قائم ہوئی جنہوں نے اس موقعہ پر اپنی تقریر میں کرنل ناصر کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُنہیں مصری قوم کی اُبھرتی ہوئی اُمنگوں کا نشان قرار دیا اور دونوں ملکوں کے قدیم تعلقات پر روشنی ڈالی ۔ اس موقعے پر پنڈت نہرو نے بھی تقریر کی ۔

علی گڈھ کی مشکلیں

یونیورسٹی اب نہ صرف نازک دور سے نکل گئی بلکہ ملک میں کافی وقار اور وقعت بھی گذشتہ سات آٹھ سال کے دوران حاصل کر چکی تو ذاکر صاحب کی مشکلات کا نازک دور شروع ہوا ۔ مخالفت اور اعتراضات کی گنجائش نکلی تو مخالفین کھل کر منظر عام پر آگئے ۔ رشید صاحب نے تو بہت پہلے کہا تھا کہ :

> " ذاکر صاحب اور ان کے رفقاء کی طرف سے علی گڈھ کا ایک مخصوص طبقہ بدگمان رہا اور اب بھی ہے ..... اس بدگمانی کے باوجود جو عناد کی حد تک پہنچی ذاکر صاحب علی گڈھ کے ہر انتظام میں شروع

سے آخر تک شریک رہے" [1]

ویسے بھی ۱۹۴۷ء سے پہلے علی گڑھ جس گروہ کے نقطۂ نظر کا نمایندہ بنا رہا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اچانک اپنے نظریات و خیالات کا بوریہ سمیٹ لے؟ چنانچہ اب یہ کارگزاریاں اپنی انتہا کو پہنچنے لگیں اور یہی وہ مشکل تھی جس سے ذاکر صاحب آج تک زندگی میں دوچار نہ ہوئے تھے، راہ کی یہی وہ رکاوٹیں تھیں جن سے ان کا ذہن اب تک آشنا ہی نہ تھا۔ ان مشکلات کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ اب ان کی صحت بالکل جواب دینے لگی اور قلب کی تکلیف نے اس قابل نہ رکھا کہ ذرا سی ٹھیس بھی دل کو گوارا ہو سکے اور یہ بھی کہ بعض ایسے ساتھی جن پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ اور اعتماد کیا گیا بالکل برعکس ثابت ہوئے۔ ان حالات نے دل و دماغ پر بے حد اثر کیا چنانچہ "علالت کی مسلسل کم و بیش خلش سے اِدھر ذاکر صاحب کچھ بے کیف رہنے لگے تھے اور کبھی کبھی معمولی باتوں پر بھی بے لطف ہو جایا کرتے تھے اس کا سبب تنہا علالت ہی نہ تھی بلکہ اور طرح کی ناسازگاریاں بھی تھیں جو یقیناً سنگین نہ تھیں اور عام طور پر ہر اس شخص کو پیش آتی رہتی ہیں جسکے سپرد اتنا بڑا کام ہو لیکن ان سب نے مل کر کچھ ایسی صورت پیدا کر دی کہ ذاکر صاحب کو علی گڑھ نہ چھوڑنے پر راضی نہ کیا جا سکا" [2]

---

[1] "ذاکر صاحب" - ۱۳

[2] "یونیورسٹی گزٹ، ذاکر نمبر مضمون رشید احمد صدیقی۔

یونیورسٹی میں ایک غلط ہنگامہ

یہی زمانہ تھا جب تمام ہندوستان میں وِدیا بھون بمبئی کی چھاپی ہوئی امریکی کتاب "ریلیجیس لیڈرز" پر سخت بے چینی رونما ہوئی۔ کچھ تو ویسے "جنون کے آثار" اور کچھ لوگوں نے دیوانہ بنایا نتیجہ یہ ہوا کہ سنجیدہ اور حق بجانب معاملے نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا۔ شریر عنصر نے یونیورسٹی میں بھی اسکول کے بچوں سے یہ ہنگامہ شروع کرایا اور تمام یونیورسٹی میں پھیلا دیا۔ یہ سب کچھ ۱۳؍اگست ۵۶ء کو ہوا اور انتہائی غلط انداز اس احتجاج کے لئے اختیار کیا گیا۔ ذاکر صاحب کو اس غیر شریفانہ مظاہرے سے تکلیف ہوئی اور اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ چیز ہندوستانی پریس کا ردّ عمل تھا جو اس مظاہرے پر علی گڈھ کے خلاف ہوا۔ فرقہ پرستوں اور شر پسندوں کی بن آئی شہر میں غنڈہ عناصر نے ہنگامہ برپا کیا، لوٹ مار کی اور دو کانوں کو آگ لگائی پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے ذاکر صاحب نے اپنی دلی تکلیف و ندامت کا اظہار کیا، ۷۲ طلبا کو یونیورسٹی سے نکالا اور وہ وقت بھی آگیا کہ جب انھیں ایکزیکٹو کونسل کی میٹنگ میں شرکت سے انکار تھا۔[1]

فیصلہ بدلنے کی کوشش

ذاکر صاحب اس ہنگامے سے بہت پہلے استعفےٰ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے ۱۱؍اگست ۵۶ء کو یونین میں ان کے استعفےٰ پر غور کرنے کے لئے جلسہ بھی ہوا

---

[1] نورانی: ۱۵-۹-۷۶

مختلف لوگ ان کے پاس گئے اور فیصلہ بدلنے کی درخواست کی ۔ سینیر طلبا کی ایک میٹنگ میں بعض لوگوں نے رائے دی کہ ہم میں سے چند کو ذاکر صاحب کی کوٹھی کے سامنے بھوک ہڑتال کرنا چاہیئے تاکہ وہ فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں لیکن وہاں ایک صاحب نے بتایا کہ ذاکر صاحب کہتے ہیں کہ اگر لوگوں نے مجھے زیادہ پریشان کیا تو میں ان پر پتھر پھینکوں گا تاکہ وہ مجھے پاگل سمجھ کر میرے حال پر چھوڑ دیں [1]

یونین میں تقریر

ستمبر کے پہلے ہفتے میں ان کا استعفےٰ منظور کر لیا گیا۔ اس دوران میں ریلیجس لیڈر رنز پر ہنگامہ ہوا اور اسکے بعد یونین ہال میں ذاکر صاحب کی رخصتی تقریر ہوئی:

جناب صدر اور عزیزو ــــ!

سب سے پہلے میں اپنے اس تامل کا اقرار کر لوں جو مجھے یہاں آنے میں تھا، میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا لیکن میں اس لیے آ گیا کہ میرے نہ آنے سے کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے ۔ دراصل مجھے آنے میں تامل اس لیے تھا کہ میں اپنے اُس رنج اور مایوسی کا اظہار آپ کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا جو مجھے آپ کے رویے سے ہوئی۔ میں اس لیے مایوس ہوں کہ آپ میں ابھی تک پختگی نہیں آئی کوئی بھی شخص آپ کو آ کر بہکا سکتا ہے ۔ آپ اُن بھیڑوں کی طرح ہیں جنہیں

---

[1] رسالہ 'علیگ' ۸ فروری ۱۹۴۸ء ص۔ ۱۱

کوئی بھی ہانک لیجا سکتا ہے ۔ آپ کو کوئی بھی جوش دلا کر آپ کے
جذبات بھڑکا سکتا ہے اور آپ نے اپنے جذبات کے سلسلے میں عقل
سے کام لینا ابھی تک نہیں سیکھا ـــــــ آپ آزاد ہیں، آپ کا ادارہ
آزاد ہے لیکن آپ آزادی کی قیمت دینا نہیں جانتے ۔ آزادی کی قیمت
ہوتی ہے اُس کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا، آزادی کا حاصل کرنا
جتنا مشکل ہے اُس سے زیادہ مشکل ہے اس کا قائم رکھنا۔ آزادی
روز حاصل کی جاتی ہے ۔ اس کے لئے ہر روز اس کی قیمت ادا کرنی
ہوتی ہے ۔ آپ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس سے آپ
اس آزادی کے زیادہ مستحق یا نااہل قرار پاتے ہیں ۔ آزادی کسی کے
پاس ہمیشہ کے لئے نہیں آتی ۔ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ۔
آپ نے جو کچھ کیا، اس کے لئے یقیناً آپ کو افسوس ہوگا ـــ
ابھی آپ کے صدر نے کہا کہ مظاہرہ اور جلوس جیسی چیزوں کو وہ
گھٹیا درجے کی بات سمجھتے ہیں مگر آپ نے یہ سب کچھ کیا، میں یہ نہیں
کہتا کہ سب کچھ آپ ہی نے کیا ۔ آپ نے بغلیں بجائیں، دوسرے ننگے
ہو کر ناچے ۔ آپ نے جنازہ نکالا ، دوسروں نے قتل کر ڈالے ۔ گویا
اگر آپ کے خلاف کوئی شخص کوئی بات کہہ دے تو ذرا سی دیر میں
آپ جوش میں اُبل پڑ سکتے ہیں ۔ کوئی بھی آپ کی سمجھ کو خرید سکتا
ہے ۔ آپ کے جذبات کو بھڑکا سکتا ہے آپ جلوس نکالیں،
جلوسوں میں گالیاں دیں، نعرے لگائیں ۔ یہ سب آخر کیا ہے؟ ۔

یہ پڑھے لکھوں کی سی باتیں نہیں ہیں۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے جذبات کو عقل کے قابو میں رکھے، جسے اپنے خلاف سُن سکنے کی عادت ہو اور جو دوسروں کے اعتراضوں کا جواب ٹھنڈے دل سے دے سکے آپ نے مسٹر منشی کا جنازہ نکالا۔ بعد میں آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ آپ کے صدر اُنہیں بڑے احترام سے یہاں لائے تھے اُنہیں یونین کا لائف ممبر بنایا تھا اور آج جتنی تعریف میری کی ہے اُس سے زیادہ اُن کی تعریف کی تھی۔ میں آپ کی تعریف پر کیسے اعتبار کروں؟ — کون کہہ سکتا ہے کہ کل آپ میرا جنازہ نہ نکالیں گے؟ —— آپ کی بات میں وقار ہونا چاہیئے۔ اگر ایک بار کسی بات کو کہہ دیں، وہ غلط بھی ہو تو اس کا پاس کرنا چاہیئے۔

رسول اللہؐ پر کوئی اعتراض کرے تو اسے مردہ باد کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا عقل اور سوجھ بوجھ سے اس کا جواب دینا چاہیئے۔ آپ کی اس درس گاہ کے بانی کے زمانے میں سر ولیم میور نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے رسول اللہؐ پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ سر سید احمد خاں نے اپنا سارا اثاثہ بیچا، اپنے گھر کے برتن بیچے اور لندن کے دور دراز سفر کے لئے نکل کھڑے ہوئے تاکہ وہاں پہنچکر سارے مواد کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک کتاب لکھ سکیں۔ وہ بوڑھا آدمی تھا، اتنا لمبا سفر کافی تکلیف دہ تھا، وہ اُس ملک کی زبان

سے بھی ناواقف تھا۔ لیکن وہ بوڑھا مجھ سے بڑا عاشقِ رسولؐ تھا، اُس نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور ایک ایسی کتاب لکھی جو رسول اللہؐ کے معترضین کے سامنے آج بھی پیش کی جاسکتی ہے، "خطباتِ احمدیہ" رسول اللہؐ کی زندگی کے سلسلے میں آج بھی ایک معیاری کتاب مانی جاتی ہے ——— اعتراض کا جواب ایسے دیا جاتا ہے۔ اُس نے کوئی نعرہ نہیں لگایا، نہ کسی کا جنازہ نکالا نہ کسی کو مُردہ باد کہا۔ آپ نے مُردہ باد کہا بھی، تو کیا ہوا؟ ——— آپ کی بات میں اتنا وزن ہونا چاہیئے کہ جسے مُردہ باد کہدیں وہ مُردہ ہو جائے، جسے زندہ باد کہہ دیں وہ زندہ ہو جائے ——— آپ کا جو طریقہ تھا اس سے رسول اللہؐ کو تکلیف پہنچنی چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ اُنہیں تکلیف ہوئی ہوگی۔

تم کچھ کرنے سے پہلے اپنے بڑوں سے مشورہ کیوں نہیں لیتے۔ مشورہ لینے کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس کے ماننے کے لیئے مجبور بھی ہو لیکن اس سے تمہاری عقل ضرور صیقل ہو جائے گی، سمجھ میں اضافہ ہوگا۔ تم آزاد ہو۔ اُستاد تمہیں از خود تو مشورہ نہیں دے سکتے لیکن تمہیں تو مشورہ لینا چاہیئے۔ جس طرح بوڑھوں کو سہارے کے لیئے جوانوں کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح جوانوں کو بوڑھوں کی ضرورت ہوتی ہے ——— اس سلسلے میں پریس میں جو غلط بیانی ہوئی ہے تمہیں اس کا بُرا نہیں ماننا چاہیئے اس کی بھی کچھ وجوہات ہیں۔ اس کا

ذمہ دار یہاں کا ماضی ہے، گذرے ہوئے زمانے کی کچھ روایات ہیں ایک پوری تاریخ ہے۔ ان غلط بیانیوں پر مشتمل ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں صبر کرنا چاہیئے، تم صبر کے لئے مجبور بھی ہو اور یہ تمہارا فخر بھی ہے ـــ مجھے تمہاری رہبری پر افسوس ہے، تمہیں چاہیئے کہ یونین میں اچھے آدمیوں کو لاؤ، بے وقوفوں کو منتخب مت کرو۔ تقریریں سنکر غلط اور جذباتی فیصلہ کر ڈالنا پڑھے لکھوں کی شان کیخلاف ہے۔

اب جو کچھ ہو چکا، ہو چکا ـــ آپ کو اس کا افسوس ہوگا۔ مجھے بھی ہے۔ میں بہر حال آپ کے ساتھ ہوں اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر میرا ایک ہاتھ صحت مند نہ رہے تو دوسرے ہاتھ سے میں اسے کاٹ تو نہیں سکتا۔ یہ آٹھ سال میں نے جس ولولے اور خوش گوار انداز سے گذارے ہیں اس میں آپ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں لیکن آخر میں آپ نے مجھے دودھ دیتے دیتے اس میں مکھی بھی ڈال دی۔

میری آرزو ہے کہ آپ ہندوستان کے اچھے شہری بنیں۔ آپ کا مقام زمین پر نہیں، درخت کی سب سے اونچی چوٹی پر ہے جگہ تو چھت پر خالی ہوتی ہے نیچے تو آدمی آلودگیوں، چھوٹی چھوٹی کشمکشوں اور معمولی مسئلوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ آپ کا عزم ہونا چاہیئے کہ آپ اپنی یونیورسٹی کو ہندوستان کی سب سے اچھی یونیورسٹی بنانے سے پہلے چین نہ لیں گے۔ خدا حافظ" - [1]

---

[1] رسالہ "علیگ" ۲۵ ستمبر ۱۹۵۶ء۔

علی گڈھ سے علیحدگی

ستمبر ۵۶ء کے پہلے ہفتے میں جب ذاکر صاحب کا دوسرا ٹرم ختم ہونے میں تقریباً سوا سال باقی تھا بظاہر صحت کی خرابی اُن کے استعفے کا سبب ہوئی اور ۱۶ ستمبر کو وہ علی گڈھ سے رخصت ہو گئے۔ اس طرح ان کی زندگی میں اہم موڑ آیا۔ تعلیمی کام کا جو میدان انہوں نے اپنے لیے چُنا تھا اور جس میں زندگی کھپانے کی ٹھانی تھی آخر کار اُس سے ہٹنا پڑا۔ ایثار، عمل اور علمی لگن کی کہانی ختم ہوئی۔ کتاب زندگی کا آیندہ باب جو اگرچہ دنیاوی عروج و اقتدار کی داستان ہے مگر ہے اصل شاہراہ سے ہٹ کر۔ آپ چاہیں تو اسے ’ریٹائرڈ‘ یا آرام کی زندگی کہہ لیں۔

علی گڈھ سے علیحدگی پر تبصرے

علی گڈھ کے پندرہ روزہ رسالے علیگ نے ایک مضمون میں ذاکر صاحب کے استعفے پر تبصرہ کرتے ہوئے مبہم طور پر اُس دور کے ماحول پر روشنی ڈالی :

”ذاکر صاحب کا علی گڈھ چھوڑنا نتیجہ ہے اندرونی اور بیرونی سازشوں کا جو اُن کے خلاف تقریباً سال بھر سے پوری سرگرمی سے جاری ہیں۔ وہ علی گڈھ کو جنت بنانا چاہتا تھا علی گڈھ نے اس کی زندگی کو جہنم زار کر دیا۔ اُس نے علی گڈھ کو پھولوں کے تحفے دیئے، علی گڈھ نے اس کی جھولی میں کانٹے بھر دیئے۔ اُس نے علی گڈھ کو حیات تازہ بخشی علی گڈھ نے اس کو موت سے ہم کنار کرنے میں ساری کوششیں صرف

کردیں۔ اُس نے علی گڈھ کو اپنے خلوص اور خدمت کا جذبہ بھینٹ چڑھایا، علی گڈھ نے اُسے نفاق اور خود غرضی کے تحفے پیش کیے"۔ [۱]

آل احمد سرور صاحب کا بیان ہے کہ:

"وہ فرشتہ صفت آدمی ہیں، داؤ پیچ سے واقف نہیں۔ لوگوں نے ان کی سادگی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سے ذاکر صاحب کا کچھ نہیں بگڑا ذاکر صاحب اپنے راستے پر گامزن رہے، وہ لوگ جہاں تھے وہیں کے ہو کر رہ گئے" [۲]

یونیورسٹی پر واجب روپیہ

یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے حساب لگا کر بتایا کہ یونیورسٹی پر آپ کی بیس ہزار روپے کی رقم واجب ہے اور یہ وہ روپیہ ہے جو آپ ہر ماہ اپنی تنخواہ سے چھوڑتے رہے ہیں۔ اِدھر روپیہ لینے سے انکار تھا، یہ واپس لینے کے لئے چھوڑا ہی نہیں گیا تھا۔ اُدھر سے یہ روپیہ لے لینے پر اصرار اس لیے بھی تھا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ روایت قائم ہوئی جاتی تھی۔ غرض یہ بات چل ہی رہی تھی کہ دہلی کے ایک اسکول کی مالی پریشانیوں کا حال معلوم ہوا۔ اسکول کے اسٹاف کو چھ سات ماہ سے کچھ نہ مل سکا تھا۔ ذاکر صاحب کی سمجھ میں فوراً اس اُلجھن کا حل آگیا، وہ یونیورسٹی سے روپیہ لینے کے لیے تیار ہو گئے

---

[۱] "ملیگ"، ۱۰ ستمبر ۵۶ء۔ ص ۵

[۲] "شخصیات اور واقعات ......" ۔ ۲۰

ا ۔ یہ جون کا قول، اس اسکول کی نذر کر دیا گیا ۔ لھ

علی گڈھ میں ہاشمی نظریات کے

علی گڈھ کی الجھن ذاکر صاحب کی نظر میں

ٹکراؤ اور اس سے پیدا شدہ الجھنوں پر خود انہی کے الفاظ میں تبصرہ ایک خط میں دیکھا جا سکتا ہے جو رسالہ "دوست" کے ایڈیٹر کے نام لکھا گیا :

"میرا خیال ہے کہ علی گڈھ میں خود علی گڈھ والے علی گڈھ کی خیر خواہی کے لیئے اس پر دو قسم کے متضاد الزام لگاتے ہیں ۔ بعض خیر خواہ کہتے ہیں کہ یہ کمیونسٹوں کا اڈہ ہے ۔ دوسرے خیر خواہ کہتے ہیں کہ یہ پاکستانیوں کا اڈہ ہے ۔ سننے والے اور کان دھر کر سننے والے دونوں کو مل جاتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس اطلاع میں فرقہ داری عصبیت کو دخل ہونے کی وجہ سے کوئی مبالغہ ہے ۔ مبالغہ بلا ارادہ ہوتا ہے ۔ اسلیئے کہ ہر فریق آنکھوں پر ایک رنگین عینک چڑھا لیتا ہے جس نے سبز عینک لگائی اُسے سب سبز ہی سبز دکھائی دیتا ہے ۔ جس نے لال عینک لگائی اُسے سب لال ہی لال دکھائی دیتا ہے اور لوگ ان کے ادراک کو بڑی خوشی سے تسلیم کر لیتے ہیں " ۔

لھ یہ ذاکر صاحب کے دیرینہ خادم منظور احمد کا بیان ہے ۔ مسٹر نورانی نے لکھا ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ علی گڈھ میں غریب طلباء کے لیئے چھوڑ دیا گیا ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں رقمیں الگ الگ ہوں ۔

علی گڑھ والوں کو اس معاملے میں خود سوچنا چاہیئے کہ وہ اس طرح علی گڑھ کی خیر خواہی نہیں کرتے، اُسے اُکھاڑنے کا انتظام کرتے ہیں"۔ ؎۱

غلط افواہوں کی تردید

علی گڑھ میں "ریلیجس لیڈرز" پر ہنگامہ ہوا تو اخبارات میں طرح طرح کی غلط بیانیاں شروع ہوگئیں اور نئے سے نئے الزام علی گڑھ پر لگنے لگے۔ ذاکر صاحب کے اُس بیان سے خوب فائدہ اٹھایا گیا جس میں اُنہوں نے طلبا کے نامناسب طرزِ عمل پر اُنہیں ملامت کی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر اُنہیں پھر اِن حالات پر ۲۲ ستمبر ۵۶ء کو ایک بیان دینا پڑا:

"میں نے یونیورسٹی کے طلبا کو جو ایڈریس کیا تھا اس کے اقتباسات کی خوب اشاعت ہوئی اور مذمت کی گئی۔ اخباروں نے میری وساطت سے جو تبصرے اِن پر شایع کیئے اُن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ملک دشمن اور غیر سماجی عناصر کا ڈا قرار دیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ چند طلبا نے حال ہی میں جو مظاہرہ کیا تھا وہ دائرۂ تہذیب کے خلاف تھا۔ اُن سے مجھے جس قسم کے احترام اور اخلاق کی امید تھی، اس سلسلے میں مجھے ضرور مایوسی ہوئی اور اس کو میں اپنا فرض تصور کرتا تھا کہ اُن کے اس رویے پر مایوسی اور ناپسندیدگی کا اظہار

؎۱ 'نیا خواب' ۱۶ دسمبر ۶۲ء

کروں۔ اسی کے ساتھ میں اپنی ذاتی معلومات اور پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اس ہنگامہ آرائی میں حصہ لینے والے چند طلبار کے اخلاق واطوار کے علاوہ عام طور پر طلبار اخلاق واطوار کے اچھے ہیں اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے کہ علی گڈھ کے طلبار ہندوستان کے بہترین طلبار میں سے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں ہندو مسلم سکھ طلبار آپس میں بڑے میل جول سے اتحاد کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کتاب پر حالیہ مظاہرے میں وہ مسلمان طلبار کے ساتھ تھے "۔ [1]

علی گڈھ کو کیا دیا

سرور صاحب کا کہنا ہے کہ:

"انہوں نے جس طرح علی گڈھ کی اس وقت مدد کی جب اس کا وجود خطرے میں تھا اُسے قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی" [2]

یونیورسٹی کی ہر پہلو سے ترقی اور اصلاح کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ جن حالات میں ذاکر صاحب نے کام کیا۔ انتشار کے سامنے جس یکسوئی اور پامردی کا ثبوت دیا۔ بے سمجھی اور تعصب کا مقابلہ جس صبر سے کیا تیرگی میں آزادی فکر کا چراغ روشن کر کے جو وسعت نظر پیدا کی۔ بے بسی اور بے وسیلگی کے عالم میں جس ہمت اور عزم سے خدمت

---

[1] "الجمعیۃ" ۲۳ ستمبر ۵۶ء

[2] "شخصیات اور واقعات" ۔ ۲۰

کی اُسے ہمیشہ احسان مندی سے یاد کیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ یہ اقرار یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ (۱۹۵۷ئہ) میں اس طرح کیا گیا ہے:

"اُنہوں نے دلیری سے حالات کا مقابلہ کیا، اپنے اعتماد اور اپنے ساتھیوں اور طلبار کے پکے عقیدے کے ساتھ اس ناؤ کو بھنور سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ مقصد کی لگن، تعلیمی مسائل پر گہری نگاہ، ٹیچرز اور طلبار کی مشکلات پر ہمدردانہ غور وفکر اور تمام مسئلوں میں انسانی نقطۂ نظر رکھنے کی بدولت وہ یونیورسٹی کے طلبار اور اسٹاف کے لیئے جوش وخروش اور اُمنگ کا وسیلہ بنے رہے .... کونسل انتہائی محبت اور احسان مندی سے ہمیشہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی بے پایاں خدمات کو یاد رکھے گی اور ان کے نظریات کی کامیابی کے لیئے انتھک جد وجہد جاری رکھے گی"۔

یونیورسٹی کے چانسلر سیدنا طاہر سیف الدین کا خیال:

"یونیورسٹی کے لیئے ان کی ذات پچھلے دس سال میں طاقت و قوت کا مینارہ بنی رہی ہے اور یونیورسٹی کی تاریخ کے انتہائی نازک اور مشکل دور میں اس کے وائس چانسلر کی حیثیت سے وہ اس عظیم ادارے کو درست راہ پر ڈالنے میں کامیاب ہوئے"۔

'مسلم یونیورسٹی گزٹ' کے ذاکر نمبر سے چند سطریں:

"اساتذہ کی ہمت بڑھائی، اُن میں حریتِ فکر اور علمی تحقیق و تدقیق کا ذوق پیدا کیا۔ طلبار کو علم کی لگن، قوم کی خدمت اور

ملک سے محبت سکھائی - علی گڈھ کو علمی دنیا میں جگہ دلائی - ملک پر علی گڈھ کی اہمیت واضح کی اور علی گڈھ کو ملکی مفاد کی راہ پر چلنا سکھایا...... ہماری ذہنی و عملی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس میں اُن کی پُرسوز شخصیت کا نقش نہیں" -

یونیورسٹی کے ایک طالب علم کے خیالات :

"ذاکر صاحب کے علی گڈھ آنے سے پہلے طلبا کو تقریر و تحریر کی آزادی کم تھی، پابندیاں اور سختیاں زیادہ تھیں جن کا ردِ عمل کبھی کبھی کافی خطرناک شکل اختیار کر جاتا تھا ذاکر صاحب کے آنے کے بعد طلبا کو ہر قسم کے سیاسی، مذہبی اور ادبی خیالات، عقائد و رجحانات کے اپنانے اور پھیلانے کی پوری پوری آزادی میسر آسکی...... اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ جب سے اب تک کوئی ایسا ناخوشگوار حادثہ پیش نہیں آیا...... اور کیا یہ ذاکر صاحب کی کی خوددار شخصیت کا پرتو اور انتھک کوششوں کا نتیجہ نہیں کہ علی گڈھ آج ہندوستان کی قومی زندگی اور اس کی مشترک تہذیبی اور تمدنی روایات کی نمایندگی میں قیادت کر رہا ہے" [۱]

انگریزی کے معیاری رسالے 'لنک' نے لکھا :

" اُن کی زبردست قیادت میں علی گڈھ یونیورسٹی نے قومی

---

[۱] 'علی گڈھ میگزین' مجاز نمبر ۱۸۲ - ۱۸۱

زندگی میں نیا وقار حاصل کیا" [1]

ڈاکٹر تاراچند کی رائے:

"زخموں کے منھ بند ہو گئے اور امید کی شعاعوں نے اُن راستوں کو منور کر دیا جو روشن مستقبل کی طرف جاتے ہیں۔ اس ساری تبدیلی کے روحِ رواں تھے ذاکر حسین۔ یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر" [2]

سب سے زیادہ ضروری اور سب پر بھاری ہیں رشید صاحب کے الفاظ:

"ذاکر صاحب نے جب اس ادارے کا کام سنبھالا تو اس کی شہرت مجروح اور عام فضا مکدّر ہو چکی تھی، ایسی مجروح اور مکدّر جیسی پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی نہ سنی۔ اور جب یہاں کا کام چھوڑا تو یونیورسٹی کی شہرت بحیثیت یونیورسٹی کے دُور دُور ملکوں تک پہنچ چکی تھی اور اس کی ظاہری شکل وصورت ہر اعتبار سے پہلے سے بدرجہا بہتر ہو گئی تھی، جس کو ایک اجنبی بھی یونیورسٹی کے حدود کے اندر قدم رکھتے ہی محسوس کر لیتا تھا۔ ..... میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی کے ہر چھوٹے بڑے پر ذاکر صاحب کا بحیثیت مجموعی جتنا اچھا اور دیرپا اثر پڑا ہے، کسی دوسرے کا اُن سے قبل نہیں پڑا تھا" [3]

یونیورسٹی کے ایک ترجمان رسالہ "علیگ" کا تبصرہ:

---

[1] "لنک" ویکلی ۱۳ مئی ۶۲ء۔ [2] " نذرِ ذاکر" — ۱۱

[3] "مسلم یونیورسٹی گزٹ" ذاکر نمبر۔

"ذاکر صاحب نے اس ادارے کو نئی زندگی، نیا موڑ اور نیا ذہن دیا۔ سوچنے کا نیا جاندار انداز دیا۔ خلوص، محبت اور بے لاگ سماجی خدمت کا سبق ذہنوں میں رچایا۔ چھوٹے پیمانے پر علی گڑھ کو آزاد ہندوستان کا نمونہ فرض کرکے اس میں کام کرنے کا اسلوب سکھایا۔ ایثار، ہمدردی، کسی چیز میں ٹیڑھ نہ برداشت کرنے کی عادت، سچ کی خاطر سب کچھ تج دینے کا جذبہ، موت کو زندگی میں تبدیل کر دینے کا ولولہ، دوسروں سے بڑھ چڑھ کر کام کرنے کی لگن، سلیقے اور عزت سے جینے کی امنگ اور ناممکن کو ممکن بنا دینے کا حوصلہ دیا ..... اس تاریخی ادارے کو دوسرا جنم دیا اور چند برسوں میں اتنا کچھ کر دیا جو پہلے جنم میں آدھی صدی میں کبھی نہ ہو پایا تھا"[1]

چنانچہ یونیورسٹی کی اُس دور کی سرگرمیوں کا ایک سرسری خاکہ رشید صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"درس و تدریس کا کام زیادہ دل سوزی اور یک سوئی سے ہونے لگا۔ لیبوریٹریوں کے لئے ضروری اور جدید آلات فراہم کیئے گئے۔ اساتذہ کی بڑی تعداد کو تعلیمی رخصت دے کر باہر بھیجا گیا..... سنجیدہ تصنیف و تالیف اور توسیعی خطبات کا بڑے پیمانے پر انتظام ہوا۔ طلبار کی اقامتی زندگی اور سرگرمیوں کو زیادہ

---

[1] 'علیگ'، ۱۰ ستمبر ۱۹۵۶ء

بامقصد، دل چسپ اور راحت رساں بنانے پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ حفظانِ صحت کی تدابیر کو وسیع پیمانے پر نافذ کیا گیا۔ خوب صورت، کارآمد اور ضروری عمارتیں تیار ہوئیں۔ یونیورسٹی کے خطے کو صحت بخش اور دل کشا بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر چمن بندی کی گئی اور باغات لگائے گئے، اُفتادہ زمینوں میں کاشتکاری شروع کی گئی۔ باہر کی علمی دنیا سے بہتر روابط قایم کیے گئے۔ دینیات اور اسلامیات کے نصاب پر مستند علمائے سے نظر ثانی کرائی گئی اور اس کی خاطر خواہ تعلیم کا بندوبست ہوا۔ اسلامی علوم کے مطالعے اور تحقیق کے لیے ادارہ علوم اسلامیہ قائم کیا، شعبہ تاریخ میں ازمنہ وسطیٰ کی تحقیق و تدوین کے لیے ایک مستقل شعبۂ تصنیف و تالیف کھولا۔ قومی زبان کی توسیع و ترقی کے لیے بی اے اور بی ایس سی کی سطح پر لازمی اُردو اور ہندی کا مناسب و معتبر نصاب رائج کیا۔ نوجوان طالب علموں کی بہتر مجلسی تربیت کے لیے یونیورسٹی یونین کے قواعد و ضوابط میں ایسی اصلاحات اور اضافے کیے گئے جن سے اس کا کیریکٹر زیادہ سے زیادہ جمہوری اور نمایندہ ہوگیا ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' کی اسکیم منظور کرائی ......بورڈنگ اور کامن روم کی سرگرمیوں کو زیادہ باقاعدہ بنایا۔ یونیورسٹی ہسپتال اور ہیلتھ سروس کے کاموں کو وسیع تر اور منظم کیا اور لائق طبی عملہ

فراہم کیا۔ جن سے بحیثیت مجموعی طبی سہولتوں میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ طبیہ کالج کے نصاب میں مفید اور دوررس تبدیلیاں کی گئیں اور اس کے انتظام و انصرام کو زیادہ وسیع اور مستحکم بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ مجوزہ میڈیکل کالج کے قیام کی اسکیم کے لیئے حکومت کی باقاعدہ منظوری اور اعانت حاصل کی۔ امراض چشم کی مخصوص تعلیم اور تحقیقات کے لیئے انسٹی ٹیوٹ کھولا۔ یونیورسٹی کے املاک و آراضی کا باضابطہ ریکارڈ تیار کرایا اور اُن میں اضافے کیئے۔ لائق اساتذہ، طالب علموں اور اہل علم کی نہ صرف ذاتی طور پر ہمت افزائی کی بلکہ ان کے کاموں کے لیئے کثیر رقمیں حکومت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے فراہم کیں۔ ذاتی اثر و اعتبار سے جتنے کثیر عطیات حاصل کیئے اس سے پہلے اتنے مختصر عرصے اور کُلیتہً بدلے ہوئے حالات میں شاید ہی کبھی جمع کیئے گئے ہوں۔ کیمپس کی آیندہ اور موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر تفصیلی منصوبہ مرتب کیا گیا ...... لائبریری، آرٹ فیکلٹی، جیالوجی اور فزکس کے لیئے نئے معمل، پالی ٹیکنک اور انجینیرنگ کالج میں بڑے پیمانے پر ترمیم و توسیع، یونیورسٹی ہسپتال کی عمارت میں اضافہ اور ضروری ردّ و بدل، یونین کی عمارت کی توسیع وغیرہ جن کی تکمیل بعد میں ہوتی رہی اُن کا نقشہ اور اُن تعمیر کے لیئے ضروری رقم کی منظوری یہ سب ذاکر صاحب کے عہد میں طے پاچکے تھے" [۱]

---

[۱] "نذرِ ذاکر" - ۴۰

قہر و غضب سے مسلمانوں کو بچانے اور آیندہ رونما ہونے سے روکنے کی تدبیر سرسید نے یہ سوچی تھی کہ ان کو انگریزوں کا زیادہ سے زیادہ وفادار ثابت کیا اور بنایا جائے۔ اس غرض سے انہوں نے مختلف کتابیں بھی لکھیں اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم و تربیت دینے کے لیے علی گڑھ میں ایم اے او کالج کی (۱۸۷۵ء) بنا ڈالی جسے حکومت کی سرپرستی اور انگریز حاکموں کی سربراہی پوری طرح نصیب تھی، مالی امداد بھی دل کھول کر کی گئی چنانچہ دس ہزار روپیہ تو صرف لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے عطا فرمایا[1]۔ یہ سب کچھ مسلمانانِ ہند کی "خیر خواہی" میں نہیں تھا بلکہ کچھ خاص مقاصد تھے۔ سرسید جواب سے پہلے تک ہندوستانیوں کی ترقی و بھلائی کے لیے کام کرتے رہے، اب صرف مسلمانوں کی تعلیم اور تنظیم کی طرف آرہے تھے، قومی راہوں سے اُن کو بچانے کی کوشش اور ہندوؤں سے ملنے کی ممانعت فرمارہے تھے۔ بڑی اچھی اور مفید تھی یہ بات، بڑے دور رس نتیجے نکلنے والے تھے اس "مبارک" اقدام سے اور حکومت کے لیے تو اندھا اور دو آنکھیں والا حساب کتاب تھا۔

---

[1] "موجِ کوثر": ۴۷، تاریخ مدرستہ العلوم علی گڑھ از پروفیسر تھیوڈور مارسین۔ رسالہ علیگ، ۱۵ اکتوبر و ۱۰ نومبر ۲۵ نومبر و ۱۰ دسمبر ۱۹۵۶ء

علی گڑھ کی تحریک کی مخالفت شروع ہی سے مسلمانوں کے ممتاز، سنجیدہ اور دانش ور طبقے کی طرف سے برابر ہوتی رہی۔ مقتدر علمائے کرام کے علاوہ مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر، مولوی بخش علی سب جج، اکبر الہ آبادی مولانا شبلی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی اسی صف میں آتے ہیں لیکن یہاں اس غلط فہمی کا دور کر دینا ضروری ہے جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے کہ علمائے انگریزی تعلیم سے دشمنی کے جوش میں سر سید کی مخالفت کی۔ اس کی تردید میں ہم یہاں ایک پاکستانی مصنف کے قول پر اکتفا کریں گے:

"ہم نے سر سید کے موافق اور مخالف تحریروں کا مطالعہ کیا ہے ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے اور علمائے اسلام کے ساتھ صریحی ناانصافی ہے"۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر مخالفت کیوں ہوئی؟۔ اس کی بھی ایک وجہ انہی سے سن لیجیے:

"اس لیے ہوئی کہ اس کی بنا میں سر سید کا ہاتھ تھا اور سر سید اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنہیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے" [۱]

یہاں اس بحث کا موقع نہیں لیکن یہ بیان البتہ بے محل نہ ہوگا کہ جہاں

---

[۱] شیخ محمد اکرام: موجِ کوثر۔ ۷۶

اس تحریک سے مسلمانوں کو جہاں دنیاوی فائدے ہوئے وہاں نقصان بھی پہنچے۔ ان میں سے کچھ کی نشان دہی تو "موج کوثر" کے مصنف نے بھی کی ہے :

"علی گڈھ کالج نے نہ تو کوئی حالی یا شبلی پیدا کیا اور نہ کوئی قابل ذکر علمی روایات قایم کیں ..... سرکاری ملازمت کو علی گڈھ کا اہم ترین عملی مقصد بنانے کا بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک پست درجے کی مادیت اور شیئیت پسندی پیدا ہوگئی ..... حقیقی یا خیالی ضروریات نے مطمح نظر کو محدود کر دیا اور روحانی کمزوری سے کیریکٹر پست ہوگئے ..... وہ مطمح نظر کی پستی اور کیریکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پُرزے بن جائیں" [1]

اس کے مقابلے میں ذاکر صاحب کی عملی تحریک کا ہم اِن صفحات میں جائزہ لے چکے ہیں جس میں نئے اور پرانے نقوش سے جامعہ کا خاکہ انہوں نے تیار کیا، اُس کی کامرانیوں کا حال بھی ہماری نظروں سے گذر چکا ہے اور یہ بھی کہ ملک کے کسی گوشے سے کبھی جامعہ کی مخالفت نہیں ہوئی۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں :

"اُنہوں نے مغرب کی حکمت اور مشرق کے سوز دروں کو اپنی شخصیت میں اس طرح سمو لیا کہ ہر سیاسی دور کے لئے آبِ حیات

---

[1] "موج کوثر" / ۱۵۲ — ۱۵۰

بن گئے۔ وہ فکر کی بلندی اور علم کی رفعت کے ساتھ عمل کی راہ
کو ہموار کرنے اور جامعہ کو قبول عام کی سند عطا کرنے میں کامیاب
ہوئے" [۱]

اور "موجِ کوثر" کے پاکستانی مصنف کا اعتراف بھی دیکھئے:

"جامعہ میں کئی امتیازی باتیں ایسی ہیں جن کی اہمیت شاید
سرسید نے بھی محسوس نہ کی ہو"

چنانچہ اس مصنف کے خیال میں وہ خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ اساتذہ کا ایثار و قربانی
۲۔ طلباء اور اساتذہ کی سادہ زندگی
۳۔ صنعت و حرفت کی تعلیم
۴۔ یہاں کی علمی زندگی

اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ "قوم کی اہم ترین تعلیمی درس گاہ ہونے کے باوجود علی گڑھ اشاعت علم و ادب کا مرکز نہ بن سکا اور وہاں تصنیف و تالیف کا کوئی ادارہ قائم نہ ہوا۔ جامعہ اس طرف خاص طور پر متوجہ ہے" [۲]

سرسید کا دور ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ تھا اور ذاکر صاحب کو علی گڑھ میں ۱۹۴۷ء کے بعد کا عہد ملا۔ دونوں وقتوں کی نزاکت ظاہر

---

[۱] "شخصیات اور واقعات ....." - ۲۰
[۲] "موجِ کوثر" / ۱۶۱

ہے۔ہاں یہ اندازہ البتہ دشوار ہے کہ وہ عہد زیادہ نزاکتیں اور خطرناکیاں اپنے دامن میں لے کر آیا تھا یا یہ دور اپنے پیچھے لا رہا تھا۔ رشید صاحب کا اندازہ تو یہ ہے کہ :

"سرسید نے ہندوستان میں دوسرا اسپین اسٹیج ہونے کا سدباب کیا۔ ذاکر صاحب نے شاید تیسرا..... میں نے سرسید کا عہد نہیں دیکھا لیکن ذاکر صاحب کی زندگی اور اُن کا زمانہ پورے طور پر نظروں کے سامنے رہا۔ اس سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ سرسید پر کیا عالم گذرا ہوگا...... میں نے ذاکر صاحب کا عہد نہ دیکھا ہوتا تو سرسید کا اتنا قائل نہ ہوتا جتنا کہ اب ہوں" [۱]

مختصر یہ کہ اس طرح :

"اُنھوں نے ایک درس گاہ کو نہیں بلکہ ایک تہذیب کو تباہ ہونے اور ایک روایت کو رسوا ہونے سے بچا لیا۔ یہ کام آسان نہ تھا.... علی گڈھ کی آبادکاری میں ذاکر صاحب کو جن دِقتوں اور نزاکتوں کا سامنا رہا اور جن پر اُنھوں نے جتنے کم عرصے میں خاموشی اور خوب صورتی سے قابو پا لیا وہ ایک ایسی داستان ہے جو شاید کبھی لکھی نہ جا سکے لیکن عوامی گیتوں کی طرح ہمیشہ یاد رکھی جائےگی" [۲]

---

[۱] [۲] "آشفتہ بیانی" - ۵۴ - ۶۳

باب ۶

علی گڑھ کے بعد

علی گڑھ سے علیحدگی تعلیم، حرکت اور عمل کے میدان سے علیحدگی تھی، زندگی کا یہ موڑ نہ صرف خود ذاکر صاحب کے لیئے تکلیف دہ تھا بلکہ ان کے مخلص احباب، ساتھیوں اور علی گڑھ کے خیر خواہوں کے لیئے بھی دلی تکلیف کا باعث تھا۔ بعض قریبی احباب نے تو اُنہیں اس پر خطوط بھی لکھے کہ ایسے وقت میں جبکہ علی گڑھ اور مسلمانانِ ہند کے لیئے اُن کی رہنمائی سب سے زیادہ ضروری تھی وہ اس سے کنارہ کش ہو کر یونیورسٹی کی ناؤ منجدھار میں چھوڑ رہے ہیں مگر گرتی ہوئی صحت اور حالات کی الجھنوں نے اُن کے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ نہ اپنا فیصلہ بدل سکے اور نہ اپنے

مخلص احباب کو یہ بتا سکے کہ وہ آخر کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ رشید صاحب نے ایک ملاقات کے دوران فرمایا کہ "میں اُس زمانے میں بیمار تھا اور اسی لیئے ذاکر صاحب سے نہ پوچھ سکا کہ یہ چند مہینے (جو اُن کا ٹرم ختم ہونے میں باقی تھے) آخر کس قیامت کے تھے جو اُنہیں علی گڈھ میں بتانا دشوار ہو گئے۔ ایک خط میں البتہ میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ کم از کم یہ تو بتا دیجیئے کہ ہم کس طرح آپ کا دفاع کریں اور کہاں سے دلیل ڈھونڈ کر لائیں آپ کی اس بے وقت اور اچانک علیحدگی پر"۔ ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ اس علیحدگی کے بعد وہ صرف ایک بار کانوکیشن ایڈریس پڑھنے علی گڈھ آئے اور پھر ایسا لگتا ہے کہ روح و دل کا یہ دیرینہ لگاؤ بالکل ہی ختم ہو گیا کیونکہ جب علی گڈھ پر نازک وقت آیا تو پُر امید نظریں فطری طور پر ذاکر صاحب کی طرف اُٹھیں اور مایوس لوٹیں

علی گڈھ میں کانوکیشن

اگلے ہی سال اُنہیں علی گڈھ میں کانوکیشن ایڈریس پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ کانوکیشن ۲۸ جنوری ۱۹۵۸ء کو تھا۔ ذاکر صاحب آج علی گڈھ میں بطور مہمان کے آئے تھے۔ خوشی کے شادیانے بجے، یونیورسٹی گزٹ کا ذاکر نمبر نکلا اور طلباء نے سواگت کے ترانے گائے:

همسرِ سلسلۂ دیدہ وراں آیا ہے
زینتِ محفلِ صاحب نظراں آیا ہے
مردِ دانا، ہمہ داں، روحِ رواں آیا ہے
نازشِ عہد و عزیز از دل و جاں آیا ہے

اس موقعے پر انھوں نے ایڈریس پڑھا تو زندگی کے ابتدائی دور سے آج تک کی تصویر آنکھوں کے سامنے محسوس کی۔ یونیورسٹی سے اپنی وابستگی اور پھر علیحدگی کا بھی ذکر کیا:

"امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سر شوریدہ کو یہیں بالین آسایش نصیب ہو جائے گی، مگر یہ مقدر نہ تھا۔ صحت کی خرابی فرائض کی انجام دہی میں مخل ہوتی رہی، بالآخر محبت پر ذمہ داری کے احساس نے غلبہ پایا اور میں آپ سے رخصت ہو گیا۔ آج کہ کاسۂ دل جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے، اُس پر جو یہاں سے پایا شکر گذاری سے بھرا ہے اور اُن تمام کوتاہیوں پر جو اِس دانش گاہِ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے۔ میرے لیے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی سب سے بڑا انعام ہے۔ آپ اس نئے اعزاز کا اضافہ کر رہے ہیں"۔

یونیسکو کانفرنس

علی گڈھ سے علیحدگی کے بعد جلد ہی مولانا آزادؒ نے ان کو یونیسکو کانفرنس (دہلی) کے ہندوستانی وفد میں شامل کیا۔ مولانا اگرچہ خود اس وفد کے لیڈر تھے مگر در اصل وفد کی سربراہی ذاکر صاحب نے ہی انجام دی اور یونیسکو اگزیکیٹو بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے۔ عرب ملکوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لیے یونیسکو کی طرف سے قاہرہ میں جو کانفرنس ہوئی اُس میں اُنھوں نے ماہر تعلیم کی حیثیت سے یونیسکو کی نمایندگی کی۔ اس سلسلے میں اگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ

میں پیرس جانا پڑا جہاں چھ ہفتے قیام کرنا تھا۔ اسی دوران میں وہ جرمنی چلے گئے اور اپنے علاج کی طرف بھی توجہ کی۔

گورنر بہار ابھی جرمنی اور سوئزرلینڈ وغیرہ میں ہی تھے کہ پنڈت نہرو نے خط لکھا جس میں اصرار کر کے بلایا تھا کہ وہ بہار کی گورنرشپ کا چارج لے لیں اور اب انکار ہرگز نہ کریں۔ لہ

مئی ۱۹۵۷ء میں گورنر بہار کی حیثیت سے ان کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے جولائی میں چارج لیا۔ اس سے پہلے اسی درمیان میں ایک بار مولانا آزادؒ نے بھی یہ منصب اُن کے لئے تجویز کیا تھا۔ مگر انہوں نے منظور نہ کیا تھا۔

تعلیمی مسئلے تعلیمی میدان سے اب لگاؤ بس اتنا ہی تھا کہ کسی تقریب کا افتتاح یا کانوکیشن کے موقعے پر ان مسائل پر تبصرہ اور ان اُلجھنوں پر اپنی رائے ظاہر کرتے رہے۔ اس دوران میں متعدد تقریریں اور ایڈریس تعلیمی موضوع پر بہترین اور عالمانہ انداز فکر و نظر کا ذخیرہ ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی تقریر علی گڈھ کا خطبۂ صدارت ہے

لہ ملاحظہ ہو:

"نذرِ ذاکر" ۴۸ - ۴۱

"ڈاکٹر ذاکر حسین" (مرتبہ اعظمی) : ۳۸

مسٹر نورانی کی انگریزی کتاب : ۸۲ - ۸۱

جس میں تعلیم، امتحان اور نصاب وغیرہ کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد پٹیل میموریل لکچرز (دسمبر ۱۹۵۸ء) ہیں جو کتابی صورت میں بھی شایع ہوئے، اُردو ترجمہ بھی "ہندوستان میں تعلیم کی ازسرنو تنظیم" کے عنوان سے ہوا ہے۔ پھر ماولنکر میموریل لکچر (۲۰ فروری ۱۹۶۰ء احمد آباد) بھی "ایتھکس اینڈ دی اسٹیٹ" (Ethics and the State) کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپا ہے۔ اس کے علاوہ اس عرصے میں مختلف یونیورسٹیوں میں کانوکیشن ایڈریس پڑھنے کے لئے بھی بلایا گیا اور مختلف تاریخوں میں یہ ایڈریس دیئے:

۱۔ "قومی تعلیم قومی کنٹرول میں"۔ جادؤپور یونیورسٹی ۲۴ دسمبر ۱۹۵۷ء
۲۔ "تعلیم اور اُس کی اُلجھنیں"۔ لکھنؤ یونیورسٹی ۲۸ جنوری ۱۹۵۸ء
۳۔ "فرد کا روحانی ارتقا" کلکتہ یونیورسٹی ۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء
۴۔ "نوجوانوں کے چار اہم مقاصد" اتکل یونیورسٹی ۶ دسمبر ۱۹۵۹ء
۵۔ "غیر محدود دماغی آزادی" پنجاب یونیورسٹی ۱۷ دسمبر ۱۹۶۰ء
۶۔ وشوا بھارتی یونیورسٹی ۲۳ دسمبر ۱۹۶۰ء
۷۔ "ہماری تعلیم کا اہم کام" کیرالہ یونیورسٹی ۸ نومبر ۱۹۶۱ء
۸۔ "تعلیم کے لیے کام"۔ شری راما کرشنا مشن ودیالیہ کوئمبٹور ۱۱ نومبر ۱۹۶۱ء
۹۔ "سماجی بھلائی کے لیے صنعتی تعلیم" آئی۔آئی۔ٹی کھڑگپور ۱۰ مارچ ۱۹۶۲ء
۱۰۔ "صحیح مثالی یونیورسٹی" جموں کشمیر یونیورسٹی ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء
۱۱۔ "کھیتی باڑی اور ریسرچ میں تعلق" انڈین ایگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۲۲ دسمبر ۱۹۶۲ء

۱۲ - "بامقصد تعلیم" رُورل انسٹی ٹیوٹ گاندھی گرام ۲۸ دسمبر ۶۲ء

یہ ایڈریس کتابی صورت میں "ڈائنمک یونیورسٹی" (Dynamic University,) کے عنوان سے چھپے ہیں۔ اِن خطبات میں اُنہوں نے ایک مثالی اور متحرک یونیورسٹی کے کردار کو واضح کیا ہے اور ساتھ ہی موجودہ تعلیم کی خرابیوں کی جانب بھی اشارے کیئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جمہوری سماج کے مسئلے ہماری تعلیم گاہوں کے لیئے چیلنج ہیں اور ہمارے دانش وروں کو ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب یونیورسٹی میں ہمارے نوجوان تحقیقی اور تنقیدی جذبے کے ساتھ علم حاصل کریں اور اس طرح ان کی تحقیق و دریافت کی عملی قابلیت بروئے کار آئے۔ یونیورسٹیوں کو لازم ہے کہ اجتماعی زندگی سے ہم آہنگی کا سامان مہیا کریں اور ایسا معاشرہ بنانے کی کوشش کریں جس میں اچھے افراد جنم لے سکیں۔ ذاکر صاحب نے واضح کیا ہے کہ تعلیمی اعتبار سے ہماری یونیورسٹیوں کو زیادہ تخلیقی ہونا چاہیئے تاکہ نوجوانوں کے ذوقِ جستجو کا سامان مہیا ہو۔ نئی چیزوں کی کھوج کی فطری قابلیتیں اگر سرد پڑ جائیں تو تمام علوم وفنون کی تعلیم نہ صرف بیکار رہے بلکہ نقصان کا باعث بھی ہے اس لیئے علم کے ساتھ عمل اور تحریک کا اشتراک نہ صرف ابتدائی تعلیم میں ضروری ہے بلکہ اونچی تعلیم میں بھی ہمارے پیش نظر ہونا چاہیئے کیونکہ نوجوانوں میں اگر جستجو، کھوج اور دریافت کی خلش پیدا نہ ہو تو تعلیم محض بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

گورنر بہار کا رہن سہن

گورنر کی حیثیت سے قیام تو پٹنہ کے راج بھون میں رہا اور رہن سہن میں سادگی بدستور۔ ایک بار کسی تہوار کے موقعے پر راج بھون کے عملے کو دعوت دی تو وہاں کے چھوٹے سے چھوٹے ملازموں تک کو دعوت نامہ پہنچا اور تقریب ختم ہونے پر ذاکر صاحب نے سب سے ہاتھ ملاکر شکریہ ادا کیا۔ بہار والوں کے لیے یہ بات اتنی عجیب تھی کہ اس کا وہاں آجتک چرچا ہے لے یہی وجہ ہے کہ جب بہار سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو راج بھون کے ایک ملازم (باڈی گارڈ) نے روتے ہوئے کہا کہ بھائی صاحب ذاکر حسین جیسا مہان گورنر ہم نے نہیں دیکھا۔ آپ کے ساتھ رہنے پر ہمیں ایسا لگتا تھا کہ جیسے گورنر تو ہم ہیں اور ذاکر صاحب ہمارے انگ رکشک (باڈی گارڈ) ہیں" ٢ە

اسی زمانے میں ایک بار مولانا عبد الماجد دریابادی گورنر بہار کے مہمان ہوئے (اگست ستمبر ۱۹۵۸ء) اسٹیشن پر گورنر کا اے۔ ڈی۔ سی کار لے کر انہیں لینے گیا لیکن مولانا کار ہی دیکھ کر حیران ہیں، کہتے ہیں کہ:

"یہ کار باوجود اعلیٰ درجے کی ہونے کے نکلی کچھ عجیب سی، بیٹھتے ہی نظر اس پر پڑی کہ ہر طرف سے کچھ بند سی ہے یعنی اس کے

لے یادوں کی دنیا - ۱۵۳

٢ە پاٹھک: اُپ راشٹرپتی ذاکر حسین (ہندی)

شیشوں پر سامنے اور پیچھے اور بازوؤں پر ریشمی پردے کچھ
اس طرح پڑے ہوئے ہیں کہ ہٹانے سے بھی پوری طرح نہیں
ہٹتے !۔ یہ کیا ماجرا ہے ؟ اے ۔ ڈی سی صاحب نے معمہ یوں حل
کیا کہ گاڑی خود صاحب کی نہیں بلکہ ان کی بیگم صاحبہ کی سواری
کی ہے ...... کہاں پشتینی پردہ نشینوں کی بے پردگی اور کہاں
یہ گاڑی جو مردوں تک کو پردہ نشین بنا دے ۔ دل اس عالی ہمت
خاتون کی اسلامیت پر عش عش کر گیا ” [1]

راج بھون کے اسی مہمان کی زبانی ایک منظر اور اس موقعے کا دیکھ لیجیے :

”شب کے کھانے کا وقت آٹھ بجے کا مقرر تھا اور واپسی جب ہوئی
تو وقت دو چار منٹ نہیں ، کہیں زیادہ گذر چکا تھا اور اب کیا کہا
جائے کہ کتنی ندامت اُس وقت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ معزز میزبان
اِس لاابالی اور بے فکرے مہمان کے انتظار میں اب تک اپنا ہاتھ
روکے ہوئے ہیں ۔ علی الخصوص اس حال میں کہ علالت کے باعث
کھانے پینے کے اوقات کی پابندی اُن کے لیے اور زیادہ موکد ہو چکی
ہے “۔

ویسنہ کا دورہ

جنوری ۱۹۵۸ء میں جب ذاکر صاحب ویسنہ (بہار) گئے اور کتب خانہ وغیرہ دیکھا تو یہاں

---

[1] ' صدق جدید ' ۸ ستمبر ۱۹۵۷ء

تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "جن لوگوں نے میری زندگی کو سنوارنے میں صحیح مشورے دیئے اُن میں سید سلیمان ندوی مرحوم بھی تھے جنہیں میں اپنا شفیق بزرگ مانتا ہوں۔

بہار قانون ساز اسمبلی کو خطاب

گورنر بہار کی حیثیت سے ہر سال بہار لیجس لیچر اسمبلی میں ایڈریس دیئے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۵۸ء میں صوبے کے مختلف حالات اور حکومت بہار کے اقدامات پر روشنی ڈالی کوسی پروجیکٹ کا ذکر کیا اور آیندہ کے پروگراموں اور پلان کا خاکہ پیش کیا۔

۵ر فروری ۱۹۵۹ء کو اپنے ایڈریس میں زراعت اور کھیتی باڑی کی حالت بہتر بنانے پر زور دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ پیداوار بڑھانے کے لیے ہم سب کو مسلسل محنت اور لگن سے کام کرنے کی ضرورت ہے قومی تعمیر و ترقی کے خواب صرف اُسی وقت پورے ہوں گے جب ہم ہر ممکن طریقے سے زراعتی پیداوار کو بہتر بنانے میں لگ جائیں۔

۳ر فروری کو ایڈریس دیتے ہوئے بہار میں غلّے کی بڑھتی ہوئی پیداوار کے اعداد و شمار پیش کر کے بتایا کہ ۱۹۵۸-۵۹ء میں اناج کی پیداوار پچھلے تمام سالوں سے بہتر یعنی ۶۶۸۶۰۰۰ ٹن رہی۔ اس کے بعد سیلاب کی روک تھام کے اقدامات، اسٹیل پلانٹ اور بھاری صنعتوں کے قیام اور تعلیم کے متعلق موجودہ پوزیشن بیان کی

۶ر فروری ۱۹۶۱ء کو اپنے خطاب میں بتایا کہ ۱۹۶۰ء کے دوران بہار

قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ غذائی حالت بہت بہتر ہو گئی، خریف کی فصل پچھلے تین سال کی بہ نسبت ۲۲ فیصدی بڑھی اور ربیع ۱۲ فیصدی۔ اسی طرح تعلیمی میدان میں بھی ترقی ہوئی۔

۱۶ مارچ ۶۲ء کو تیسرے پانچ سالہ پلان کے لئے تمام ممکن ذرائع کو استعمال میں لانے پر زور دیا اور کہا کہ آنے والے سال اب سے زیادہ محنت، قربانی اور لگن کے دَور ہوں گے۔

تیسرے الکشن کے بعد

فروری ۶۲ء میں تیسرے جنرل الکشن کے نتیجے نے اگرچہ کانگریس کو ایک بار پھر غالب اکثریت سے حکومت بنانے کا موقعہ صوبوں اور مرکز میں دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فرقہ پرست طاقتوں کو پہلے سے بہتر پوزیشن میں لاکر چھوڑا۔ راج دھانی کے معیاری رسالے 'لنک' (۱۱ مارچ ۶۲ء) نے اس طرف سب سے پہلے توجہ دلائی کہ:

> "تیسرے جنرل الکشن میں ہندو فرقہ پرستی ایک طاقت کے روپ میں اُبھر کر سامنے آئی ہے جسکو شکست دینے کے لئے سیکولر جماعتوں کو ایک ہو جانے کی ضرورت ہے اگرچہ اس گروہ کے زیادہ تر لیڈر اپنے نیشنلسٹ حریفوں سے مات کھا گئے ہیں"۔

اِن جماعتوں کی پوزیشن بہتر ہو جانے کا کارن یہ تھا کہ انہوں نے بھولے اور جاہل عوام کے سامنے (خصوصاً دیہات میں) گائے کی حفاظت کے راگ الاپے، کانگریس کی بدعنوانیوں کو دس سے ضرب دے کر سامنے

رکھا اور مسلمانوں کے آگے حکومت کے گھٹنے ٹیک دینے کی کہانیاں سُنا کر ہندو دھرم خطرے میں ہونے کی دہائی دی[1] ۔ یہ تمام ہتھیار نہایت کامیاب ثابت ہوئے مگر گائے والے ہتھیار کا تو جواب ہی نہ تھا۔ دوسری قابل ذکر پارٹیاں پرجا سوشلسٹ، کمیونسٹ اور سوتنتر پارٹی وغیرہ بھی کسی اہم پوزیشن میں نہیں تھیں۔ آزاد امیدواروں کا ذکر ہی فضول ہے۔

یہ تذکرہ ہمارے موضوع سے کچھ ہٹا ہوا سا معلوم ہو رہا ہوگا مگر یہاں یہ حالات پیش کرنے کا مقصد آنے والے دور کا پیش منظر دکھانا ہے کیونکہ چوتھے جنرل الکشن میں ہم نے دیکھا ہے کہ معصوم گائے کی آزمودہ تلوار کس شان اور کس دھار کے ساتھ میان سے نکلی اور حکمراں ٹولے کے لئے سانپ کے منھ کی چھچھوندر بن کر اپنا کام کر گئی اور یہ تماشا بھی ہم نے حسرت سے دیکھا کہ سوشلسٹ اور سیکولر نظریہ رکھنے والی پارٹیاں فرقہ پرستی کے اُمنڈتے ہوئے خطرے کے آگے ایک ہو کر سینہ سپر تو کیا ہوتیں، اُلٹی اسکے لیئے دست و بازو بن گئیں۔ نتیجہ جو کچھ نکلا اس کا ذکر یہاں موضوع سے خارج بھی ہے اور یوں بھی فضول کہ آج نظر کے سامنے ہے۔

نائب صدر کا الکشن

جب صوبوں اور مرکز میں کانگریس کی حکومت بن گئی تو پنڈت نہرو کی تحریک پر کانگریس نے ذاکر صاحب کو نائب صدارت اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کو

---

[1] رسالہ ’لنک‘ (انگریزی)، نئی دہلی۔ ۴ مارچ ۶۲ء

صدارت کے لیئے نامزد کیا۔ کانگریس پارٹی اسمبلی اور مرکز میں غالب اکثریت رکھتی تھی اس لیئے اسی کے امیدوار کو کامیاب ہونا تھا۔ الکشن اگرچہ پھر بھی ۷ رمئی ۱۹۶۲ء کو ہوا مگر نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ۔ اُسی دن ذاکر صاحب کے چُنے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ ان کو ۵۶۸ ووٹ ملے اور اُن کے واحد مخالف آزاد امیدوار مسٹر این سی سامنت سنہر (سابق کانگریسی ایم پی اڑیسہ) کو ۱۴ ووٹ ملے ذاکر صاحب کو یہ اطلاع فون سے دی گئی۔

دہلی میں آمد

۱۳ رمئی ۱۹۶۲ء کو وہ دہلی پہنچے، اُسی دن ڈاکٹر راجندر پرشاد سے راشٹرپتی بھون جاکر ملے (جو اپنے عہدے سے بارہ سال بعد سبک دوش ہو رہے تھے) اور شام کو ان کی الوداعی تقریب میں بھی شرکت کی۔

حلف لینے کی رسم

۱۳ رمئی ۶۲ء (اتوار) کو پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں حلف لینے کی رسم ادا کی گئی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر رادھا کرشنن (صدر) نے حلف لیا۔ اسکے بعد ذاکر صاحب نے حلف کی رسم ادا کی اور اپنی مقررہ کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنی تقریر میں ملک کو درپیش مسائل، عوام کے حالات اور جمہوریت کے تقاضوں کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی تقریر کے آخر میں قوم کو اس بات پر خراج تحسین پیش کیا کہ اس نے نائب صدارت کے لیئے ڈاکٹر ذاکر حسین جیسا لائق شخص چُنا ہے۔ اُنہوں نے کہا:

"وہ ایک بڑے اسکالر، تعمیری انداز فکر رکھنے والے اور بلند مرتبہ

ماہر تعلیم ہیں۔ وہ عوامی خدمت کے مختلف میدانوں کا وسیع تجربہ
لے کر اس نئے کام کو انجام دینے آئے ہیں جو قوم نے آج ان کے سپرد
کیا ہے۔ میں ان کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں" ۔

راجیہ سبھا کی صدارت

نائب صدارت کے فرائض میں راجیہ سبھا کی ذمہ داریاں بھی شامل تھیں۔

راجیہ سبھا کی صدارت انتہائی مشکل اور اُلجھنوں سے بھرپور ذمہ داری ہوتی ہے جہاں خاص طور پر صدر کو سخت صبر آزما حالتوں سے گذرنا ہوتا ہے کیونکہ راجیہ سبھا مختلف طبقوں، پارٹیوں اور گروہوں کے نظریاتی اختلاف اور پریشاں خیالیوں کا منظر پیش کرتی ہے اور بقول ڈاکٹر تارا چند یہ "بہت دلچسپ مگر کم دل کش مطالعہ ہے اثرات و دلائل کی کشاکش کا۔ یہاں حملے ہوتے ہیں، ان سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے بعد پھر حملے کیے جاتے ہیں۔ غرض یہاں ایک کبھی ختم نہ ہونے والی سرد جنگ چلتی رہتی ہے"۔[1] یہ گویا اس محفل میں روز کا معمول ہے اور جب یہ حالت ہو تو پھر ظاہر ہے کہ صدر کو کس صورت حال سے دوچار ہونا ہوگا۔ یہ نظارہ ڈاکٹر تارا چند کے الفاظ میں یوں ہوتا ہے کہ:

"ایسے حالات میں وہ (صدر) پارٹیوں کو سمجھاتا ہے، اُن سے
بہتر اندازِ نظر اور رویّے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مقرر کو سمجھاتا ہے اور

---

[1] "نذرِ ذاکر": ۱۴ - ۱۲

کبھی کبھی اس کی منت سماجت بھی کرتا ہے ۔ اور اگر یہ تمام طریقے ناکام ثابت ہوں تو وہ کیا کرے ؟ ہٹ دھرم اور ہنگامہ خیز مقرر ہے کہ چُپ ہی نہیں ہوتا ، بولے ہی چلا جاتا ہے ، ہاتھ ہلائے جاتا ہے ، بولنے پر اَڑا ہوا ہے اور صدر کی ایک نہیں سنتا ۔ اس کے بعد بس قیامت کا سماں سامنے آجاتا ہے ۔ چیخ پکار شروع ہو جاتی ہے ۔ لوگ بولتے ہیں اور پورے جسم سے بولتے ہیں ۔ کچھ ممبر ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگتے ہیں اور پھر " آرڈر آرڈر " کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں .... " ۔

ذاکر صاحب راجیہ سبھا کی صدارت کی پُر پیچ وادیوں سے بڑے سکون ، بڑے وقار اور جرات و ہمت کے ساتھ گذرے ۔ اگرچہ کبھی کبھار اُن کے ذہنی سکون میں خلل بھی پڑا ہے پھر بھی اُنہوں نے ہمیشہ خاص وقار کے ساتھ کام کیا اور ایوان کے کام کو بلا وجہ خراب نہیں ہونے دیا ۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ اس عہدے سے سبک دوش ہوئے تو ایوان کے سبھی گروہوں کے نمایندوں نے اُنہیں خراج عقیدت پیش کیا ۔ اُنہوں نے یہ بات ظاہر کر دی کہ کس حد تک برسراقتدار پارٹی اور مخالف پارٹیوں کے ممبر ذاکر صاحب کی انصاف پسندی اور ایوان کے چلانے کی صلاحیت کے معترف ہیں " [۵]

---

[۵] ' تذکرِ ذاکر ' مضمون ڈاکٹر تارا چند

گوا منسٹری کی رسم

۲۰ دسمبر ۶۳ء کو پرتگالی مقبوضات گوا ڈمن۔ ڈیو کی آزادی کے بعد پہلی بار وزارت بنائی گئی۔ ذاکر صاحب نے حلف لینے کی رسم کا افتتاح کیا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ گوا میں پُرامن طریقے پر الکشن ہوئے اور گوا کی آزادی کے دو سال بعد ہی مرکزی یونین گورنمنٹ نے وہاں کے باشندوں کو اختیارات دیدیئے ہیں۔ اُنہوں نے گوا کی آیندہ ترقی اور وسیع قدرتی وسائل کا بھی ذکر کیا اور گورنمنٹ آف انڈیا کے اُن پروگراموں اور اسکیموں کا ذکر کیا جو گوا کی صنعتی ترقی کے لئے بنائے گئے ہیں" [۱]

پارلیمنٹ کو ایڈریس

۵ فروری سے ۲۲ فروری ۶۴ء تک ڈاکٹر رادھا کرشنن کی علالت کی وجہ سے صدارت کے فرائض بھی ذاکر صاحب نے انجام دیئے۔ ۱۰ فروری کو پارلیمنٹ میں افتتاحی خطبہ (پہلے ہندی میں اور بعد میں انگریزی میں) دیا۔ یہاں لطیفہ یہ ہوا کہ جہاں ہندی کے حامی اس سے خوش ہوئے وہاں ڈی۔ ایم۔ کے پانچ ممبر بطور احتجاج اس لیے غیر حاضر رہے کہ خطبہ پہلے ہندی میں کیوں دیا گیا۔ رام منوہر لوہیا نے ایک بیان میں کہا کہ میں اس لئے غیر حاضر رہا کہ انگریزی میں خطبہ کیوں دیا گیا! اس خطبہ میں مختلف مسائل اور

---

[۱] نیشنل ڈائری ۱۹۶۴ء ص ۱۰

دشواریوں کا تذکرہ کیا گیا تھا جو دیش کو گذشتہ سال در پیش رہے ۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں سائنسی تحقیقات کی ترقی، تیل کے ذخیروں کی موجودگی کا انکشاف، نئے نئے پروجیکٹوں کا تعارف، پیداوار میں کمی، گوا، ڈمن ۔ ڈیو میں با اختیار حکومت، ناگالینڈ کا قیام (یکم دسمبر ۶۳ء) چین کی طرف سے خطرہ، سرحد پر چینی فوجی تیاریاں اور کولمبو پلان کی تجاویز سے اس کا انحراف، امریکہ ۔ برطانیہ اور روس کی ہندوستان کو گراں قدر امداد، ملکی دفاع کے اقدامات، صدر اور نائب صدر کا غیر ملکوں میں دورہ، باہر سے آنے والے مہمان، یوگانڈا اور کینیا کی آزادی، صدر کنیڈی کی موت، پاکستان سے تعلقات، چین اور پاکستان کا سرحدی معاہدہ، موئے مبارک کی چوری (کشمیر) اور اس کے بعد کے حادثات پاکستان میں اقلیتوں کی تباہی اور ان کا ہندوستان کی طرف فرار اور ہندوستان کو اس سے پیدا شدہ مشکلات وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی تھی

افتتاحی رسمیں

۶۳-۱۹۶۴ء کے دوران میں جو افتتاحی رسمیں اُنکے ہاتھوں انجام پائیں ان میں یہ قابل ذکر ہیں ۔

۱ - ۱۹ اپریل ۱۹۶۳ء کو ایک نئی ریلوے لائن کی جو کہ یوپی کے ایک مقام چرک کو بہار کے ایک مقام گرہوا سے ملاتی ہے، افتتاحی رسم عمل میں آئی ۔

۲ - کریبورو (اڑیسہ) میں نئے آئرن اور پروجیکٹ کا آغاز ۱۲ نومبر ۱۹۶۴ء کو ہوا ۔

۳ - جامعہ ملیہ میں گوشۂ جگر کا افتتاح اور تقریر (نومبر ۶۳ء)
۴ - آل انڈیا کالجوں کے مشترک کانوکیشن میں ایڈریس مراد آباد، ۱۰ مارچ ۶۳ء۔

افریقی ملکوں میں

سوڈان، ایتھوپیا اور متحدہ عرب جمہوریہ کے دورے کے بعد ۲۵ جون ۶۴ء کو ذاکر صاحب پھر افریقی ممالک کے دورے پر روانہ ہوئے اور قاہرہ ہوتے ہوئے ۲۶ جون کو الجیریا پہنچے جہاں الجیریا کے نائب صدر محمدی سعید نے ان کا استقبال کیا۔ گارڈ آف آنر کے بعد موٹروں سے لمبے جلوس کی شکل میں شہر سے گذرے۔ یہاں کشمیر کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے اور ہماری پالیسی سے دنیا اچھی طرح واقف ہے اس کے علاوہ کوئی تازہ بات اس سلسلے میں نہیں ہے انہوں نے جمعہ کی نماز الجیریا کی بڑی مسجد میں ادا کی۔ بعد میں صدر بن بیلا سے گفتگو کی دونوں لیڈروں نے افریقہ اور ایشیا کے اتحاد کی اہمیت پر زور دیا اور انگولا اور موزمبیق کے عوام سے ہمدردی کا اظہار کیا جو پرتگیزی سامراج کے خلاف آزادی کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ انہوں نے بن بیلا کو تحفے پیش کیے اور ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ تحفوں میں منتخب آم اور چلغوزے، تانبے پیتل کی خوب صورت نقشین میز، قالین وغیرہ شامل تھے۔ یہاں وہ نیشنل اسمبلی کے صدر سے بھی ملے اور ان یتیم خانوں کو بھی دیکھا جہاں جنگ آزادی میں کام

آنے والوں کے بچے تربیت پا رہے ہیں۔

یکم جولائی کو رباط (مراکو) پہنچے جہاں پر جوش استقبال کیا گیا شاہ حسین ثانی نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا اور ایک شاندار تقریب میں جو شاہی محل میں منعقد ہوئی انہیں مراکش کا دوسرا سب سے بڑا اعزاز دیا شاہ نے ہندوستان سے پُر خلوص دوستی کا اظہار اور ہندوستانی عوام کو نیک خواہشات کا پیغام دیا۔ ۲ر جولائی کو انہوں نے مراکو کے وزیر خارجہ سے دنیا کے حالات اور افریقی صورت حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ مراکو کے اخبارات نے ان کی آمد پر جلی عنوانات سے تبصرے کیئے "الوطن" نے لکھا تھا کہ گاندھی اور محمد پنجم (مراکو لیڈر) کے روحانی اثرات اور پیغام ان کے علاقوں تک محدود نہیں رہے بلکہ تمام علاقوں اور قوموں کے لیئے ہیں۔ گاندھی کے جادو بھرے پیغام نے ایشیا کو اپنی طرف کھینچا اور محمد پنجم (موجودہ شاہ حسین ثانی کے والد) نے افریقہ کو۔ یہ دونوں پُر عزم جدو جہد کرتے ہوئے موت سے ہمکنار ہوئے۔ ہندوستان کو نہرو نے سنبھالا اور مراکو کو حسین نے ....."

۴ر جولائی کو ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان آزادی کی جنگ میں افریقی ممالک کی حمایت کرتا رہے گا۔ انہوں نے مختلف سوالات کا جواب دیتے ہوئے اپنے دورے کے تاثرات بیان کیئے انہوں نے بتایا کہ پاکستان سے بات چیت کا دروازہ آج پہلے سے بھی زیادہ کھلا ہے، نہ صرف کشمیر بلکہ دونوں ملکوں میں کشیدگی ختم کرنے کے لیئے بھی انہوں

نے چینی حملے کے بارے میں ہندوستان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ۔ کاسابلانکا کے گورنر اور عوام نے بھی ان کا سواگت کیا ۔

۶ر جولائی کو ٹیونس پہنچنے پر زبردست استقبال ہوا، انہوں نے چینی حملے کے دوران ٹیونس کی حمایت کا شکریہ ادا کیا ، دفاع اور امور خارجہ کے وزیروں سے گفتگو کی ۔ ۷ر جولائی کو صدر حبیب بورقیبہ سے ملاقات اور مختلف مسائل پر بات چیت کی جس میں دونوں ممالک کے درمیان گہرے تعلقات کی ضرورت بھی زیر بحث آئی ۔ ٹیونس کے وزیر خارجہ نے دن کے کھانے پر مدعو کیا ۔ اور سوسے کی میونسپلٹی نے استقبالیہ دیا ۔ اخبارات نے خصوصی نمبر شائع کیے ۔

۱۰ر جولائی کو پریس کانفرنس میں اُن سے مختلف سوالات کیے گئے جسکے جواب میں اُنہوں نے کشمیر پر ہندوستان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بیرونی مداخلت سے یہ مسئلہ بجائے سلجھنے کے اور الجھ جائیگا مجھے امید ہے کہ آپس کی گفتگو سے ہم معاملات سلجھانے کے قابل ہوسکیں گے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ہندوستان دنیا میں مسلم آبادی کے لحاظ سے تیسرا سب سے بڑا ملک ہے ، یہاں سب کو برابر کے حقوق حاصل ہیں ۔ وہ ٹیونس کے بڑے مفتی سے بھی ملے ۔

قاہرہ میں

۱۱ر جولائی کو قاہرہ پہنچکر صدر ناصر سے اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات کی جہاں صدر ناصر نے ان کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا تھا ۔ گفتگو کے دوران صدر ناصر کو

انہوں نے یقین دلایا کہ ہندوستان نہرو کی پالیسیوں پر ہی عمل کرتا رہے گا اس کے بعد چند اور وزیروں سے بھی ملے اور ۱۳ر جولائی کو دہلی واپس پہنچے۔ اس سے پہلے ۱۸ر مارچ سے انہوں نے انڈمان اور نکوبار کا بھی چھ روزہ دورہ کیا تھا۔

ایوکیرسٹک کانگریس کو خطاب

انٹرنیشنل یوکیرسٹک کانگریس[ا] کے اڑتیسویں سالانہ اجلاس میں ۲۸ر نومبر ۱۹۶۴ء کو ذاکر صاحب نے افتتاحی ایڈریس پڑھا۔ انہوں نے اس میں امید ظاہر کی کہ یہ کانگریس دنیا میں ایک ایسے سماجی نظام کے لئے راہ ہموار کرے گی جو نسلی امتیاز، خود غرضی اور غیر انسانی اخلاق آزاد ہو گا۔ جہاں سچائی انصاف اور آپس کا احترام جگہ پاسکے گا۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہے حکومت کسی خاص مذہب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس کے آئین نے تمام مذہبوں اور فرقوں کو برابر کے حقوق دیئے ہیں۔ آئین میں یہ خصوصیت ہندوستانی عوام کے دلوں میں اس احترام کو ظاہر کرتی ہے جو کہ وہ لوگ روحانی قدروں کے لیے رکھتے ہیں"۔ اُنہوں نے عیسائی فرقے کو ہندوستانی زندگی کا اہم جزو قرار دیا۔ ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں عیسائیوں کے قابل قدر کاموں پر خراج تحسین پیش کیا اور مہاتما گاندھی پر بائیبل اور عیسائی مذہب کے گہرے اثر کا ذکر کیا۔

[ا] ایوکرسٹک یونانی لفظ ہے جسکے اصل معنی ہیں شکریہ ادا کرنا یہ عیسائیوں کی ایک روحانی جماعت ہے

پوپ پال کی آمد پر

۲ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو رومن کیتھولک چرچ کے روحانی پیشوا پوپ پال ششم ایوکیرسٹک کانگریس میں شرکت کے لئے ہندوستان آئے بمبئی میں انکا استقبال کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے ایک مختصر تقریر میں پوپ کا شکریہ ادا کیا کہ وہ ہندوستان تشریف لائے۔ آپ کے علاوہ لال بہادر شاستری صدر رادھا کرشنن، بمبئی کے گورنر اور وزیر اعلیٰ بھی اس موقعے پر موجود تھے

دہلی یونیورسٹی کانوکیشن

۱۴ر دسمبر کو دہلی یونیورسٹی کانوکیشن میں ایڈریس میں ذاکر صاحب نے ملک میں طلبار کی بدنظمی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ طلبار کی نگہداشت ٹھیک طور سے نہیں کی جاتی۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں تعلیم کو ایک اخلاقی فریضہ سمجھنا چاہیے اور یونیورسٹیوں کو اداروں کے بجائے کمیونٹی سنٹر بن جانا چاہیئے۔ یونیورسٹیاں ایک زندہ اور متحرک آرگن کی طرح ہوں مشین کی طرح نہ ہوں جس میں حرکت ہوتی ہے لیکن زندگی نہیں ہوتی۔

پرانی قدریں ختم ہو رہی ہیں لیکن نئی قدروں نے ان کی جگہ نہیں لی۔ یونیورسٹیاں اس خلا کو پُر کرنے سے قاصر ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان تعلیمی اداروں کا طریقہ کار مشینی انداز اختیار کر چکا ہے۔ اس کا حل ان کے نزدیک یہ ہے کہ یونیورسٹیاں سوشلسٹ طرز کے سماج کو آدرش کے طور پر تسلیم کر لیں۔ وہ صرف علم پر ہی زور نہ دیں

بلکہ طالبِ علم کی تربیت پر بھی دھیان دیں۔

جنم دن کے موقعے پر

سال گرہ منائے جانے کا جو رواج آج کل چل نکلا ہے ذاکر صاحب اس کے مخالف ہیں چنانچہ ۸ر فروری ۱۹۶۵ء کو جب لوگ اُنہیں مبارک باد دینے گئے تو پتہ چلا کہ وہ سویرے ہی راج دھانی سے باہر چلے گئے ہیں اور ایک تحریر چھوڑ گئے ہیں جس کا مضمون یہ تھا کہ "افسوس ہے میں آپ کا خیر مقدم کرنے کے لیے یہاں نہیں ہوں۔ آج میری پیدائش کی تاریخ کا علم لوگوں کو ہو ہی گیا۔ میں اپنی سال گرہ کبھی نہیں مناتا اور سچ پوچھیے تو اس میں منانے کی بات ہی کیا ہے۔ لیکن احباب کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔ اس رسم کو ختم کرنے کے لیے آج باہر جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں سال گرہ منانے سے کہیں زیادہ اہم کام انجام دینا ہیں"۔

دارالمصنفین کی جوبلی

اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی (۲۱ر فروری ۱۹۶۵ء) پر اُنہیں صدارت کے لیے بُلایا گیا تھا۔ یہاں جو خطبۂ صدارت اُنہوں نے پڑھا وہ نہ صرف زبان و ادب کا انمول شہ پارہ ہے بلکہ اس میں انہوں نے ہندوستانی مورخوں کو ان کا اصل فرض بھی یاد دلایا ہے:

"آپ کی تصنیف و تالیف کا ایک خاص میدان ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اور اس کی ایک امتیازی خصوصیت قلب و نظر کی وسعت ہے ...... آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ اس دورِ آزادی

یں تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلۂ کار بنانا ختم ہو چکا ہے صدیوں
کے درد برسوں میں دور نہیں ہو پاتے۔ جی ہاں، آج بھی یہ رجحان
باقی ہے اور خاصا قوی ہے۔ آج بھی یہ دکھانے کی کوشش کی
جاتی ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل
نہیں ہوا۔ ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی جب
تک ایک تہذیب دوسری میں جذب نہ ہو جائے۔ اس لئے آپکو
اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے کہ آپ کی سعی ابھی
ناتمام اور آپ کا کام ابھی ادھورا ہے۔ آپ کو اور زیادہ محنت
ہمت اور استقلال کے ساتھ جدوجہد کرنی ہے۔ تاریخ نگاری
کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرونِ
وسطیٰ میں ہندو مسلم تہذیبوں کے اپنے اپنے دائرے تھے لیکن اُن
میں ایک مشترکہ قطعہ بھی تھا جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت
رکھتا تھا۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے
لیے آپ زبردستی تاویل سے کام لیں۔ یہ نہ تو دیانت دار مورخوں
کی حیثیت سے آپ کے لئے جائز ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت
ہے۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس کے ثبوت تاریخ کے صفحوں
بکھرے ہوئے ہیں صرف اُنہیں جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت
ہے ...... دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا
تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں۔ انسان کا

وجود اس دنیا میں اربوں سال سے ہے اس میں سے چند ہزار
سال نکال دیجئے تو باقی سارا زمانہ وحشت کا زمانہ تھا۔ اس لیئے
آج اُن افراد اور قوموں میں جنہیں ہم مہذب کہتے ہیں تہذیب کی
ایک ہلکی سی پرت کے نیچے نہ جانیں کتنی پرتیں وحشت کی دبی ہوئی
ہیں جو موقع ملنے پر اُبھر آتی ہیں ...... آپ سے میری یہ التجا
ہے کہ وحشتوں کی روداد دوسروں کے لیئے چھوڑ دیجئے۔ آپ تہذیبوں
کی کہانی لکھیئے اور نئے ہندوستان کو ماضی کی روشنی میں حال کا یہ
اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے۔ مختلف تہذیبوں کے الگ
الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے اُن میں
وہ ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا کیجئے جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے
کے لیئے درکار ہے"۔

جشن جوبلی کا ایک نظارہ

شبلی اکیڈیمی کی جوبلی کے اس
جشن میں مولانا عبدالماجد دریابادی
بھی شریک تھے، اپنے مخصوص انداز اور الفاظ میں اس جشن کی تصویر کشی بھی
اُنہوں نے کی ہے۔ چنانچہ ایک موقعے پر "نماز مغرب اذان و اقامت کے بعد
مسجد میں اپنے وقت پر شروع ہوئی اور تیسری رکعت بھی ختم کے قریب ہے
کہ بھاگم بھاگ ایک موٹر دروازے پر آکر رُکتی ہے موٹر نشین لپک کر مسجد کے
اندر آجاتا ہے۔ جگہ اب کہاں۔ بالکل پائیں مسجد میں جہاں نمازی اپنے جوتے
اتارتے ہیں اور جہاں نہ مسجد کی دری ہے نہ چٹائی وہاں جوں توں یہ نمازی

اپنے لیے جگہ نکال لیتا ہے اور وہیں شریک جماعت ہو جاتا ہے امام و جماعت کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی بقیہ نماز پوری کرتا ہے اور فرض کے بعد کچھ اور بھی اسی کونے میں پڑھ پڑھا کر رخصت ہو جاتا ہے۔ اس حال میں کہ نمازیوں کا ایک ٹھٹ اس کے گرد کھڑا ہوا اسے دیکھتا ہوتا ہے ـــــــ اس صفِ نعال کے نمازی کو آپ نے پہچانا؟ ـــــــ یہ وہی مہمان عزیز ہے جو جوبلی کی بارات کا دولہا تھا۔ جمہوریۂ ہند کا نائب صدر، جس کی خاطر یہ جشن طلائی کا یہ سارا کروفر تھا۔ جس کی پیشوائی ابھی دوپہر ہی کو کس دھوم دھام سے ہو چکی تھی۔ گارڈ آف آنر سلامی دے چکا تھا اور جس کی جان عزیز کی حفاظت و سلامتی کے لیے پولس اور خفیہ پولس قدم قدم پر تعینات تھی"۔

عرب ملکوں میں دورہ

۱۹ مئی ۶۵ء کو ذاکر صاحب پھر عرب ممالک کے دورہ پر روانہ ہوئے سب سے پہلے ۲۰ مئی کو کویت پہنچے۔ یہاں ولی عہد شیخ صباح السلیم سے ملاقات کی۔ رن کچھ پر پاکستانی حملے اور اقتصادی تعاون وغیرہ کے مسئلوں پر بات ہوئی۔ کویت کے اخباروں نے اس موقعے پر خصوصی مضامین شائع کیے۔

۲۳ مئی کو ریاض کے ہوائی اڈے پر ولی عہد خالد بن عبد العزیز نے استقبال کیا۔ یہاں وہ شاہ فیصل سے ملے اور مختلف مسائل پر بات چیت کی۔ یہاں اخباری نمایندوں نے کشمیر کے مسئلے اور شیخ محمد عبد اللہ کی حالیہ گرفتاری پر سوالات کیے۔ مفتی شیخ محمد ابراہیم سے ان کے مکان پر ملے اور ریاض یونیورسٹی گئے اس کے بعد ۲۶ مئی کو مدینہ منورہ پہنچے جہاں بارگاہ

نبویؐ میں حاضری دی، مسجد اقصیٰ، بیت المقدس اور مسجد عمرؓ وغیرہ گئے۔

۲۱ مئی کو انقرہ (ترکی) پہنچے، صدر جمال گرسل سے ملاقات کی، وزیر اعظم سعد ہیری سے بات چیت کی۔ ترکی لیڈروں سے کشمیر کے مسئلے پر بھی بات چیت ہوئی جنہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کشمیر کا مسئلہ آپس کی بات چیت سے طے کیا جائے جب تک یہ طے نہ ہوگا افریشیائی ممالک کا بلاک با اثر نہ ہو سکے گا۔

۱ جون کو یونان پہنچکر شاہ یونان اور وزیر اعظم سے گفتگو کی اور یہاں کے آثار قدیمہ دیکھنے گئے۔ یونانی اخبارات نے اس موقعے پر اُن کی شخصیت پر متعدد مضامین شائع کئے جس میں اُنہیں انسانیت اور شرافت کا مجسمہ قرار دیا گیا۔

مسلم ممالک اور ہندوستانی مسلمان

عرب اور مصر وغیرہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں کافی غلط فہمیاں تھیں۔ نہ صرف عوام بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان اور خصوصاً دہلی میں تمام مسلمانوں کا قتل عام کیا جا چکا ہے[1]۔ چنانچہ مصر کی ایک نہایت ذی علم اور معروف شخصیت

---

[1] الاظہر کے امام کو جب یہ بتایا گیا کہ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان آباد ہیں تو اُن کو اس قدر تعجب ہوا کہ اس بات کو اُنہوں نے تین چار مرتبہ پوچھ کر تسلی کی۔ (رسالہ "کونس پیکٹس" جلد ۲ نمبر ۱۔ مضمون جنرل سرکار)

کو یہ سمجھانے میں ذاکر صاحب کو بڑی مشکل درپیش ہوئی کہ ہندوستان میں مسلمان بھی موجود ہیں[1]۔ ان کے دورے سے بے خبری کے بادل چھٹے اور لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان بے حقیقت مخلوق نہیں۔ آبرومند گروہ ہیں۔

تنقیدیں

غیر ممالک میں اِن وضاحتوں پر بعض حلقوں سے طعن آمیز انداز میں تنقیدیں کی گئیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک بار اِن "تنقید نگاروں" سے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح خطاب کیا تھا:

"پبلک لیڈر، رہبر ملت اور سربراہِ حکومت میں فرق کرنا سیکھیے پھر حکومت بھی ایسی جو مسلم کسی معنی میں نہ ہو بلکہ سرتاسر غیر مسلم یا بقول خود لادینی ہو"۔

لیکن اس کے علاوہ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر مسلمانانِ ہند کی آبرومندی کو واضح کرنا —— جو دین و وطن کے ہر شیدائی کا فرض ہے —— بعض حلقوں میں قابل اعتراض کہا جا سکتا ہے تو بتایا جائے کہ کیا دنیا میں انکو بے وقعت اور حقیر مخلوق ثابت کیا جانا چاہیئے؟ فرقہ پرست جماعتوں یا افراد

---

1 - CHANCHAL SARKAR : Growth towards Secularism 'Conspectus' V 2, No. 1, 1966

کی بدولت جو پریشانیاں اُنہیں درپیش ہیں، مانا کہ وہ سب درست۔ مگر کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ برسرِ حکومت طبقے میں اور اس کے علاوہ ملک کی دیگر پارٹیوں میں ایسا گروہ موجود ہے کہ جو سیکولرازم کا حامی ہے جو نہرو، گاندھی، آزادؔ اور سبھاش کے سپنوں کا ہندوستان بنانا چاہتا ہے۔ جو اتحاد، بھائی چارے اور رواداری کا جھنڈا اٹھا رہا ہے۔ الکشن کے نتائج گواہ ہیں کہ جیسے جیسے یہ گروہ کمزور ہو گا فرقہ پرست اور تنگ نظر عنصر طاقت ور ہوتا چلا جائے گا اور ایسا ہو گا تو یہ ملک انتشار، بدنظمی، پھوٹ، انارکی اور زوال کی طرف بڑھے گا۔ یہاں قانون اور عمل میں جو تضاد ہے اس کی بہت سی وجہیں ہیں۔ پاکستان کی موجودگی اور غلط طرزِ عمل، دونوں ملکوں کا تناؤ، کشمیر کی اُلجھنیں، فرقہ پرستوں کی بڑھتی ہوئی طاقت، سماج کا سیکولر نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ قانون اور سماج کا یہی ٹکراؤ مشکلات پیدا کرتا ہے لیکن اس میں قانون یا اس کے بنانے والوں کا دوش نہیں۔ یہاں سیکولر اور جمہوری بنیادوں پر ایک آدرش نظام قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ کوشش کامیاب ہے یا ناکام یہ بات الگ ہے لیکن اس کوشش کے صالح اور صحیح ہونے میں شبے اور اختلاف کی گنجائش نہیں۔

ستمبر ۶۵ء میں

چھمب (کشمیر) میں باقاعدہ پاکستانی حملے کے بعد ستمبر ۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آخرکار جنگ کی نوبت آگئی۔ پاکستان کے جنگ باز لیڈر تو پچھلے اٹھارہ سال سے جنگ پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے مگر ہندوستان

کی امن پسندی اور جواہر لال نہرو کے تدبر نے نہ صرف دنیا میں وقار بلند رکھا بلکہ جنگ کی نوبت بھی نہ آنے دی۔ پنڈت نہرو کی موت سے ادھر تو فرقہ پرستوں کے اُجڑے چمن میں بہار آگئی اُدھر دنیا میں ہندستان کی ساکھ کو سخت دھکا لگا۔ اور ڈیڑھ ہی سال کے اندر دونوں ملک آپس میں ٹکرا بھی گئے۔ ذاکر صاحب نے اس موقع پر وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے ایک پیغام قوم کے نام نشر کیا۔ یہ زمانہ ان کے لیے ایک سخت افسوسناک پہلو بھی لیے ہوئے تھا۔ فرقہ پرست عناصر نے رذالت کی انتہا کی اور نہایت ہوشیاری سے ان کے خلاف افواہیں پھیلائیں جو اگرچہ اخبارات میں تو نظر نہ آئیں مگر زبانوں پر البتہ سنی اور سنائی گئیں۔ حال ہی میں جب سری نگر میں قومی ایکتا کانفرنس بلائی گئی تو مسز سبھدرا جوشی نے جرات و مردانگی کے ساتھ فرقہ پرست عناصر کی قلعی کھولتے ہوئے افسوس سے اس واقعے کا ذکر کیا[1]۔ اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی ایک بار لکھا تھا:

"حیاداروں کا ایک طبقہ ایسا بھی تو موجود ہے جس نے آج کے صدر محترم اور اُس وقت کے نائب صدر محترم کی غداری بلکہ نظر بندی کی افواہیں پھیلانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا" (صدق، ۱۹ رجولائی ۶۸ء)

---

[1] قومی ایکتا کانفرنس۔ سری نگر ۲۱، ۲۲ رجون ۶۸ء

چند تقریریں

نائب صدارت کے زمانے کی چند قابل ذکر تقریریں حسب ذیل موقعوں پر کی گئیں:

۱۔ راجیہ سبھا میں پہلی تقریر بطور نائب صدر۔ ۱۵ر جون ۶۲ء

۲۔ فاؤنڈرز ڈے، ماڈرن اسکول نئی دہلی۔ ۲۵ر نومبر ۶۲ء (اچھے اسکول کی خصوصیات)

۳۔ تامل ناڈ بیسک ایجوکیشن کانفرنس (مدراس) ۲۲ر اگست ۶۴ء (بنیادی قومی تعلیم کی وضاحت اور اس کے عملی پہلوؤں پر روشنی)

۴۔ نہرو راؤنڈ ٹیبل (یونیسکو) نئی دہلی ۲۹ر ستمبر ۶۶ء (نہرو کے سیاسی خیالات اور تاریخ ہند میں اُن کی اہمیت)

۵۔ آزاد میڈیکل کالج فاونڈرز نئی دہلی۔ ۴ر اکتوبر ۶۶ء

۶۔ سیمینار نیوکلر ہتھیاروں پر۔ افتتاح سپرو ہاؤس نئی دہلی ۶ر نومبر ۶۶ء۔

۷۔ ہندی پرچار سمیتی میسور۔ اگست ۶۴ء۔

۸۔ کانوکیشن ایڈریس۔ احمد آباد۔ ۳ر اکتوبر ۶۳ء

۹۔ افتتاح اور تقریر، یونیورسٹی آف ایگریکلچرل سائنز بنگلور ۲۱ر اگست ۶۴ء۔

۱۰۔ کانوکیشن ایڈریس یوپی ایگریکلچرل یونیورسٹی۔ پنت نگر ۳۱ر مارچ ۶۵ء۔

۱۱۔ کانوکیشن ایڈریس یونیورسٹی آف میسور۔ ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۶ء
۱۲۔ کانوکیشن ایڈریس رڑکی یونیورسٹی، رڑکی ۲۰ر دسمبر ۱۹۶۶ء
۱۳۔ کانوکیشن ایڈریس پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ ۴ر فروری ۱۹۶۷ء
۱۴۔ تقریر سالانہ اجلاس انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز نئی دہلی ۔ ۱۲ فروری ۱۹۶۷ء ۔

پیسیفک ایریا ایسوسی ایشن

۲۴ر جنوری ۱۹۶۶ء کو پیسیفک ایریا ٹریول ایسوسی ایشن کی پندرھویں سالانہ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں ہندوستان کو مختلف مذہبوں کے سنگم سے تعبیر کیا اور اس طرح اس ملک کو ایک تجربہ گاہ قرار دیا جس میں مختلف مذہبوں کا کلچرل تجزیہ ہو رہا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ "ہندوستان نہ صرف چند مذہبوں کی جنم بھومی ہے بلکہ اس نے باہر سے اثر ڈالنے والے کئی مذہبوں کو اپنے میں سمویا بھی ہے"۔ اُنہوں نے ڈیلی گیٹوں سے جو زیادہ تر امریکی تھے) کہا کہ "ہم ایک ایسا آزاد اور جمہوری سماج رہے ہیں جس نے باہر سے سیاحوں کو خوش آمدید کہا، اور یہ روایات اب سے نہیں بلکہ پانچویں اور ساتویں صدی سے چلی آتی ہیں جب چینی سیاح فاہین اور ہیونگ سانگ یہاں آئے اور اس زمین کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ہماری یہ روایات آج بھی قائم ہیں یہاں تک کہ حالیہ ہند پاکستان جنگ کے موقعے پر بھی ہندوستان نے سیاحوں کو نہیں روکا"۔

ایسوسی ایشن نے اس موقعے پر چند تجاویز مثلاً ہوائی سفر کے اخراجات وغیرہ گھٹانے اور سیاحوں کو سہولت فراہم کرنے کے لئے منظور کیں ۔ ؎۱

ایشیائی ملکوں کا دورہ

جولائی سے اکتوبر ۶۶ء تک ذاکر صاحب نے مختلف ایشیائی ملکوں کا دورہ کیا جن میں افغانستان، کمبوڈیا، تھائی لینڈ۔ ملایا۔ سنگھاپور وغیرہ شامل ہیں ۔ ۱۰ر سے ۱۴ر جولائی تک انہوں نے افغانستان کا دورہ کیا۔ ۸ر سے ۱۰ر اکتوبر تک تھائی لینڈ کا۔ ۱۱ سے ۱۲ر اکتوبر تک کمبوڈیا۔ ۱۷ر اکتوبر سے پانچ دن تک ملایا اور پھر سنگھاپور کے دورے پر رہے ۔

کابل میں

۱۰ر جولائی کو کابل میں اُن کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ ہوائی اڈے پر افغانستان کے وزیراعظم اور دیگر رہنماؤں نے خوش آمدید کہا۔ اسی دن وزیراعظم محمد ہاشم میہندوال نے ایک دعوت ان کے اعزاز میں دی جس میں خود انہوں نے اور بعد میں ذاکر صاحب نے تقریریں کیں۔ شام کو وہ خان عبدالغفار خاں سے ان کی قیام گاہ "دارالامن" میں ملنے گئے جو کابل سے دس کلومیٹر دور ہے۔ ۱۳ر ۱۴ر جولائی کو ان کے اور وزیراعظم افغانستان کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی جس میں ویٹ نام۔ تاشقند معاہدہ وغیرہ کے مسائل

؎۱ ایشین ریکارڈر ۔ ۱۹۶۶ء

ASIAN RECORDER- 1966

زیر بحث آئے۔ دونوں ملکوں کے تعلقات خوش گوار بنانے کے لئے سیاسی ثقافتی اور اقتصادی میدانوں میں تعاون پر زور دیا گیا۔ بعد میں انہوں نے کابل یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے مقامی زبان (افغانی) میں تقریر کی۔ انہوں نے اپنے پختون افغان نسل میں ہونے پر فخر کا اظہار کیا، ہند اور افغانستان کے تاریخی تعلق اور یگانگت پر روشنی ڈالی اور افغان عوام کے بنیادی کردار کی تعریف کی۔ ایک غیر ملکی نامہ نگار نے جو برسوں سے افغانستان میں موجود ہے بتایا کہ ذاکر صاحب کا جو شاندار استقبال کیا گیا اور جس خلوص کا اظہار ان کے ساتھ ہوا ایسا کسی بھی غیر ملکی شخصیت کے ساتھ نہیں ہوا۔

یہاں ۱۱ جولائی کو انہوں نے ایک بچوں کے ہسپتال کی بنیاد بھی رکھی جو ہندوستان کی امداد و تعاون سے بنایا جا رہا ہے۔ اسی دن شاہ افغانستان کنگ ظاہر شاہ کے ہمراہ رات کا کھانا کھایا اور انہیں صدر رادھاکرشنن کی طرف سے ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ اس دوران میں افغانستان کے مختلف بزرگان دین کے مزارات پر بھی حاضری دی۔ دورہ ختم ہونے پر ان کا اور وزیر اعظم افغانستان کا مشترکہ اعلان جاری کیا گیا۔ [۱]

---

[۱] ٹائمز آف انڈیا، دہلی۔ کابل ریڈیو۔ بحوالہ ایشین ریکارڈ، نیشنل ڈائری ۱۹۶۶ء۔

NATIONAL DIARY, 1966

تھائی لینڈ

۸ر اکتوبر ۱۹۶۶ء کو تھائی لینڈ کی راج دھانی بنکاک کے ہوائی اڈے پر تھائی حکومت کے سربراہوں نے سواگت کیا۔ دوران قیام میں وہ تھائی لینڈ کی اہم شخصیتوں سے ملے اور مختلف مسائل پر اُن سے بات چیت کی۔ بنکاک یونیورسٹی کے طلبا کو خطاب کیا۔ ہندوستانیوں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ "آپ کو اپنے دیش کا امن، شانتی اور اہنسا کا پیغام اپنے کردار اور عمل سے ہر جگہ پہنچانا چاہیے اور ساتھ ہی اُس ملک کی ترقی میں بھی حصہ لینا چاہیے جس میں کہ آپ رہتے ہیں"۔

کمبوڈیا

۱۱ر اکتوبر کو کمبوڈیا پہنچے۔ یہاں ہوائی اڈے پر اپنے استقبال کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کمبوڈیا آکر میں آج اپنی ایک دیرینہ تمنا پوری کر رہا ہوں کیونکہ یہ ملک ہندوستان سے گہرے کلچرل اور مذہبی رشتے رکھتا ہے۔ کمبوڈیا کے وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ویٹ نام کی جنگ آزادی کا ذکر کیا اور ایشیائی دیشوں کے اتحاد پر زور دیا۔ ذاکر صاحب کے اعزاز میں سرکاری طور پر شاندار ڈنر دیا گیا۔ یہاں انہوں نے نیشنل میوزیم اور کمبوڈیا کی ترقی وغیرہ کی نمائش دیکھی۔ ۱۲ر کو وزیر اعظم سے تفصیلی بات چیت کی اور اُنھیں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی لکھی ہوئی کتابوں کا سیٹ (اُن کے آٹوگراف کے ساتھ) پیش کیا [۱]

---

[۱] ہندوستان ٹائمز، دہلی، ہندو، مدراس - ایشین ریکارڈر ۱۹۶۶ء

ملایا

۱۷؍اکتوبر کو ملایا کی راج دھانی کوالالمپور پہنچے۔ ہوائی اڈے پر تنکو عبدالرحمٰن (وزیر اعظم) اور دیگر سربراہوں نے سواگت کیا اور ۱۰؍میل لمبے راستے پر ان کا جلوس نکالا گیا۔ یہاں اُن کی مصروفیتوں میں تعلیمی اداروں میں مختلف تقریریں، ہندوستانیوں سے ملاقات وغیرہ شامل تھی۔ یونیورسٹی آف ملایا نے اُنہیں ۲۰؍اکتوبر کو ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری دی۔ اس موقعے پر ایک خاص تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔ اُن کا تعارف کراتے ہوئے کہا گیا کہ "وہ نئے ہندوستان کی چند بلند ترین قدروں کے پاسبان ہیں"۔ پروفیسر یوانگ گنوؤ نے اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے ذاکر صاحب کے بلند کردار، تعلیمی اور ملکی خدمات، مذہبی رجحان، مہاتما گاندھی سے تعلق، فسادات دہلی، جامعہ ملیہ وغیرہ کا تذکرہ کیا۔ بعد میں ذاکر صاحب نے تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ذاکر صاحب نے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن کے اعزاز میں ایک لنچ دیا اور اس موقعے پر اپنی تقریر میں دونوں ملکوں کے گہرے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا۔ ۲۱؍اکتوبر کو اپنی رخصتی تقریر میں اُنہوں نے کہا کہ "مجھے یہاں آکر اندازہ ہوا کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور اتحاد کے رشتے کس قدر مضبوط ہیں"۔ اُنہوں نے مختلف مسائل پر بھی اپنے خیالات ظاہر کیے مثلاً انڈونیشیا کی اقتصادی ترقی، انڈونیشیا اور ملایشیا کے سُدھرتے ہوئے تعلقات۔ ویٹ نام۔ ہند پاکستان کشمکش وغیرہ اور چند سوالات کے جواب دیئے جن میں ہندوستان کی طے شدہ پالیسی اور رائے کا

اظہار تھا۔[1]

ایک مخلص کے تاثرات

مولانا عبدالماجد دریابادی اس دوران میں دہلی تشریف لائے۔ ذاکر صاحب کے مہمان ہوئے اور اپنے سفر کے تاثرات کو مخصوص انداز میں قلم بند کیا۔ چنانچہ ذاکر صاحب کے سادہ طرز معاشرت اور رہن سہن سے متاثر ہو کر کہتے ہیں:

"جامعہ ملیہ سے بعد نماز مغرب جب میں رخصت ہونے لگا تو میرے قدیم و بے تکلف دوست ڈاکٹر سعید انصاری نے بھرے مجمعے میں مجھ سے سوال کر دیا کہ "کہئے گورنر بہار اور نائب صدر جمہوریہ میں آپ نے کچھ فرق پایا"؟ —— جواب اسی طرح بے تکلف جھٹ پٹ یہ عرض کر دیا گیا کہ گورنر بہار! میں نے تو پرنسپل جامعہ اور نائب صدر جمہوریہ میں کوئی فرق نہ پایا۔ اور لوگ یہ سُنکر ہنس پڑے —— ہنسی تائید و تحسین کی تھی، انکار یا استعجاب کی نہ تھی۔

لطیفہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ مجھے تو سوائے داڑھی میں قصر ہو جانے (اور اس قصر کو بھی اب مدت ہو چکی ہے) اور عمر کے طبعی تقاضوں کے اور کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ نہ ظاہر میں نہ باطن میں، وہی سادگی، وہی قناعت، وہی صفائی، وہی میٹھی زبان، وہی

---

[1] ملایان ٹائمز، کوالالمپور، ہندوستان ٹائمز، دہلی ہندو، مدراس

ہر ایک سے تواضع، وہی تصنع و تکلف سے اجتناب، وہی تعیشات سے احتیاط، وہی فرض شناسی، وہی اسلام دوستی، وہی بے تعصبی، وہی ذوقِ مطالعہ، وہی گھریلو پن اور وہی شیروانی پاجامہ۔ تین دن کے قیام میں میں نے یہ دیکھا کہ چائے لانے، کھانا کھلانے وغیرہ کی ساری خدمت اپنے ذاتی ملازم (اور ملازم کیوں، اُنہی کی زبان میں "رفیق") قدیم سے لیتے رہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اُنہیں چپراسی وغیرہ سرکاری ملازموں کی کیا کمی تھی جس کوٹھی میں رہتے ہیں وہ محض منسٹروں کے رہنے کی ہے حالانکہ کئی سال سے گورنمنٹ ہاؤس میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں اور گورنر اور منسٹر کے معیار معیشت میں فرق ہی نہیں، فرقِ عظیم ہے۔ گورنری سے ترقی پا کر اس منصبِ عالی پر آنے کے بعد کیا نہیں حق تھا کہ اپنے لیے کوٹھی بھی ویسی ہی طلب کریں جو اپنی آرائش کے لحاظ سے ایوانِ صدر سے کچھ ہی کم ہوتی لیکن اُن کی سادہ مزاجی اور قناعت پسندی نے صدر کیا معنی وزیر اعظم کی بھی کوٹھی طلب نہ کی اور جو جگہ بھی رہنے کو مل گئی بس اُسی پر ہنسی خوشی گذر شروع کر دیا شرافت اور وضع داری اُن کا امتیازی جوہر ہے اور اسلام دوستوں کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ ان کی مذہبیت کا سکہ اونچے حلقوں میں بھی دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ روایت معتبر ذریعے سے سننے میں آئی کہ کسی اونچے سرکاری ڈنر کے

موقعے پر یہ محض اتفاق سے ایک سرکاری افسر کے پاس سے گذرے جو مصروف نا ؤنوش تھے تو وہ معاً تعظیم کے لیے کھڑے تو ہو گئے مگر جس ہاتھ میں گلاس تھا اُسے پیچھے کر کے۔

ایک لطیفہ بھی سُن لیجئے، اب کی ملاقات میں ڈاکٹر تارا چند نے اپنی بڑی محنت سے ایڈیٹ کی ہوئی ایک ضخیم فارسی کتاب دکھائی۔ یہ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب "اُپنشاد" کا فارسی ترجمہ دارا شکوہ کا کرایا ہوا ہے۔ کتاب قابل داد ہے اس کی شکل دیکھ کر دل للچا کر رہ گیا۔ کتاب چھپی ہوئی ایران کی ہے۔ ہندوستان میں اُس کے ملنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے اُس کا ذکر میزبان سے محض ضمناً کر دیا اور اپنے اشتیاق کا قصداً مطلق ذکر نہ کیا۔ یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ تیسرے دن جب میں چلنے لگا تو عین رخصت کے وقت موصوف یک بہ یک بولے کہ "ایک کتاب آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں ڈاکٹر تارا چند کی "اُپنشاد" میرے پاس اس کا ایک نسخہ خالی ہے" میں دنگ رہ گیا کہ اپنے اشتیاق کا تو کچھ ذکر بھی نہ کیا تھا، اُنہیں اس کا علم کیسے ہو گیا۔ بس زبان سے صرف اتنا کہہ سکا کہ اچھا اب معلوم ہوتا ہے آپ کو کچھ کشف صدور بھی ہونے لگا ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ اب ان کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ ایک میل روزانہ صبح کی مشق جاری ہے اور کھانا بھی بالکل پرہیزی اور نپا تُلا کھاتے

ہیں پھر بھی دو شکایتیں زبردست عارض ہیں ایک ذیابیطس اور دوسرے مرض قلب ......" لے

مشی گن یونیورسٹی کو ایڈریس

۲۹ اپریل ۶۷ء کو امریکہ کی مشی گن

یونیورسٹی اپنی ایک سو پچاسویں سال گرہ کا جشن منارہی تھی اس موقعے پر اسپیشل کانوکیشن کو خطاب کرنے کے لیے ذاکر صاحب کو مدعو کیا گیا تھا اور یہ ایک بہت بڑا اور غالباً پہلا اعزاز تھا جو کسی ہندستانی کو ایک امریکن یونیورسٹی کی طرف سے دیا گیا۔ وہ ۲۶ اپریل ۶۷ء کو روانہ ہوکر ۲۷ کو وہاں پہنچے۔ ۲۹ اپریل کو جشن جوبلی کے موقعے پر جو کانوکیشن ہوا اس میں انگلینڈ، یورپ، ایشیا اور دکھنی امریکہ کے مشہور و معروف اسکالر جمع تھے۔ اس موقعے پر دنیا کے ۲۱ اسکالروں کو آنریری ڈگریاں دی گئیں اُن میں ذاکر صاحب بھی شامل تھے۔ جنہیں ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری دی گئی اور اُن کی علمیت اور خدمات کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا گیا۔

مشی گن یونیورسٹی کے ہندوستانی طلبا نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا جس میں قریبی علاقوں کی یونیورسٹیوں کے ہندوستانی طلبا اور سفیر مسٹر بی کے نہرو نے بھی شرکت کی۔ اس پروگرام میں

لے 'صدق جدید' ۴ر اکتوبر ۶۳ء۔

کلچرل پروگرام اور "بسنت اُتسو" بھی شامل تھا۔ انہوں نے ہندستانی آرٹسٹ ایم۔ ایف۔ حسین کی فن مصوری کے شاہ کار بھی دیکھے ۔ لہ

←——ح،ی——→

1 - AMERICAN REPORTER, 10 May 1967

باب ۷

صدارت

نیتِ شب بخیر اے ساقی
بزمِ جم کیا ہے ساغرِ جم کیا

صدارت کے الکشن کا ذکر شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ملک کے عام انتخابات خصوصاً چوتھے الکشن اور اس سے پیدا شدہ حالات کا جائزہ لیا جائے تاکہ صدارت کے الکشن کی نازک صورت حال کا اندازہ ہو سکے۔

جنرل الکشن

دنیا کی نگاہیں اس بار فروری ۱۹۶۷ء میں ہندوستان کی طرف پہلے سے زیادہ فکر اور اندیشے کے ملے جلے

جذبات کے ساتھ لگی ہوئی تھیں کیونکہ اس بار نہ صرف نئے انداز سے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا بلکہ پنڈت نہرو کے بعد سیاسی طور پر جو غیر یقینی حالت پیدا ہو چکی تھی، آج ملک کو کچھ اَن جانے خطروں کی راہیں دکھا رہی تھی۔ ایک غیر ملکی مدبّر مسٹر فلپس۔جی۔ ایچ نے ان حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

"شاستری کے ڈیڑھ سالہ دورِ حکومت میں ملک کو بے شمار الجھنیں درپیش ہوئیں۔ جن کا سامنا تو سیاسی طاقت کے بل پر کیا گیا مگر حل اُن میں سے کسی کو بھی نہ کیا جا سکا۔ بھاشائی اور علاقائی جھگڑوں نے سر اٹھایا، کانگریس کی لیڈر شپ دائیں بازو کی طرف جھکتی نظر آئی، جارحانہ ہندو قوم پرستی کو تقویت ملی اور کانگریس نے اس رجحان کو روکنے کے لئے قطعی کچھ نہ کیا...." [1]

ان حالات اور چند دوسرے اسباب نے مل کر چوتھے الکشن میں حکمراں پارٹی کی طاقت کو زبردست دھکا پہنچایا۔ کانگریس کو پچھلے چناؤ سے ۵ فی صدی ووٹ کم ملے اور ان کا اثر لوک سبھا اور صوبائی اسمبلیوں کی سیٹوں پر اور بھی زیادہ بُرا ہوا۔ مثال کے طور پر اگر پچھلے الکشنوں

---

[1] ALTBACH (Philip G) : Indian Political Scene on the Eve of 1967 Elections 'Orbis' V. 10 (3), 1966

کا ایک خاکہ نظر میں رکھا جائے تو یہ بات کسی قدر زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکے گی۔ لوک سبھا کے فی صدی ووٹوں کا تناسب چاروں الکشنوں میں یوں تھا:

	۱۹۵۲	۱۹۵۷	۱۹۶۲	۱۹۶۷
کانگریس	۴۵ فیصد	۴۸ فیصد	۴۵ فیصد	۴۰ فیصد
بائیں بازو کی پارٹیاں	۲۱ فیصد	۲۱ ″	۲۱ ″	۲۵ ″
دائیں بازو کی پارٹیاں	———	———	۱۴ ″	۱۷ ″

اور چاروں الکشنوں میں صوبائی اسمبلی کے لیے کانگریس کے فیصدی ووٹ کا تناسب ترتیب وار ۶۸ - ۶۵ - ۶۱ - ۵۰ رہا۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں کانگریس نے لوک سبھا کی ۴۹۴ میں ۳۶۱ یعنی ۷۳ فیصدی سیٹیں حاصل کی تھیں اور ۱۹۶۷ء میں اس کو ۵۶۲ میں سے صرف ۲۸۲ یعنی کل ۵۳ فیصدی سیٹیں ملیں۔ اس طرح مرکز میں صرف ۲۰ کی اکثریت سے حکومت بنانے کا "نازک" موقعہ ہاتھ آسکا۔ [۱]

اپوزیشن پارٹیاں

کانگریس کے علاوہ جو دوسری پارٹیاں پچھلے الکشنوں میں حصہ لیتی رہیں اُن میں

---

[۱] 'مین اسٹریم'، ۶ مئی ۱۹۶۷ء - ۱۳

MAIN STREAM 6 May 1967

نہ صرف یہ کہ کوئی بھی پورے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ بلکہ وہ سب مل جل کر بھی حکومت کا کام نہ چلا سکتی تھیں۔ ان میں بڑی پارٹیوں کا ایک نقشہ اس طرح نظر میں لایا جا سکتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی (دونوں بازو) کو پچھلے چار الکشنوں میں لوک سبھا کے ووٹوں کی تقسیم ترتیب وار ۳ - ۹ - ۱۰ - ۹ تھی ۔ سوشلسٹ پارٹی (دونوں گروپ) کے فیصد ووٹ حسب ترتیب ۱۶ - ۱۰ - ۹ - ۱۱ رہی ۔ جن سنگھ کے ۳ - ۶ - ۶ - ۹ اور سوتنتر پارٹی کے جو پہلے دو الکشنوں کے بعد بنی ، صرف آخری دو الکشنوں میں فیصد ووٹ ۸ - ۸ ملے ۔ [1] صوبائی اسمبلیوں اور لوک سبھا کی سیٹوں میں بھی موجودہ الکشن میں جن سنگھ سوتنتر پارٹی اور کمیونسٹ پارٹیوں نے پہلے سے کافی زیادہ سیٹیں حاصل کر لی تھیں ۔

صوبوں میں

چوتھے الکشن کے نتائج نکلے تو کئی صوبوں میں کانگریس کو حکومت بنانا دشوار ہو گیا ۔ کانگریس کی طاقت کے اعتبار سے صوبوں کے چار گروپ اس طرح ترتیب دیئے جا سکتے ہیں :

---

[1] "راؤنڈ ٹیبل" جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ۲۸۵

ROUND TABLE July '67 P. 285

POLITICAL SCIENCE REV. (Gen. Election No.) Apl.—Sep. '67

پہلا گروپ : مدھیہ پردیش - راجستھان - آسام -
دوسرا : اُڑیسہ - گجرات - میسور - مہاراشٹر - ہریانہ -
تیسرا : مدراس - ویسٹ بنگال - کیرالہ
چوتھا : یوپی - بہار - آندھرا - پنجاب -

مجموعی طور پر ۱۶ میں سے صرف آٹھ میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہو سکی، پانچ صوبوں (بہار، پنجاب، راجستھان، یوپی، ویسٹ بنگال) میں وہ صرف سب سے بڑی پارٹی بن کر رہ گئی اور تین صوبوں (اُڑیسہ، مدراس، کیرالہ) میں صرف ایک ہی اپوزیشن پارٹی کانگریس پر غالب آگئی۔ کانگریس کی حکومت والے صوبوں میں بھی بعض صوبے مثلاً ہریانہ اور یوپی جہاں الکشن کے بعد مارچ میں کانگریس کی وزارت بنی تھی ایک ہی مہینے کے اندر "آیا رام گیا رام" کی بدولت کانگریس کے ہاتھ سے نکل گئے اور وہاں اپوزیشن کی ملی جلی حکومتیں بن کر جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ ملک کے بڑے شہروں مثلاً دہلی۔ مدراس۔ کلکتہ بمبئی۔ احمد آباد وغیرہ میں پانسہ کانگریس کے خلاف گرا۔

پارٹی پوزیشن

لوک سبھا میں موجودہ اور پچھلے الکشن کی پارٹی پوزیشن اس طرح تھی :

	۱۹۶۷ء	۱۹۶۲ء
کانگریس	۲۸۲	۳۶۱
سوتنتر پارٹی	۴۴	۱۸

جن سنگھ	۳۵	۱۴
ڈی ایم کے	۲۵	۷
ایس ایس پی	۲۳	۶
کمیونسٹ (رائٹ)	۲۳	۲۹
——— (لیفٹ)	۱۹	
پی ایس پی	۱۳	۱۲
آزاد وغیرہ	۵۴	۴۷

۶۷ء میں کل سیٹیں ۵۲۰ اور ۶۲ء میں ۴۹۴ تھیں۔

صوبائی اسمبلیوں میں (۱۹۶۷ء) پارٹی پوزیشن یہ تھی: ۱؎

کُل سیٹیں	۳۲۶۲
کانگریس	۱۵۵۱
سوتنتر	۲۵۶
جن سنگھ	۲۵۸
کمیونسٹ (رائٹ)	۱۱۸
کمیونسٹ (لیفٹ)	۱۲۵
ایس ایس پی	۱۷۵

۱؎ KISSING'S CONTEMPORARY ARCHIVES, 1967-68

پی ایس پی	۱۰۶
آزاد وغیرہ	۱۶۵

صدارت کا مسئلہ

الکشن کی گرما گرمی ختم ہوئی تو صدارت کے چناؤ کا مسئلہ سامنے آیا۔ اپوزیشن پارٹیوں اور کانگریس کی تازہ پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے ضروری تھا کہ یہ مسئلہ نازک صورت اختیار کرلے۔ اپوزیشن پارٹیوں نے اس نزاکت سے پورا فائدہ اٹھایا مگر افسوس کہ کسی ہوش مندی اور تدبر کا ثبوت اُنھوں نے نہیں دیا۔ اُن کے ہر عمل سے یہ بات نمایاں ہوتی تھی کہ صرف کانگریس کی دشمنی ان کے پیش نظر ہے اور بعض صوبوں کی کولیشن (ملی جلی) حکومتوں میں جس طرح آپس کی کش مکش سے جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ یہی صورت وہ مرکز میں بھی چاہتی ہیں چاہے ملک میں انار کی پھیلے، انتشار بڑھے پھوٹ پڑے، اُن کی بلا سے کچھ ہو مگر مرکز میں کانگریس کی نیا ڈانواں ڈول ہو جائے۔ دوسری طرف کانگریس کو یہ خوف کھائے جاتا تھا کہ آدھے سے زیادہ صوبے تو ہاتھ سے گئے۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ مرکز میں بھی شامت اعمال رنگ دکھلائے اور "آیا رام گیا رام" کے بعد "بولو رام" کی نوبت بھی آنے لگے۔ اسی ڈر کی وجہ سے ذاکر صاحب کو امیدوار بنانے کا سوال کانگریسیوں میں کافی بحث و مباحثے کا موضوع بنا رہا۔

فروری کے آخری ہفتے سے ہی صدارت کے بارے میں خبریں اور مشورے شروع ہو چکے تھے مگر اس وقت تک اپوزیشن کے لیڈروں نے کوئی نقطۂ نظر

پیش نہ کیا تھا البتہ سنجیدہ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ کانگریس اور اپوزیشن پارٹیوں کو مل بیٹھ کر کوئی ایسا نام سامنے لانا چاہیئے جس پر سبھی کو اتفاق ہو اور یہ مسئلہ بغیر کسی اختلاف کے طے ہو جائے مگر کانگریس اور سات اپوزیشن پارٹیوں کی رسہ کشی دیکھتے ہوئے یہ دشوار نظر آتا تھا۔

ایس ایس پی کے چیرمین مسٹر جوشی نے ۳۱ مارچ کو ایک بیان میں کہا کہ ذاکر صاحب سے صدارت کے لیئے درخواست کی جائے اور ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ معاملہ جوں کا توں رہے مگر ذاکر صاحب نے آیندہ ٹرم کے لئے نائب صدارت سے انکار کر دیا کیونکہ بہ یک وقت راجیہ سبھا اور نائب صدارت کی ذمہ داریاں اب ان کے لئے ممکن نہ تھا اس لیئے وہ ریٹائر ہو کر اپنے جامعہ نگر والے مکان میں رہنے کا فیصلہ کر چکے تھے[1]

اپریل کے پہلے ہفتے میں یہ دوڑ دھوپ اور زیادہ تیز ہو گئی۔ اپوزیشن پارٹیاں آپس میں مشورے کر رہی تھیں مگر کسی بات پر متفق نہ تھیں سمجھدار حلقوں کی رائے تھی کہ کم از کم صدارت کے نام پر سب کا اتفاق ہو جانا چاہیئے۔ کانگریس کی طرف سے مسز اندرا گاندھی مسٹر مسانی (سوتنتر پارٹی) سے گفت گو کر رہی تھیں تا کہ اپوزیشن اور کانگریس کو کسی بھی نام پر ایک رائے کیا جا سکے۔ ادھر کانگریس کے اندر دو گروپ تھے۔ ایک ڈاکٹر

---

[1] یہ منظور احمد کا بھی بیان ہے اور دیگر ذرائع سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے علاوہ ازیں مسٹر نورانی نے بھی اپنی کتاب میں یہی لکھا ہے۔

رادھا کرشنن کو صدر اور ذاکر صاحب کو بدستور نائب صدر رکھنے کا حامی تھا، دوسرا ذاکر صاحب کو صدر بنانا چاہتا تھا۔ چار اپوزیشن پارٹیوں نے مسٹر جے پرکاش نرائن کا نام لیا جس کی جن سنگھ اور کمیونسٹوں نے مخالفت کی۔ مسٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ اور مسٹر مہر چند مہاجن کے نام بھی زبانوں پر آئے مگر جے پرکاش نرائن اور سی۔ ڈی دیش مکھ کی طرف سے ذاکر صاحب کے نام کی حمایت کی گئی۔ اپوزیشن میں بھی کئی لوگ ذاکر صاحب کی حمایت میں تھے لیکن آخر کار وہ متفق صرف اس پر ہو سکے کہ صدر اور نائب صدر کانگریسی نہ ہونا چاہیئے۔

سبارائو اور علی یاور جنگ

۴ راپریل کو اپوزیشن لیڈروں نے مسز گاندھی کو خط لکھا اور مسٹر سبارائو کو صدر اور مسٹر علی یاور جنگ (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو نائب صدر بنانے کی سفارش کی کیونکہ ان دونوں ناموں پر زیادہ تر اپوزیشن پارٹیاں متفق ہو چکی تھیں صرف علی یاور جنگ کے نام سے جن سنگھ کی تیوریوں پر بل تھا، اور یہ کچھ بعید از قیاس بھی نہ تھا۔ ویسے بھی مسٹر علی یاور جنگ ہندوستان سے باہر تھے اور ان کی رضامندی کا زیادہ امکان بھی نہیں تھا۔ ۵ راپریل کی میٹنگ میں کانگریس پارلیمنٹری بورڈ نے ذاکر صاحب اور مسٹر وی وی گری کا نام منظور کیا، تاہم باقاعدہ اعلان نہیں کیا

اصول یا اندیشے

صدر کانگریس مسٹر کامراج الکشن سے پہلے تو ذاکر صاحب کے حق میں تھے مگر الکشن کے

بعد صورت حال نازک دیکھ کر ان کی رائے بدل گئی وہ ذاکر صاحب کو نامزد کر کے خطرہ مول لینا نہ چاہتے تھے لیکن مسز اندرا گاندھی کی رائے تھی کہ ذاکر صاحب جیسا اہل اور باصلاحیت آدمی ہوتے ہوئے ان کو نظر انداز کرنا غلط ہوگا اور پہلے کی روایت کے مطابق بھی موقع انہی کو دیا جانا چاہیے مسٹر چوان اور مسٹر فخر الدین نے انہیں اپنے اُصول پر قائم رہنے میں مدد دی اور ان سب نے یہ اٹل فیصلہ کر لیا کہ شکست ہو جائے تو پرواہ نہیں، لیکن اصول سے ہٹ جانا زیب نہیں دیتا، خطرات سے گھبرا کر صحیح فیصلے کو ٹالنا غلط ہے، دانش مندی نہیں ہے ۔ اصولوں کا توڑنا اور آدرشوں پر جمے نہ رہنا ہی اصل شکست ہے۔ لہٰذا جب ۵ راپریل (بُدھ) کی شام کو میٹنگ ہوئی تو مسز گاندھی اپنی تجویز پر مضبوطی سے ڈٹ گئیں۔ مسٹر جگجیون رام اور مسٹر اتولیہ گھوش بھی اُن کی حمایت میں تھے ۔ اُدھر مسٹر کامراج کے ساتھ مسٹر مُرار جی ڈیسائی اور مسٹر پاٹل دے رہے تھے ۔ نوّے منٹ کی گفتگو کے بعد بورڈ نے فیصلہ صدر اور وزیر اعظم پر چھوڑ دیا۔ لیکن یہ بات تقریباً صاف ہو گئی کہ صدارت کے لیئے مقابلہ ضرور ہوگا ۔ ۸ راپریل کو ایک خبر یہ بھی تھی کہ مسٹر ڈانگے نے اپوزیشن لیڈروں کو ذاکر صاحب (صدر) اور مسٹر سبا راؤ (نائب صدر) کے فارمولے پر رضا مند کر لیا ہے صرف جن سنگھ اور ڈی ایم کے نے مخالفت کی مگر کانگریس کے لیڈر بھی اس پر تیار نہ ہوئے اور اس طرح ایک رائے سے صدر چُنے جانے کا امکان بالکل ہی ختم ہو گیا۔

ناخوشگواریاں

مسز گاندھی اپنے فیصلے پر اٹل تھیں، اس کو انہوں نے اپنے وقار کا سوال بنا لیا تھا۔ وہ اس پر تیار تھیں کہ اگر ذاکر صاحب کو نامزد نہ کیا گیا تو وہ استعفےٰ دیدیں گی بسز مصرا وغیرہ نے انہیں ہر چند سمجھایا کہ ذاکر صاحب کے ہارنے کی صورت میں نہ صرف کانگریس کو دھکا پہنچے گا بلکہ ہمارے سیکولر ڈھانچے کو بھی اندر اور باہر سخت ٹھیس لگے گی کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اسمبلیوں کے کچھ کانگریسی ممبر (خصوصاً ہندی والے علاقوں کے) اور کچھ ایم۔ پی ذاکر صاحب کو ووٹ نہ دیں۔ اسی قسم کے "خوف" مسٹر سی۔ بی گپتا نے بھی دلائے تھے لیکن وہ اپنے فیصلے سے ذرا بھی نہ ہٹ سکیں اور اب اُن کے اور مسٹر کامراج کے درمیان یہ ناخوشگواری پیدا ہونے لگی کہ اُمیدوار نامزد کرنے کا حق صدر کو ہے یا وزیر اعظم کو۔ یہی وجہ تھی کہ جب اپوزیشن پارٹیوں کی میٹنگ اُنہوں نے بُلائی اور اپوزیشن نے ان اختلافات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مانگ کی کہ اس میٹنگ میں صدر کانگریس بھی موجود ہوں تو میٹنگ ہی ملتوی کردی گئی اور اس طرح اگلے دن اپوزیشن نے مسٹر سُبا راؤ کو نامزد کیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن ان حالات سے افسردہ ہوئے اور اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا۔

بورڈ کی منظوری

اس دوران میں صوبائی کانگریس کے صدرں اور سکریٹریوں کی میٹنگ اور استقبالیہ جلسے میں مسز گاندھی کی تجویز پر کامراج نے مسٹر صادق علی (سکریٹری کانگریس)

سے کہا کہ اگلے دن پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ بلائیں لیکن اپوزیشن کے اعلان اور را دھا کرشنن کے فیصلے کے بعد مسز گاندھی نے اپنے اسسٹنٹ کو کافی رات گئے کامراج کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ بورڈ کی فوری میٹنگ بُلائی جائے مگر جواب آنے سے پہلے خود بات کرنے پہنچ گئیں۔ بورڈ کی میٹنگ پھر بھی نہ بُلائی جا سکی۔ اگلے دن (۱۰ اپریل) ذاکر صاحب کا نام تجویز ہو کر منظور ہو گیا لیکن مسز گاندھی کی یہ خواہش کہ اپوزیشن پارٹیوں کا تجویز کردہ نائب صدر کا نام منظور کر لینے کی اس شرط پر بات چلے کہ وہ ذاکر صاحب کا نام صدارت کے لیئے منظور کر لیں، نامنظور ہوئی اور مسٹر وی۔ وی گری (گورنر میسور) کا نام منظور کیا گیا۔

مسانی اِندرا بات چیت

اس دوران میں مسز گاندھی نے برابر یہ کوشش جاری رکھی کہ اپوزیشن پارٹیاں ذاکر صاحب کے نام پر متفق ہو جائیں۔ ان کے اور مسٹر مسانی کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ اُنہوں نے مسٹر مسانی کو لکھا تھا کہ "اپوزیشن نے جس طرح کانگریس کو اطلاع اور مشورے کے بغیر اپنے امیدوار کا اعلان کیا وہ فضا ہموار کرنے میں مددگار نہیں ہوگا چیف جسٹس کی شخصیت بہت محترم ہے اور سیاسی اختلافات میں گھسیٹنے کے لئے مناسب نہیں۔ آخر میں امید ظاہر کی کہ جس طرح کچھ دن پہلے چند اپوزیشن لیڈروں اور خود مسٹر مسانی نے ذاکر صاحب کے نام کی تائید کی تھی وہ اب بھی ایسا ہی کرینگے۔ ۱۵ اپریل کو اُنہوں نے پھر ایک خط اپوزیشن کے لیڈروں کو لکھا اور ذاکر

صاحب کے لئے اپیل کی۔

راجیہ سبھا میں تحسین

راجیہ سبھا سے ذاکر صاحب کی علیحدگی کے وقت تمام پارٹیوں کی طرف سے اُنھیں خراج تحسین پیش کیا گیا (۱۱ اپریل)۔ مخالف لیڈروں نے اُن کی ذہانت، رواداری اور صبر و تحمل کی تعریف کی کمیونسٹ لیڈر مسٹر بھوپیش گپتا نے کہا کہ "ذاکر صاحب نے اپوزیشن کے حقوق کی حفاظت کی، ہم اُن کے ممنون ہیں" اسی طرح اور لیڈروں نے بھی سراہا۔

نام زدگی

۱۱ اپریل کو کاغذات نامزدگی داخل کیے گئے بہ تجویز اندرا گاندھی اور بہ تائید چوان اور فخرالدین علی احمد ذاکر صاحب کا نام پیش ہوا اور ۱۵ اپریل کو نامزدگی منظور ہوئی۔ اپوزیشن کی طرف سے مسٹر سبا راؤ اور پروفیسر حبیب (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کے نام منظور ہوئے۔

الکشن کی سرگرمیاں

کانگریس کو پارلیمنٹ میں قطعی اکثریت حاصل تھی اس لئے نائب صدر کی کامیابی تو یقینی تھی لیکن صدر کے الکشن میں یہ بات نہ تھی۔ اپوزیشن کو اپنی کامیابی کی امید صرف کانگریسی ممبران پارلیمنٹ کے توڑے جانے پر تھی اس لئے دونوں ہی طرف سے ووٹروں کو توڑنے کے لیے ہر اچھا اور بُرا طریقہ استعمال کیا جانے لگا۔ پارٹی سے غداری کی ترغیبوں نے صدارت کے الکشن کو میونسپلٹی کا چُناؤ بنا دیا۔ کانگریس کو نیچا دکھانے اور مرکز میں حکومت توڑنے کے لیے

مذہب، فرقہ، ذات پات کا ہر اوچھا حربہ استعمال ہوا اور سنجیدہ اخبار تک چلا اُٹھے کہ "صدارت کا مسئلہ ہے یا ایک قیامت" (اداریہ 'الجمعیۃ')۔

ذاکر صاحب کے خلاف مہم چلانے میں دو پارٹیاں پیش پیش تھیں یعنی جن سنگھ اور کمیونسٹ۔ ان میں جن سنگھ کی وجہ تو ظاہر ہے کمیونسٹوں کا عذر یہ تھا کہ ذاکر صاحب موجودہ سوشلسٹ ممالک (کمیونسٹ بلاک) کے حالات سے دلچسپی نہیں لیتے۔

الزامات اپوزیشن پارٹیوں میں ہر رنگ کے لوگ اور پارٹیاں تھیں، ہر قماش کے لیڈر موجود تھے۔ جن میں اختلاف تو تھا ہر مسئلے پر اور اتفاق صرف ایک یعنی کانگریس کی دشمنی پر ——!۔ فرقہ پرست اخباروں نے ذاکر صاحب کی مخالفت کے جوش میں اُنکی ذات پر بھی اس قسم کے حملے کئے جن سے اپوزیشن کے ہی دو کٹر لیڈروں نے مخالفت اور ندامت کا اظہار کیا۔ راجدھانی کے ایک مشہور فرقہ پرست اخبار نے اپنی ۲۳ اپریل کی اشاعت میں ذاکر صاحب پر اوچھے الزام لگائے، یعنی:

۱۔ جب پنڈت نہرو نے ہندوستان کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کا ارادہ کیا تو ذاکر صاحب نے ایسا کرنے سے روکا۔

۲۔ جب ان کی نواسی نے ڈی۔ آئی۔ جی بہار مسٹر ڈی پی مصرا سے شادی کرنا چاہی تو اُنہوں نے اصرار کیا کہ مصرا اسلام قبول کرے اور کم

از کم ایک سال مسلمان رہے اس میں اُنہیں کامیابی ہوئی۔ اُنہوں نے خود مصرا کو نماز وغیرہ سکھائی اور ستمبر ۱۹۶۵ء میں یہ شادی ہوئی۔

۳۔ ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر جوشی کے قتل کے سلسلے میں جھوٹی گواہی دی۔ اُس کی دیکھا دیکھی اسی ذہن و دماغ کے ایک اُردو اخبار نے ایڈیٹوریل لکھ لکھ کر اُنہیں پُرانے ٹائپ کا "وکھٹ مُلّا" بتایا۔ اِن حضرت نے یہ دو الزام اور عاید کیے جو پیش تو میں یہاں کر رہا ہوں، فیصلہ آپ کریں کہ ان پر ہنسیں یا روئیں۔

۱۔ جامعہ کی جوبلی (۱۹۴۶ء) کے موقعے پر مسٹر جناح کو بلایا۔

۲۔ فلم اسٹار شرملا ٹیگور نے جب نواب پٹودی سے شادی کرنے کے لیے اسلام قبول کیا تو اس موقعے پر آپ موجود تھے۔

ذاکر صاحب سے ایک ملاقات میں کسی اخباری نمایندے نے اِن خرافات کا ذکر کیا تو اُنہوں نے بڑے دُکھ سے کہا "خدا کا شکر ہے کہ اُنہیں میری زندگی میں صرف تین ہی دھبے نظر آئے"۔ بمبئی کے ڈاکٹر حمید نے اس صورت حال پر افسوس کرتے ہوئے ایک بیان میں کہا کہ کانگریس کے مخالفین فرقہ وارانہ اور اینٹی نیشنل رویّہ اختیار کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان کسی بھی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے کسی شخص سے قوم پروری اور دیش بھگتی میں کم نہیں ہیں۔ اُنہوں نے ہندوستان پاکستان جنگ میں مسلمانوں کا کردار یاد دلایا اور کہا کہ "مسلمانوں کی وطن دوستی کا اعتراف خود شاستری نے پارلیمنٹ میں کیا تھا"۔

جے پر کاش نرائن

۲۲ اپریل کو مسٹر جے پرکاش نرائن نے ایک بیان میں ذاکر صاحب کی پُرزور حمایت کی۔ اُنہوں نے اپوزیشن کو تنگ نظری ترک کرنے کا مشورہ دیا اُنہوں نے کہا کہ "اگر ذاکر صاحب کو صدر نہ بنایا گیا تو ملک میں انتشار پھیلے گا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا"۔ اس پر ایک "بزرگ" نے فرمایا کہ "جے پرکاش ایک اور پاکستان بنوانا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو بھڑکا رہے ہیں"۔ [1] غرض یہ کہ بیانات کی ایک بھرمار تھی اور خیالات کا طومار

صدارت کا چُناؤ اور اخبارات

'بلٹز' نے ایک مرتبہ لکھا کہ صدارت کے لیئے ذاکر صاحب کے حق سے گریز کرنے سے سخت نا قابل تلافی نقصان اُس وقار کو پہنچے گا جو ہندوستان نے سیکولر ملک کی حیثیت سے دنیا میں حاصل کیا ہے۔ دنیا کے ملکوں پر اس کا بڑا برا ردِ عمل ہو گا"۔ ہندوستان ٹائمز نے ذاتی الزامات اور چھچھورے پن کے بیانات دیکھ کر سوال کیا کہ "اگر ایک اچھا اور سچا مسلمان نیشنلسٹ نہیں ہو سکتا تو ایک اچھا اور سچا ہندو کس طرح ہو سکتا ہے"۔

---

[1] حالانکہ مسٹر نرائن کا یہ مقصد کہیں دور دور بھی نہ تھا۔ معمولی سوجھ بوجھ کا انسان بھی یہ جان سکتا ہے کہ ان کا اشارہ بعض صوبوں میں کولیشن حکومتوں کی رسّہ کشی اور اپوزیشن پارٹیوں کی رنگ برنگی پالیسی اور سیاست کے خطرات کی طرف تھا۔

'عصرِ جدید' (کلکتہ) نے لکھا کہ: "ذاکر حسین اس ملک کی وہ عظیم شخصیت ہے جسکے علم و فضل، خدمت و ایثار اور اخلاق و کردار کا ڈنکا بج رہا ہے"۔

'ٹائمز' (لندن) نے لکھا: "اگر وہ ناکام ہوئے تو ہندوستان کے سیاسی بحران اور انتشار میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا"۔

'ندیم' (بھوپال) نے لکھا: "ذاکر صاحب کے معاملے میں جو لوگ ہندو مسلم کی اصطلاحوں میں سوچتے ہیں وہ ملک کے بدترین دشمن اور غدّار ہیں۔ اُن کی کامیابی سے ملک میں سیکولرازم کو طاقت ملیگی اور بیرونی دنیا کو بھی ہندوستان کی سیکولر دستور کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑے گا"۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بحث اخبارات میں یہ بھی چل پڑی تھی کہ ذاکر صاحب کا انتخاب ہندوستان کے سیکولرازم کا ثبوت ہوگا۔ یہ بات غالباً کسی کانگریسی لیڈر کی زبان سے ذاکر صاحب کی حمایت میں نکل گئی تھی جسے لے کر مخالف اور موافق اخباروں نے خوب خوب زورِ قلم دکھلایا 'الجمعیتہ' کا خیال تھا کہ یہ جوڑ سیکولرازم سے ملایا جائے گا تو ایسے سوال پیدا ہوں گے جن کا جواب دینا ذرا مشکل ہوگا۔ 'ویک انڈ ریویو' اور 'ہندوستان ٹائمز' نے اس موضوع پر ذرا کھل کر لکھا کہ "ذاکر صاحب کو مسلمان ہونے کے نام پر درمیان میں لانا خود اپنی چھپی ہوئی فرقہ واریت کو اُجاگر کرنا ہے۔ اُن کا نام اس لئے صدارت کے لئے نہیں لیا گیا کہ وہ

مسلمان ہیں بلکہ اس لیئے ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام دنیا میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں..... کانگریسی ممبران کی وفاداری کو سیکولرازم کے کانٹے پر رکھا گیا ہے ورنہ کیا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان ہر طرح برابر کے شہری ہیں؟ کیا سماجی اور معاشی میدانوں میں اُن کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جاتا ہے؟ سیکولرازم کی جانچ کے لیئے یہ ضروری نہیں کہ ہم کسی مسلمان کو صدر بنالیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ہم معلوم کریں کہ کیا ہم نے مسلمانوں کو اس ملک کی قومی زندگی میں اپنی مکمل صلاحیتوں کو پورے طور پر پیش کرنے کا موقع فراہم کیا ہے؟ چونکہ ہم اس تجربے میں ناکام ہو چکے ہیں اس لیئے ہم صدارتی الکشن کے لیئے بھی سیکولرازم کو کسوٹی پر نہیں رکھ سکتے" (ویک انڈ ریویو)

اپوزیشن کے لیڈروں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ ذاکر صاحب کی ہار اندرا گورنمنٹ کی ہار ہوگی اور پھر کانگریس کو مرکز میں حکومت کرنے کا حق نہ رہے گا۔ یہی سب سے بڑا خطرہ تھا جس کو کانگریسی ممبران مول لینے کے لیئے تیار نہ ہو سکتے تھے اور مجبور تھے کانگریس کے نامزد امیدوار کو ووٹ دینے کے لیئے۔ چنانچہ راج دھانی کے ایک باوقار انگریزی رسالے 'مین اسٹریم' نے لکھا تھا:

"اندرا گاندھی کے ساتھیوں کے لیئے سوچنے کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ اگر ڈاکٹر ذاکر حسین کامیاب نہ ہو سکے تو اندرا گورنمنٹ کو استعفیٰ دینا پڑے گا اور نتیجے میں لوک سبھا کے لیئے درمیانی مدت کے الکشن

ہوں گے۔ عام انتخابات کا دوبارہ سامنا نہ کرنے کی پیش بینی نے کانگریسی ممبران کی ایک بڑی تعداد کو خوف زدہ کر دیا اور انہوں نے ترجیح دی کہ کانگریسی امیدوار کو ناکام بنانے کا جوا کھیل کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑی نہ ماریں"۔ ؎۱

ووٹ کی قیمت اور حساب

ووٹ کی قیمت اس طرح تھی کہ کسی صوبے کی آبادی کو صوبائی اسمبلی کے ممبران کی تعداد سے تقسیم کر دیا جائے۔ مثلاً

صوبہ یوپی کی کل آبادی = ۷۳۷۴۶۴۰۱

اسمبلی کے ممبروں کی تعداد = ۴۲۵

تقسیم کرنے پر = ۱۷۴

لہذا یہی ایک ایم ایل اے کے ووٹ کی قیمت ہوئی۔ اسی طرح ہر صوبے میں الگ قیمت ہوگی۔ ایک ایم پی (ممبر پارلیمنٹ) کے ووٹ کی قیمت ۵۷۶ تھی۔ ووٹروں کے لئے اپنے صوبے کی راج دھانی میں ووٹ دینے کا انتظام تھا۔ اس الکشن میں کل ۴۱۳۱ ووٹ تھے جن کی مجموعی قیمت ۸۶۱۷۰۲ تھی۔ کانگریس کے ۲۸۲ ممبر لوک سبھا میں اور ۱۵۳ راجیہ سبھا میں تھے۔ اپوزیشن کے سب ملا کر صوبائی اسمبلیوں میں ۱۶۷ ایم ایل اے کانگریس سے زیادہ تھے۔ پھر بھی کانگریس کو مجموعی طور پر ۲ فیصدی سے

---

1. 'MAIN STREAM' 20 May, 1967

کچھ کم اکثریت ساری اپوزیشن پارٹیوں پر تھی - اس حساب کتاب کو سامنے رکھ کر ہر شخص اپنا اندازہ لگا سکتا تھا۔

صدارت کے پہلے الکشن

۱۹۵۲ء میں اپوزیشن کے امیدوار کے۔ٹی۔شاہ تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو ۵۰۷۴۰۰ اور شاہ کو ۹۲۸۲۷ ووٹ ملے تھے۔ تین دوسرے امیدواروں کو ۵۱۵۹ ووٹ ملے۔ ۱۹۵۷ء میں راجن بابو کو ۴۵۹۶۹۸، ہری رام اور نگیندر ناتھ داس کو ۲۶۷۸ ووٹ ملے۔ ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کو ۵۵۳۰۶۷، ہری رام کو ۶۳۴۱، جمنا پرشاد کو ۳۵۲۷ ووٹ ملے تھے۔

مختلف صوبوں میں

راجستھان میں کانگریس کے ۸۰ ممبر تھے لیکن ۹۳ ووٹ ملنے یقینی تھے جن میں دو سنگھی بھی شامل تھے جو کانگریس میں آئے تھے علاوہ ازیں شتر ول کا سٹ کے چار پانچ اور کچھ جنتا پارٹی کے ووٹ بھی ملنے کی امید تھی۔ لوک سبھا کے ۲۳ میں ۸ کانگریس کے، ۸ سوتنتر ۳ جن سنگھ ۲ آزاد ممبر تھے۔ جن سنگھ کو امید تھی کہ مہاراجہ کوٹہ اس کے حق میں ووٹ دیں گے۔ آزاد ممبر مہاراجہ برجندر سنگھ (بھرت پور) ذاکر صاحب کے حق میں تھے۔ پنجاب اور ہریانہ میں کل سیٹیں ۱۰۴ تھیں جن میں پیپلز یونائیٹڈ فرنٹ ۵۴ اور کانگریس کی ۴۸ تھیں۔ بہار میں ایک جیت کانگریس کو یہ تھی کہ ذاکر صاحب پانچ سال گورنر رہ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے فراخ دلانہ برتاؤ، مقصد کی لگن اور بالغ نظری سے بڑا اثر ڈالا تھا چنانچہ

صوبائی کانگریس میں اگرچہ فرقہ وارانہ نظریات والے بھی کچھ لوگ تھے مگران کے دلوں میں بھی ذاکر صاحب کے لئے ایک نرم گوشہ موجود تھا مدراس میں ڈی۔ ایم۔ کے تمام پارٹیوں پر غالب تھی اُس نے آخر تک اپنا فیصلہ ظاہر نہیں کیا (عین الکشن کے دن مسٹر سبا راؤ کے حق میں فیصلہ کیا)۔ دوسرے ووٹ مثلاً سوتنتر وغیرہ بھی خلاف تھے صرف کانگریسی ووٹ ذاکر صاحب کو مل سکتے تھے۔ آندھرا اور یوپی میں دونوں کے ووٹ تقریباً برابر رہنے کا اندازہ تھا۔ مدھیہ پردیش میں کانگریس کے کُل ۱۶۷ ووٹ تھے اور لگ بھگ اتنے ہی ملنے کی امید تھی۔ پچھمی بنگال میں یونائیٹڈ فرنٹ نے اپنی پارٹیوں کو آزاد چھوڑ دیا تھا لیکن فارورڈ بلاک اور بنگلا کانگریس کے کافی ووٹ کانگریس کو ملنے کا امکان تھا۔ میسور میں کانگریس کی پوزیشن مضبوط تھی یہاں کُل اسمبلی ممبر ۲۱۶ جس میں کانگریس کے ۱۲۶، پی ایس پی کے ۲۱، ایس ایس پی ۷، سوتنتر ۱۵، جن سنگھ ۴، کمیونسٹ ۲ اور آزاد ۴۱ تھے۔

کانگریس کے لئے ایک بڑی پریشانی کا سبب آزاد ممبر تھے جن کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ ہر صوبے میں اگر کانگریس برسرِ اقتدار ہوتی تو کچھ ایسا خطرہ نہ ہوتا کیونکہ آزاد ممبر عام طور سے برسرِ اقتدار گروپ کی طرف آسانی سے لڑھک جاتے ہیں مگر اول تو آٹھ نو صوبوں میں اپوزیشن پارٹیاں حکومت کر رہی تھیں دوسرے یہ کہ بعض جگہ اپوزیشن کی کُل سیٹوں کی تعداد سے کانگریس کی سیٹیں تھوڑی ہی بڑھی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے آزاد امیدوار ترازو کا

پڑا کسی بھی طرف کو جھکا سکتے تھے۔ اپوزیشن نے یہ بھی کیا کہ صدر کانگریس اور اندرا گاندھی کے اختلاف کو بڑی ہوشیاری سے اپنے حق میں استعمال کیا اور کانگریسی ممبروں کو شبہ میں ڈال کر گمراہ کرنا چاہا لیکن اس غیر یقینی ماحول میں جن سنگھ کی طرف سے ذاکر صاحب پر جو فرقہ وارانہ انداز سے حملے کیئے گئے وہ اُن کے لیئے باعث خیر اس طرح ثابت ہوئے کہ اُنہیں عام طور پر سنجیدہ اور سمجھ دار ممبروں کی ہمدردیاں حاصل ہوگئیں [1]

الکشن شروع ہوا

۸ مئی تک تمام ممبران پارلیمنٹ دہلی میں جمع ہوگئے اور الکشن شروع ہوا اسی دن یعنی ۶ مئی کو مسٹر گری کے منتخب ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ صدارت کے نیتجے کا اعلان ۹ مئی بروز منگل کو ہونا تھا چونکہ مختلف صوبوں کے ووٹوں کا شمار ہونا تھا۔ چنانچہ ۹ مئی کو دس بجے دن ووٹوں کی گنتی شروع کیگئی اور تین بجے نیتجے کا اعلان ہوا۔ ذاکر صاحب ۱۰۷۲۷۳ ووٹوں کی اکثریت سے جیتے۔ اُنہیں ۴۷۱۲۴۴ ووٹ ملے، مسٹر راؤ کو ۳۶۳۹۷۱ ملے۔ ممبر پارلیمنٹ کے ووٹ ذاکر صاحب کو ۴۴۷ اور مسٹر راؤ کو ۲۷۸۔ ایم ایل اے کے کُل ووٹ ذاکر صاحب کو ۲۱۶۶ اور مسٹر راؤ کو ۱۸۲۹ ملے۔ صدارت کے پندرہ اُمیدوار تھے جن میں نو کو ایک بھی ووٹ نہ ملا۔

مختلف صوبوں میں ووٹوں کا خاکہ اس طرح رہا۔

---

[1] 'لنک'، ۷ مئی ۱۹۶۷ء۔ LINK, 7 May '67

صوبہ	ایک ووٹ کی قدر	ذاکر حسین	شبا راؤ	کانگریس کی کل طاقت
ناگالینڈ	۸	۴۰	—	—
گجرات	۱۲۳	۹۶	۷۱	۹۲
مدراس	۱۴۴	۵۴	۱۶۹	۴۹
آندھرا	۱۲۵	۱۵۰	۱۳۲	۱۶۵
ہریانہ	۹۴	۳۶	۴۳	
اڑیسہ	۱۲۵	۲۹	۱۰۵	۲۹
آسام	۹۴	۸۴	۳۷	۷۲
کشمیر	۵۹	۶۲	۹	۶۰
پنجاب	۱۰۷	۵۵	۴۳	۴۳
مہاراشٹر	۱۴۶	۲۰۷	۶۲	۲۰۹
یوپی	۱۷۴	۲۱۰	۲۰۹	۱۷۷
کیرالہ	۱۲۷	۳۰	۸۹	۹
میسور	۱۰۹	۱۳۳	۸۱	۱۲۶
بہار	۱۴۶	۱۴۱	۷۲	۱۲۸
راجستھان	۱۱۰	۹۵	۸۶	۸۸
پچھمی بنگال	۱۲۵	۱۳۷	۱۱۸	۱۲۷
مدھیہ پردیش	۱۰۹	۱۶۰	۱۲۵	۱۶۶
مرکز (پارلیمنٹ)	۵۷۶	۴۴۷ (۲۵۷۴۷۲)	۲۷۸	۴۴۶

ممبران پارلیمنٹ کے ووٹوں کی کُل قدر = ۴۸ ۴ ۸ ۰ ۳ ۴
ممبران اسمبلی کے ووٹوں کی کُل قدر = ۱ ۵ ۸ ۰ ۳ ۴
کانگریسی ووٹ لوک سبھا = ۴ ۰ ۷ ۰ ۶ ۱
راجیہ سبھا = ۴ ۰ ۷ ۸ ۸

نتیجے کا اعلان سُنکر

آل انڈیا ریڈیو نے اپنے پروگرام روک کر نتیجے کا اعلان کیا (پاکستان ریڈیو نے بلا تبصرہ اور غیر اہم طریقے سے خبر سُنائی) پارلیمنٹ کے باہر ہجوم نے جو اعلان سننے کے لیئے جمع تھا تالیاں بجا کر "ذاکر حسین زندہ باد" کے نعرے بلند کیئے۔ کناٹ پلیس وغیرہ میں عوام کی مسرت کے نظارے دیکھنے میں آئے۔ جامع مسجد کے علاقے میں لاوڈ اسپیکر پر نتیجے کا اعلان کیا گیا اور مختلف فرقوں کے لوگوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ ذاکر صاحب کو سب سے پہلے ڈاکٹر رادھاکرشنن نے فون پر مبارک باد دی۔ اُن کے گھر (نمبر ۶ مولانا آزاد روڈ) پہنچنے والوں میں سب سے پہلے مسز اندرا گاندھی اور رام سبھاگ سنگھ تھے۔ اس کے بعد لوگ چاروں طرف سے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جن میں اخباروں کے نمایندے، فوٹوگرافر، پریس کے نامہ نگار، مختلف سیاسی لیڈر اور دوسرے لوگ شامل تھے۔

الکشن کا تجزیہ

ذاکر صاحب امید سے کہیں زیادہ ووٹوں سے جیتے۔ اندازہ ہے کہ صرف آندھرا میں جہاں کے مسٹر ریڈی رہنے والے ہیں کانگریس کے کچھ ووٹ ٹوٹے ہیں مگر اپوزیشن

کے بھی کافی ووٹ کانگریس کو ملے۔ پارلیمینٹ کے ۷۴۴ ملے حالانکہ وائس پریسیڈنٹ کو ۳۸۳ تھے، یعنی ۴۳ غیر کانگریسی ووٹ نائب صدر کو ملے۔ پارلیمینٹ کے نامزد ممبروں کو صدارت کے الکشن میں ووٹ کا حق نہیں تھا صرف نائب صدارت کے لیئے تھا اس طرح اگر دس گھٹا دیے جائیں جو کہ نامزد ممبروں کی تعداد ہے، تو بھی تقریباً بتیس غیر کانگریسی ووٹ نائب صدر کو ملے جو صدر کو نہیں ملے۔ کانگریس کے کل ایم پی ۴۴ تھے جن میں دو غیر حاضر رہے اور ایک ووٹ رد کر دیا گیا لہٰذا اس طرح تین مخالف ووٹ تو صدر کو ضرور ملے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ آزاد ممبروں کے ووٹ اور بھی ملے ہوں اور کانگریسی ممبروں کے مخالف گئے ہوں۔

صوبوں پر نظر ڈالیں تو آندھرا کے علاوہ مدھیہ پردیش دوسرا صوبہ ہے جہاں کانگریس کو اس کی اصل طاقت سے کم ووٹ ملے۔ یہاں کانگریسی ممبر ۱۶۷ تھے اور کانگریس کو ووٹ ۱۶۰ ملے۔ نامہ نگاروں کا بیان ہے کہ سات ممبر غالباً ووٹ ہی نہ دے سکے۔ مہاراشٹر میں دو کم ملے یعنی ممبر ۲۰۹ اور ووٹ ملے ۲۰۷۔ غیر کانگریسی صوبوں میں جہاں کانگریس کو زیادہ ووٹ ملے یوپی قابل ذکر ہے جہاں کانگریس کی ۱۸۱ اسیٹیں تھیں اور ۲۱۰ ووٹ آرہے (خیال ہے کہ یہ زائد ووٹ باغی کانگریسیوں کے ہیں)۔ اسی طرح آسام میں کانگریس کے ۷۲ ممبر تھے اور ۸۴ ووٹ آئے یعنی بارہ زیادہ۔ بہار میں ۱۲۶ ممبر تھے لیکن ووٹ ملے ۱۴۱ یعنی پندرہ زیادہ۔ اسی طرح گجرات میں چار زیادہ، ہریانہ میں ایک زیادہ، جموں کشمیر میں دو زیادہ، کیرالہ میں ۲۱، مدراس میں پانچ، میسور

میں سات، پنجاب میں بارہ (غالباً سنت گروپ کے اکالیوں نے دیے)، راجستھان میں ۶، ویسٹ بنگال میں دس ووٹ زیادہ ملے اور ناگالینڈ کے سب ووٹ ملے اگرچہ سب غیر کانگریسی تھے۔

ذاکر صاحب نے کہا

کامیابی کا اعلان ہونے پر اخباروں کے بے شمار نامہ نگار ذاکر صاحب کے یہاں پہنچے۔ نہ صرف ان کے فوٹو بے تحاشا لے ڈالے بلکہ ایک فوٹوگرافر عورت اندر بھی جا پہنچی اور ان کی بیگم صاحبہ کے بھی (جن کی آج تک کسی نے جھلک نہ دیکھی تھی) کئی فوٹو لے ڈالے[1]۔ ذاکر صاحب سے ہر طرح کے لاتعداد سوال پوچھے گئے۔ انہوں نے اس موقعے پر کہا "میرا خیال ہے کہ جب کوئی فرد اپنے عوام کا نمایندہ بن جاتا ہے تو اسے بعض ایسی قدروں کی نمایندگی کرنی چاہیئے جنہیں لوگ پسند کرتے ہیں" جب الکشن پر ان کا ردِ عمل دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا "میرا پہلا ردِ عمل انکسار ہے۔ وہ انکسار نہیں جو عمل کو سرد کر دے بلکہ ایسے لوگوں کا انکسار جو بڑھتے اور پھلتے پھولتے، کچھ سیکھنا چاہتے ہیں اور کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انکسار جو ایسی ہمت اور عزم پیدا کرے جس میں کوئی شخص اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے اپنی بہترین کوشش کرتا ہے"۔ قوم کے لیے پیغام میں انہوں نے کہا "میں یہی کہوں گا کہ وہ ایک بہتر، بھرپور اور باوقار معاشرے کی تعمیر کے لیے جی جان سے جُٹ جائیں۔ ہمیں کم بولنا چاہیئے، کم جھگڑنا چاہیے

---

[1] انیس چشتی: پریسیڈنٹ ذاکر حسین (انگریزی) - ۳

اور زیادہ سے زیادہ جفاکشی سے کام لینا اور مِل جُل کر رہنا چاہیے"۔

'انڈین ایکسپریس' کے نامہ نگار سے اُنہوں نے کہا " میں نے کبھی اپنی زندگی میں نیا کامِ تلاش نہیں کیا۔ کیونکہ میرے نزدیک اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ میں نے شروع میں اپنے آپ کو تعلیم سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، کبھی اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ نہیں کیا۔ میں علی گڈھ اس لیے گیا تھا کہ پنڈت نہرو اور مولانا آزادؒ چاہتے تھے کہ میں وہاں جاکر معاملات کو ٹھیک کروں۔ میں نے وہاں دو ٹرم گذارے۔ آٹھ سال بعد اپنی صحت کی خرابی کی بنا پر استعفیٰ دیا تو میں سمجھتا تھا کہ میں ریٹائر ہو رہا ہوں میرا اوکھلے میں مکان موجود تھا، رہنے کی کوئی پریشانی نہ ہوتی" اس کے بعد نامہ نگار نے گذشتہ پانچ سال کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کیے اور پھر اُن الزامات کے بارے میں ردِعمل جاننا چاہا جو الکشن کے دوران فرقہ پرستوں نے لگائے تھے۔ انہوں نے کہا" مجھے اس کا افسوس ہوا لیکن میں جھنجھلایا نہیں، مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اس طرح کی باتوں پر غصہ کیا ہو مگر مجھے افسوس بہت ہوا" یہ پوچھنے پر کہ آپ کے نزدیک اچھی اور کامیاب زندگی کی خصوصیات کیا ہیں ؟ اُنہوں نے کہا۔

" زندگی میں سب سے زیادہ سکون بخش چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے ساتھی انسانوں کی خدمت کر سکے اور اس کے دل میں یہ یقین ہو کہ وہ کوئی گھٹیا کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ ہے میرا نظریہ اچھی زندگی کے بارے میں "۔

اس موقعے پر انہوں نے اپنے بیان میں قوم کا شکریہ ادا کیا کہ "اُس نے ایک ادنیٰ ٹیچر پر اعتماد کا اظہار کیا ہے" - اپنے مقاصد اس طرح بیان کیے :

"فرد اور سماج کی پاک اور ستھری زندگی، کمزوروں اور پسماندوں کے ساتھ عملی اور مستقل ہمدردی، ہندوستان کے مختلف رنگارنگ فرقوں کے درمیان ہم آہنگی"

کس نے کیا کہا ؟

الکشن کا نتیجہ سُن کر مختلف لوگوں کی طرف سے بیانات :

مسز اندرا گاندھی "زندگی بھر لگن کے ساتھ خدمت نے اُنہیں پوری قوم کا پیار، عزت اور نیک خواہشات دی ہیں - میں آج بے حد خوش ہوں۔ حقیقت خود بول اٹھی ہے" -

کامراج ۔ "کانگریس کے ذریعے عوام نے سیکولرازم پر اپنے پکے عقیدے کا اظہار کیا ہے" -

مرارجی ڈیسائی۔ "کانگریس جن اصولوں کو لے کر کھڑی ہوئی اُن کا نمایاں مظاہرہ"

شُمبار اؤ۔ "مجھے امید ہے کہ اس الکشن نے دیش میں جمہوری طاقتوں کو مضبوط کیا" -

مولانا اسعد مدنی "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کے چنے ہوئے نمائندے کسی معاملے میں صلاحیتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ دین دھرم اور ذات پات کے تعصب سے بلند رہ کر" ۔

لوہیا "سنیاس لینے کو جی چاہتا ہے" ۔

اجے مکر جی ۔ "بعض اپوزیشن پارٹیاں دھونس اور تخریب پسندی کے تحت جو پالیسی اختیار کرتی ہیں عوام نے اسے پسند نہیں کیا"۔

اٹل بہاری ۔ "اب اختلافات ختم ہو جانا چاہئیں ۔ وہ احترام اور مبارکباد کے مستحق ہیں"۔

گرنام سنگھ (چیف منسٹر پنجاب) ۔ کچھ کہنے سے انکار ہے ۔

گیانی ذیل سنگھ ۔ "جمہوری طاقتوں، سیکولرازم اور سوشلزم کی فتح ہوئی"

چرن سنگھ ۔ "میرے لیے کچھ کہنا مناسب نہیں"۔

آچاریہ کرپلانی ۔ "کانگریس کا یہ کہنا ٹھیک نہیں تھا کہ ذاکر صاحب کے لیے ووٹ سیکولرازم کے لیے ووٹ دینا ہے اسی طرح بعض فرقہ پرست پارٹیوں کا اس قسم کا پروپاگنڈہ اور مخالفت بھی انتہائی غلط تھی"۔

شنکر آچاریہ (آف پوری) ۔ "یہ الکشن بھارت کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگا"

انّادورائی ۔ "ڈاکٹر ذاکر حسین اس عہدے کے لیے سب سے زیادہ اہل شخصیت ہیں"۔

محمد اسمٰعیل (صدر مسلم لیگ کیرالہ) "ووٹ دینے والوں نے اس ملک میں سیکولرازم اور جمہوریت کو اجاگر کر دیا"۔

وی۔وی گری ۔ "ہمارا ملک دنیا کے سامنے سرخ رو ہوا کہ وہ خالص سیکولرازم پر ایمان رکھتا ہے"۔

مفتی عتیق الرحمٰن ۔ "ایسے نازک وقت میں اس عہدے پر اُن کا تقرر جمہوریت

کے لیے تقویت کا باعث ہو گا۔ الکشن سے ثابت ہوتا ہے کہ
اگر ہمارے آئین پر صحیح طریقے سے عمل کیا جائے تو وہ فرقہ
پرستی اور ذات پات کی دھجیاں اُڑا سکتا ہے"۔

ہمایوں کبیر: "ایک بہت ہی اہل آدمی کو قوم کی طرف سے بالکل صحیح اعزاز
ملا"۔

مدھوک۔ "میں مبارک باد نہیں دوں گا۔ الزامات کی صفائی پیش
کریں —!"

ان کے علاوہ پی سی گھوش، این جی گورے، آنند نمبیار (لیفٹ کمیونسٹ)
کنور لال گپتا، جیوتی باسو، ترلوکی سنگھ وغیرہ نے مبارک باد دی اور خوشی کا
اظہار کیا۔ صدر ٹیٹو، شاہ ایران، صدر تنزانیہ کے علاوہ جاپان، حبشہ، فرانس
شام، سومالیہ، چیکوسلوواکیہ، ہنگری، فلپائن، بلغاریہ، ملائشیا وغیرہ کے
سربراہوں، یو این او کے سکریٹری جنرل، صدر پاکستان، سکریٹری عرب
لیگ، خان عبدالغفار خاں وغیرہ نے اظہارِ مسرت اور مبارک باد کے پیغامات
بھیجے۔ کشمیری عوام نے خوشی کا اظہار کیا۔ کھٹمنڈو (نیپال) میں سیکولرازم کی
کی فتح اور دو قومی نظریے کی شکست قرار دیا گیا۔ امریکہ میں عام طور پر اطمینان
کا اظہار کیا گیا کہ سیکولر سماج بنانے کی ہندوستانی دعوے کی تصدیق ہوئی۔
پاکستان میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ اب ہندوستان زیادہ پُر اثر طریقے سے دنیا
میں اپنے سیکولرازم کا ڈھنڈورا پیٹے گا۔

خوشی کی انتہا بعض حلقوں میں صدارت کا الکشن کس قدر دل چسپی

کا موضوع رہا اور نتیجہ سُن کر کیا ردِ عمل ہوا، یہ انڈین آرکیٹکٹ
(INDIAN ARCHITECT) کے ایک تبصرہ نگار کی آپ بیتی
سے اندازہ ہوگا جو صرف ایک مثال ہے :

"میں اتنا ہی خوش تھا جتنا کہ اُس وقت جب میرا دیش آزاد ہوا یا
اُس وقت جب میں اِس پیشے میں داخل ہوا جس سے متعلق ہونے پر مجھے
بجا طور پر ناز ہے میں اس موقعے کی خوشی کو اپنی کسی بھی ذاتی خوشی سے
مقابلہ نہیں کر سکتا..... الکشن سے پہلے میں نے کئی ہفتے بے چینی سے
گذارے جس دن نتیجہ کا اعلان ہونا تھا، میں سوچ نہ سکا۔ بس ہر کام
چھوڑ کر ریڈیو سے چپک کر بیٹھ گیا۔ جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو میں اپنے
خوشی کے آنسوؤں کو صاف کرنے کے لیے غسل خانے کی طرف جھپٹا۔ میں
نے اپنا دفتر بند کر دیا اور پورے اسٹاف کو قریب کے ایک اچھے اور بہت
ہی مہنگے ریسٹورانٹ سے آئس کریم کھلائی۔ اگر اس موقعے پر ملک شکست
کھا جاتا تو اس کے کیا معنی ہوتے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا لیکن میں
اتنا جانتا ہوں کہ ہمارا وقار دنیا کی نظروں میں ایسا گر جاتا جیسا اس سے
پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا اور ہمارے سیکولر قانون اور زبانی جمع خرچ کو اس
ملک کے اُن لوگوں کے لیے نمائشی خول کہا جاتا جن کے بزرگوں نے وید
اور اُپنشد جیسی کتابیں لکھیں۔ میں اپنے ہندو مذہب پر مغرور ہوں
مگر شرمندہ ہوں اُس گفتار و کردار پر جو ہندو فرقہ پرستوں نے مذہب
کے نام پر الکشن سے پہلے پیش کیا۔ الکشن کے نتیجے سے ہم سیکولر ملک کی

حیثیت سے دنیا میں سر بلند ہوئے ہیں۔ یہ بات مجھ پر بین الاقوامی رائے سے ظاہر ہوئی۔ ہماری تحسین و تعریف کی گئی اکثر اُن لوگوں کی طرف سے جو ہمارے مخالف سمجھے جاتے ہیں اُن تبصروں میں جو مجھے پسند آئے ایک ڈیلی مرر، سیلون کا تھا" [1]

ہندوستانی اخباروں نے لکھا

راج دھانی دہلی کے ایک غیر جانب دار انگریزی رسالے 'تھاٹ'، نے الکشن سے پہلے اپنی ایک اشاعت (۲۹ اپریل ۱۹۶۷ء) میں لکھا تھا:

"کسی کو اس بات سے اختلاف تو ہو سکتا ہے کہ کانگریس کے امیدوار ڈاکٹر ذاکر حسین اگلے پانچ سال کے لئے سب سے بہتر ہیں کیونکہ بدلے ہوئے حالات میں آج دیش کو اس عہدے کے لیے ذرا زیادہ مضبوط شخصیت درکار ہے لیکن انسانی برابری اور سیکولرازم کا ذرا سا بھی احترام رکھنے والے اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین سب سے زیادہ باصلاحیت انسان ہیں اس عہدے کے لیے"

الکشن کا نتیجہ نکلنے کے بعد اس رسالے نے "راشٹر پتی بھون میں ایک اور عظیم شخصیت" کے عنوان سے ایڈیٹوریل میں مفصل طور پر ذاکر صاحب کی تعلیمی خدمات، انسانیت دوستی اور نائب صدر کی حیثیت سے ان کے اخلاق

---

1. INDIAN ARCHITECT July-Aug. '67

کردار کا خاکہ پیش کیا۔ ہندوستان ٹائمز نے "قوم کا انتخاب" کے عنوان سے ایڈیٹوریل میں لکھا:

"یہ انتخاب اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ملک نے کچھ بنیادی قدروں پر عقیدے کی تجدید کی ہے ..... یہ دعویٰ کرنے کے لیے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی جیت سیکولرازم کی جیت ہے، جیسا کہ بعض حلقوں میں سنا جارہا ہے، غلط طور پر اس واقعے کو استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ دیش کو ابھی ایک طویل راہ طے کرنا ہے (اس منزل پر پہنچنے کے لیے) جب تک کہ سیکولرازم ہمارے اندازِ فکر میں اتنا رچ نہ جائے کہ کسی شخص کی امیدواری اس کی ذاتی خوبیوں سے پرکھی جائے، فرقے اور ذات کو نظر میں لاکر نہیں۔ اس الکشن کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ پارٹی جس کی بے انتہا حمایت سے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب ممکن ہوا اپنے اس عمل کے ذریعے اپنے سر پر سیکولرازم کا سہرا باندھنے کے قابل ہو گئی بالکل اسی طرح جس طرح یہ معنی نہیں لیے جاسکتے ہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے کانگریس کا ساتھ نہیں دیا فرقہ پرست ہیں۔ کانگریس کی کامیابی یقیناً زیادہ معقولیت رکھتی ہے۔ اس کی کامیابی نے یہ دکھانے میں مدد کی ہے کہ انفرادی طور پر اس کے ممبر خواہ کیسی ہی نئی باتیں کریں مگر مجموعی طور پر یہ پارٹی سمجھتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی امید اس وقت تک نہیں رکھ سکتی جب تک کہ اقلیتوں کو برابر کے حقوق دینے کے عہد کو پورا کرنے کے لیے وہ ایک منظم اور متحدہ مورچہ نہ بنالے"۔

(۱۰ر مئی ۱۹۶۷ء)

'انڈین ایکسپریس' نے لکھا:

" یہ انصاف اور دانش مندی کی فتح ہے۔ پانچ سال تک نائب صدر رہنے اور اس عہدے کے فرائض امتیازی طور پر انجام دینے کی وجہ سے وہ صدارت کے لیے صحیح امیدوار اور انتخاب ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا صرف بے انصافی ہی نہ ہوتی بلکہ یہ ظاہر ہوتا کہ ان کو بحیثیت ایک اقلیتی فرد کے فراموش کیا گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ انصاف اور دانش مندی کی فتح ہوئی —— اور فتح بھی نہایت اطمینان بخش"۔

'اسٹیٹس مین':

" موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق مناسب انسان کامیاب ہوا ہے ڈاکٹر ذاکر حسین اُن روایات کو مزید ترقی دینے میں مددگار ثابت ہوں گے جو کہ ہمارے پارلیمنٹری نظام کے تحت صدر سے متعلق رہنی چاہئیں ان کی خوش اخلاقی ان کی علمیت اور قابلیت سے بھی زیادہ نمایاں ہے ...... حکومت کے خصوصی صلاح کار کی اور دیس کے سیاسی شعور کے نگراں کی حیثیت سے مقابلتاً مسٹر سباراؤ اپنے مواقع اور مزاج کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ پہلا قانونی الفاظ کو مدنظر رکھنے کی طرف مائل اور دوسرا بحث و اختلاف کے سمندر میں غوطہ زن"۔

'مین اسٹریم' (نئی دہلی):

"اس صدارتی انتخاب پر دنیا کے ممالک میں اچھے اثرات ہوں گے وزیر اعظم بھی دلی سکون محسوس کریں گی۔ خاص طور پر افریشیائی ملکوں میں

ہندوستان کے خلاف پاکستان، چین اور کچھ مغربی ملکوں کی چلائی ہوئی مہم کو دبانے میں اس انتخاب کے ردعمل نے بہت حد تک امداد پہنچائی ہے دیش کے اندر اس نے جن سنگھ کی اُس زہریلی فرقہ واریت کو زیادہ نمایاں کیا جو اُس کی طرۂ امتیاز رہی ہے اور ساتھ ہی اقلیتی فرقے میں تحفظ کا احساس پیدا کیا جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی" (۲۰ مئی ۱۹۶۷ء)

ٹائمز آف انڈیا، (نئی دہلی) :

" وہ اپنے عہدے کے لیے ذہن اور کردار کی خوبیاں لائے ہیں جنہوں نے ان کو اپنے فرائض انجام دینے کے لیے پوری طرح مسلح کر دیا ہے۔۔۔ اگر منتخب نمایندوں کی اکثریت نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب کیا اور دوسروں نے مسٹر سُبّاراؤ کو ووٹ دیے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ رائے دینے والوں نے کسی خاص اصول، سیکولر یا کوئی اور، کے تحت ایسا کیا بلکہ اس لیے کہ وہ امیدوار جس کو انہوں نے رائے دی ان کے نزدیک ہر طرح سے موزوں تھا "۔

دوسرے ملکوں میں

صدارت کا یہ الکشن اور اس کا نتیجہ صرف ہندوستان میں ہی نہیں، دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں دل چسپی اور غور و فکر کا ایک خاص موضوع رہا۔ ذاکر صاحب کے انتخاب نے ان ملکوں کے عوام پر زبردست اثر ڈالا۔ امریکہ میں اس کو سیکولر ازم کے اُن بلند آدرشوں کی جیت قرار دیا گیا جو آزاد ہندوستان نے جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں اپنائے تھے۔ امریکی حلقوں میں ذاکر صاحب کی غالب

اکثریت سے کامیابی پر بھی بڑی حیرت ظاہر کی گئی۔ ایک اہم اور قابل ذکر اثر جو اس الکشن نے پیدا کیا وہ تھا کشمیر پر پاکستانی دلیلوں کا خاموش مگر مضبوط اور پُراثر جواب۔ اور بعض مبصروں کا خیال تو یہ ہے کہ امریکی رویے میں کسی نمایاں تبدیلی کا اگرچہ امکان تو نہیں، پھر بھی یہ الکشن کشمیر کے متعلق امریکہ کی پالیسی کو ایک غیر محسوس اور اوجھل طریقے پر متاثر ضرور کر رہا ہے یہ اُن لوگوں کو آواز اٹھانے میں مدد کرے گا جو امریکہ کو اس معاملے میں بالکل غیر جانب دار دیکھنا چاہتے ہیں۔ [1]

جرمن اخبارات نے بھی اس انتخاب کو سراہتے ہوئے اس کو کانگریس کے ساتھ ہی سیکولرازم کی جیت قرار دیا۔ مشرقِ وسطیٰ (مڈل ایسٹ) کے ملکوں میں بھی اخبارات نے مختلف تبصرے کیے۔ لبنان کے اخبار "النہر" نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ اُس نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اور ان کی مختلف پریشانیوں کا ذکر کیا اور لکھا کہ "یہ ابھی کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان کا مسلمان صدر اس قابل ہو سکے گا کہ ہندوستان کی کسی پالیسی یا دنیا میں ہندوستان کے متعلق تصورات کو بدل سکے"۔ بیروت کے اخبار "الحدیف" نے نامزدگی کی تمام کہانی شایع کی اور عنوان یہ دیا:

"ہندوستان ایک مسلمان کو صدر بنا کر اپنی فرقہ وارانہ اُلجھنوں پر

---

1. PARASURAM : Husains Election......Indian Exp. 23 . 5 . 67.

غالب آئے گا" ؎

'کیرو ریویو' (Cairo Review) لکھتا ہے:

"ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب تمام متحدہ عرب جمہوریہ میں جمہوری سوشلزم اور صحیح سیکولر اصولوں کی فتح قرار دے کر سراہا گیا۔ تمام اخباروں نے نمایاں طور پر یہ خبر شایع کی اور اپنی نیک خواہشوں کا اظہار کیا۔ ہندوستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کے تعلقات آج بڑھتی ہوئی دوستی اور روابط کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں" ۔ (مئی ۶۷ء)

'ایشیا اینڈ افریکا ریویو' (لندن) نے ٹائیٹل پر ڈاکٹر صاحب کا فوٹو "سیکولرازم کا نشان" کے عنوان سے شایع کیا۔ اپنے اڈیٹوریل میں اس نے لکھا:

"ڈاکٹر ذاکر حسین کا بحیثیت صدر کے انتخاب ہندوستان کے خیر خواہوں کے لیے بڑے سکون کا باعث ہے۔ اگرچہ یہ بلند مرتبہ پانے والے کا مذہب نمایاں طور پر اچھالا گیا لیکن یہ اُس کامیابی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین یہ حق رکھتے تھے، ملک کے عظیم مدبر ہونے کی حیثیت سے بھی اور پچھلے چالیس سال میں آزادی کی تحریک میں بے غرض عقیدہ رکھنے سے تاریخ میں اپنی جگہ بنا لینے کی بنا پر بھی .... اُن کے انتخاب نے یہ بات بے شک ظاہر کر دی کہ ہندوستان کا سب سے اونچا عہدہ پانے کا راستہ ہر عورت اور مرد پر بغیر کسی مذہب، ذات پات اور عقیدے

؎ بحوالہ 'ڈان' کراچی، ۲ مئی ۶۷ء

کی تفریق کے کھلا ہوا ہے۔ یہ ہندوستان میں جمہوریت کو نکھارنے کی طرف بڑھنے کا ذریعہ ہے ...... تاہم اس خیال کو بالکل رد نہیں کیا جا سکتا کہ وزیرِ اعظم اور کانگریس پارٹی نے جو اُن کی حمایت میں چوٹی کا زور لگایا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان ہیں اور کانگریس کے ممبران یہ دکھانے کے آرزومند تھے کہ مذہب اس راہ میں رکاوٹ نہیں ہے"۔ (جون ۶۷ء)

مانچسٹر گارجین، (لندن):

"اگر ذاکر حسین ہار جاتے تو باہر کی دنیا میں کم لوگ، پاکستان میں شاید اور بھی کم اور ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں میں غالباً اس سے بھی کم لوگ یہ یقین کرنے پر تیار ہوتے کہ اس شکست میں ان کے مذہب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ نائب صدر کی حیثیت سے ان کی خدمات نے اس عہدے پر پہنچنے کے لیے ان کی صلاحیتوں کو واضح کر دیا ہے جس طرح رادھا کرشنن اس عہدے پر (نائب صدارت سے) پہنچے تھے اگر اس مرتبہ بھی اس روایت کو باقی نہ رکھا گیا ہوتا تو ہندوستان کے لیے باہر کی دنیا کو یہ یقین دلانے میں مشکل پیش آسکتی تھی کہ اس ملک میں مسلمان، کسی حد تک، دوسرے درجے کے شہری نہیں ہیں"۔

(۱۰ / مئی ۶۷ء)

"ڈیلی ٹیلی گراف" (لندن)، "اسلام اِن انڈیا" کے عنوان سے:

"ہندوستان کا یہ تصور کہ وہ ایک غیر ہندو سیکولر ملک ہے، یہ

بات لازم کرتا ہے کہ وہاں کا ہر مسلمان، عیسائی اور کوئی بھی عقیدہ رکھنے والا ایک اچھا ہندوستانی شہری ہو سکتا ہے۔ یہ عقیدہ رکھنے سے وہ نہ صرف پاکستان کے تصورات کی جڑ بنیاد سے ہی نفی کرتا ہے بلکہ مسئلہ کشمیر پر اس کے دعوے کو بڑے مناسب طریقے سے رد بھی کرتا ہے۔ یہ تصور ہندوستان میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کے خطرے کو کم کرتا اور پانچ کروڑ مسلمانوں کو خوش رکھنے میں مددگار ہوتا ہے ..... " (۱۰ رمئی ۶۷ء)

'اسٹریٹس ٹائمز'، (سنگھاپور) :

" عموماً ہندوستان ان کی کامیابی کو سیکولرازم کی کامیابی ظاہر کریگا اور یہ دکھائے گا کہ پانچ کروڑ ہندوستانی مسلمان اپنے دیش کے ہندؤں کے ساتھ برابر کی حیثیت رکھتے ہیں " (۱۰ رمئی ۶۷ء)

'ڈان' (کراچی) :

" سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہوگی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت کو باہر کی دنیا میں ہندوستان بڑے طمطراق سے بطور ثبوت پیش کرے گا کہ ہندوستان کا سیکولرازم ایک زندہ حقیقت ہے ...... ہندوستان کے ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان، حقوق سے محروم اور ستایا ہوا، دوسرے درجے کے شہریوں کا ایک فرقہ ہیں۔ کانگریس کے بیس سالہ دورِ حکومت میں ان کے حقوق کا رفتہ رفتہ خاتمہ اور فرقہ وارانہ فسادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جس نے ان کے اندر سے اپنے تحفظ کے احساس کو بالکل ختم کر دیا ——— یہ ہیں وہ "عنایتیں"

جو ہندوستان کا سیکولرازم اپنی مسلم اقلیت کے لیے لیکر آیا ہے۔ کیا ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کی مصیبتوں کو صرف اس لیے بُھلایا جاسکتا ہے کہ ایک مسلمان کو معزز ترین عہدے پر بٹھا دیا گیا ہے، صرف اپنی سہولتوں کے پیش نظر یا خود ساختہ سیکولرسٹوں کے پرانے ساتھی ہونے کے انعام میں ؟ " (۱۲ مئی ۶۷ء)

'پاکستان ٹائمز' نے بھی اپنی ۱۱ مئی ۶۷ء کی اشاعت میں کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔

'ڈیلی مرر' (سیلون) : (Daily Mirror Ceylon)

" جمہوریہ ہند کے صدر کی حیثیت سے ایک مسلمان کے انتخاب کے بعد بھارت کا ترنگا جھنڈا کل جہاں بھی لہرایا ایک خاص عظمت اور آن بان لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی فتح عقل و فہم، بلند آدرشوں کے صحیح احساس اور درست قوت فیصلہ کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس انتخاب نے ثابت کر دیا کہ نسلی امتیاز کا اژدہا اگرچہ منھ پھاڑے پھرتا ہے مگر اپنے خوفناک دانت ہندوستان کے چنے ہوئے نمایندوں پر پیوست نہیں کرسکا ہے " [1]

آشیرواد

صدر منتخب ہونے سے اگلے دن ۱۰ مئی کو ذاکر صاحب سب سے پہلے گاندھی سمادھی پر گئے، ہار اور پھول چڑھائے

---

[1] 'انڈین آرکیٹکٹ'، جولائی اگست ۶۷ء

اور اس کے بعد آپ سرینگری کے شنکر آچاریہ اور جین منی جی کے پاس گئے اور انہیں کچھ پھل اور پھول ایک تھال میں پیش کیے اور ان کی آشیرواد (دعائیں) حاصل کی۔ اس واقعہ پر ملک کے اخبارات نے مختلف انداز میں تبصرے کیے، یہاں تک کہ 'ٹائمز' (لندن) نے بھی اپنی رائے ظاہر کی۔

آشیرواد پر تبصرے

دہلی کے انگریزی روزنامہ 'اسٹیٹس مین' نے اِن الفاظ میں تبصرہ کیا:

"موجودہ فضا نے بعض ذہنی پریشانیاں ڈاکٹر ذاکر حسین پر طاری کردی ہیں جن سے صدارت کے اعلیٰ عہدے پر پہنچ جانے والے شخص کو محفوظ و غیر متاثر رہنا چاہیے تھا۔ غالباً انہی اُلجھنوں اور پریشانیوں کے زیر اثر اُن سے بعض ایسی کارروائیاں سرزد ہو کر رہیں جن کا ترک ہی بہتر تھا"۔

کلکتے کے انگریزی ہفتہ وار رسالے 'ناؤ' نے لکھا:

"اُن جیسے آدمی کو صدر بننے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوا کہ وہ ملک سے وفاداری کا کھلے عام اظہار کریں لیکن کیا کسی ہندو صدر نے بھی اس طرح کا اعلان ضروری سمجھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ وہ دو ہندو مذہبی شخصیتوں کی آشیرواد لینے پہنچے۔ یہ بہت ہی انوکھی حرکت تھی اور اگر ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے قابل احترام شخص کا تذکرہ نہ ہوتا تو ہم اس سے بھی زیادہ سخت لہجہ اختیار کرتے"[1]

---

[1] 'صدق جدید' ۹ر جون ۶۷ء۔

لکھنؤ کے ایک روزنامے کا خیال تھا کہ :

"دہلی میں بڑے بڑے اولیاء اللہ کی درگاہیں بھی ہیں معلوم نہیں صدر محترم نے وہاں بھی حاضری دی یا نہیں۔ اگر دی ہوتی تو اخباروں میں خبر ضرور آتی" [۱]

لندن کے اخبار 'ٹائمز' نے اپنی ۲۰ مئی ۶۷ء کی اشاعت میں اس خبر پر تبصرہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کے صدر محترم غالباً آزمائشوں اور غلطیوں سے یہ سیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں ہر ایک کو خوش نہیں رکھا جا سکتا" اس نے لکھا کہ "وہ صدر ہونے کے فوراً بعد سرینگری کے شنکر آچاریہ کے پاس گئے، دستور کے مطابق ان کے چرن چھو کر آشیرواد لی اور اسی طرح ایک جین سادھو کے پاس بھی تشریف لے گئے۔ یہ سب کچھ غالباً اُن لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا جو اُن کے مسلمان ہونے کی بنا پر اس انتخاب سے خوش نہیں ہوئے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا اثر نہیں پڑ سکا بلکہ اس چیز نے اُن ہندوستانیوں کو ناراض کیا جو اپنے صدر کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھنا نہیں چاہتے" اس کے ساتھ ہی 'ٹائمز' نے دہلی کے دو انگریزی رسالوں 'آرگنائزر' اور 'ریڈینس' کے اقتباس پیش کیے۔ 'آرگنائزر' کے خیال میں یہ ایک "فرقہ وارانہ حرکت" تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس واقعہ سے البتہ ایک نئی دلیل پیدا کی، یعنی :

---

[۱] 'صدق جدید' ۲۲ نومبر ۶۸ء

"ایک دوسری صورت استنباط کی یہ بھی ممکن ہے کہ صدر صاحب نے اس سے ایک نظیر قائم کر دی اور اپنے جانشینوں کو سبق دیدیا کہ اسی طرح آئندہ فرقۂ اکثریت والے صدر کو چاہیے کہ وہ اپنے انتخاب کے وقت فرقۂ اقلیت کے روحانی بزرگوں کی خدمت میں حاضری دے کر اُن کی دعائیں حاصل کرے" [1]

حلف لینے کی رسمیں

۱۳ رمئی کو پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں نئے صدر اور نائب صدر نے حلف اٹھانے کی رسم ادا کی۔ اکتیس توپوں کی سلامی کے بعد چیف جسٹس کے۔ این وانچو نے ذاکر صاحب کے حلف اٹھانے کی رسم ادا کرائی اور سابق صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے صدارت کی کرسی ان کے لیے خالی کر دی۔ اس موقعے پر وزیر اعظم، ان کی کیبنٹ، بری اور ہوائی فوجوں کے افراد، غیر ملکوں کے خصوصی نمایندے وغیرہ موجود تھے۔ اس حلف لینے کے بعد انہوں نے اپنی پہلی صدارتی تقریر کی اور ملک اور اس کے تہذیب و تمدن سے وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے تمام ہندوستان کو اپنے گھر اور اس ملک کے رہنے والوں کو اپنے خاندان سے تعبیر کیا۔ اسی دن ذاکر صاحب اپنی نئی قیام گاہ یعنی راشٹرپتی بھون میں منتقل ہوئے۔

راشٹرپتی بھون کی کہانی

موجودہ راشٹرپتی بھون جو پہلے انگریز وائسرائے کے رہنے کی جگہ تھی۔

---

[1] 'صدق جدید' ۳۰ رجون ۶۷ء

وائسرائے ہاؤس کہلاتا تھا۔ سن ۱۹۵۰ء میں جب ہندوستان کا دستور بنا اور پہلے صدر منتخب ہوئے تو اس کا موجودہ نام رکھا گیا۔ یہ تمام عمارتیں سنہ ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے بعد بننا شروع ہوئیں جب انگریزوں نے دہلی کو راج دھانی قرار دیا لیکن سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ سے رکاوٹ پڑ گئی جنگ کے بعد سنہ ۲۱ء میں یہ عمارت اُس وقت کے سب سے بڑے انجینئر ایڈون لیوٹینس کی نگرانی میں بننا شروع ہوئی یہ کُل ساڑھے سولہ سو ۱۶۰۰ بیگھے زمین پر ہے جس میں اصل عمارت ۲۵ بیگھے یا ۵ ایکڑ میں بنائی گئی ہے اس میں ۳۴۰ کمرے، ۳۵ برآمدے، ۲۲۷ ستون اور ۳۰ فوارے ہیں یہ ۸ سال میں بن کر تیار ہوئی اور ایک کروڑ چالیس لاکھ روپیہ لاگت آئی۔ یہ عمارت ایک ٹھوس چٹان پر کھڑی ہے۔ عمارت کا ڈھانچہ معمولی اینٹوں سے بنایا گیا اور بعد میں باہر کی طرف کریم رنگ اور سُرخ پتھروں سے ڈھانپا گیا جو دھول پور سے منگوائے گئے تھے۔ زیادہ تر کمروں کی چھتیں کالے اور سفید سنگ مرمر سے بنائی گئی ہیں جو اٹلی اور یورپ وغیرہ سے منگوائے گئے تھے۔

نیو سکریٹریٹ کی عمارتوں کے بیچ میں کھڑے ہوں تو سامنے لوہے کی اُونچی سلاخوں کا جنگلہ نظر آئے گا جس کے بیچ میں اس چہار دیواری کا دروازہ ہے۔ اندر آنے پر لمبے چوڑے صحن کے بیچ میں ۱۴۵ فٹ اونچی لاٹ ہے جس کے اوپری سرے پر بلور کا چھ کونوں والا استارہ بنا ہے۔ اس لاٹ کو جے پور پلر کہتے ہیں کیونکہ یہ مہاراجہ جے پور نے پیش کی تھی۔ اس کے پیچھے ایک خوب صورت گنبد نظر آتا ہے جس میں صدر کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اس پر

ہاتھی، کنول کا پھول، ترازو اور اشوک کی لاٹ کے شیروں کے نشان بنے ہیں۔ رات کے وقت یہاں تیز سُرخ بلب روشن ہو جاتا ہے۔ راشٹرپتی جب دہلی سے باہر ہوں تو نہ جھنڈا ہو گا نہ سُرخ بلب نظر آئے گا۔

عمارت کے قریب پہنچ کر سفید پتھر کی سیڑھیاں اس عمارت کے سب سے بڑے گول کمرے 'دربار ہال' تک پہنچاتی ہیں، یہ کمرہ عین گنبد کے نیچے واقع ہے۔ اندر کی طرف چھت کے بیچوں بیچ ایک خوب صورت اور قیمتی جھاڑ لٹکا ہوا ہے۔ وائسرائے کا دربار یہیں ہوتا تھا۔ اب مختلف سرکاری تقریبیں ہوتی ہیں اس کا قطر ۲، فٹ اور اونچائی ۷۷ فٹ ہے زمین کالے اور سفید سنگ مرمر کی ہے۔ اس سے ملا ہوا 'اشوک ہال' ہے جو وائسرائے کا بال روم تھا۔ اس کی لمبائی ۱۰۵ فٹ اور چوڑائی ۷۵ فٹ ہے۔ دیواروں میں آئینے لگے ہیں اور بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا ہے۔ چھت میں عجیب و غریب صنعت کاری ہے جو ایک ایرانی قالین سے اتاری گئی ہے اور اٹلی کے مشہور فن کار کولونیلو (Colo Nelo) کا شاہکار ہے۔ اس ہال کو بھی سرکاری تقریبوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد 'بنکویٹ ہال' (Banquet Hall) ہے جس کے درمیان میں لمبی میز ہے جس پر ۱۰۴ آدمی بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس کی دیواروں میں انگریز وائسرایوں اور آزاد ہندوستان کے صدروں کی تصویریں لگی ہیں۔ 'دربار ہال' اور 'اشوکا ہال' کے درمیان میں صدر کے مطالعے کا کمرہ ہے اور اس سے ملا ہوا وہ کمرہ ہے جہاں وہ اپنے مہمانوں سے ملتا ہے۔ اسے

'مارننگ روم' کہتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا 'پینل روم' ہے جہاں صدر اُن لوگوں سے ملتا ہے جو گروپ کی صورت میں یا وفد بنا کر آتے ہیں۔ اس کے بعد 'گرے ڈرائنگ روم' ہے جو کہ رسمی لنچ وغیرہ کے لیے ہے یہاں وکٹورین اسٹائل کی کرسیاں ہیں۔

شمالی حصے میں جسے 'نارتھ کورٹ' کہتے ہیں پہلے وائسرائے رہا کرتا تھا اب غیر ملکی معزز سربراہ اور مہمان ٹھہرتے ہیں۔ صدر ناصر اور ٹیٹو یہیں آکر ٹھہر چکے ہیں یہ کمرے 'دوارکا سوٹ'، 'ٹیکور سوٹ' اور 'نالندہ سوٹ' وغیرہ کے ناموں سے موسوم ہیں۔ صدر کے رہنے کے کمرے الگ ہیں۔ ذاکر صاحب مغربی حصے میں پہلی منزل میں رہتے ہیں جس میں تین کمرے ہیں اور اسی کی نچلی منزل میں ان کا دفتر ہے۔

اس عمارت کے پیچھے مغل گارڈن ہے۔ یہ لیڈی ہارڈنگ کی دین ہے جو کشمیر کے مغل باغات کے طرز دیکھ کر حیران رہ گئی تھی، اسی حیرانی کا عکس یہ باغ ہے یہ ۲۰۰×۴۰۰ مربع فٹ رقبے میں ہے۔ اس میں لال پتھروں کی سلوں سے راستے بنائے گئے ہیں۔ دو اٹھارہ فٹ چوڑی نہریں ہیں جو باغ کو اتر دکھن پار کرتی ہیں۔ دو دوسری اسی چوڑی کی نہریں ان دونوں کو کاٹتی ہیں اور بیچ میں ۲۰۰ مربع فٹ کا جزیرہ سا بناتی ہیں۔ فروری مارچ میں ہر سال یہ باغ عوام کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔

راشٹرپتی بھون کے اخراجات ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ ہیں جس میں کل اخراجات مع صدر کی تنخواہ وغیرہ شامل ہیں۔ صدر کی تنخواہ دس ہزار

روپیہ ہے اس کے علاوہ ڈو لاکھ روپیہ سالانہ بجٹ میں ہوتا ہے جس
میں اُسے ہر طرح خرچ کرنے کا اختیار ہے۔

الکشن پر مقدمہ اور فیصلہ

جون ۱۹۶۷ء میں بابو راؤ پٹیل وغیرہ کی طرف سے صدارت کے الکشن پر مقدمہ دائر کیا گیا جس میں چند اعتراضات کیے گئے تھے۔
سپریم کورٹ نے ۷ رنومبر ۱۹۶۷ء کو اس کا فیصلہ سنایا اور پٹیشن خارج کر دیا گیا۔ کورٹ کے فیصلے میں کہا گیا کہ :

۱ - مسز گاندھی کے خط میں جو انہوں نے ووٹروں کے نام بھیجا، کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جسے "ناجائز دباؤ" کہا جا سکے۔

۲ - کانگریس کے چیف وہپ کو بھی یہ اختیار تھا کہ وہ اپنے ممبروں کو خط لکھے۔ ان خطوط میں سے پہلے میں اُن سے درخواست کی تھی کہ وہ ۴ رمئی تک دہلی آجائیں اور اُن (رام سبھاگ سنگھ) سے ملیں۔ دوسرے خط میں کانگریس کی اس خواہش کا اظہار تھا کہ ذاکر صاحب غالب اکثریت سے کامیاب ہوں اور اس لیے ممبروں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ذاکر صاحب کے نام کے آگے نمبر '۱' کا نشان بنائیں اور اُنھیں یہ بھی ہدایت تھی کہ وہ کسی بھی دوسرے امیدوار کے نام کے سامنے نمبر '۲' یا کوئی بھی اور ترجیحی نشان نہ لگائیں۔ ان خطوط میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں کہی جا سکتی۔

۳۔ یہ بات کہ مسز گاندھی نے اپنے چند سینئر کیبنٹ ممبروں کو اس پر مقرر کیا کہ وہ مختلف صوبوں میں اچھی طرح جائزہ لے کر یقین کریں کہ ذاکر صاحب ہی منتخب ہو رہے ہیں، کورٹ کے خیال میں اسے "ناجائز دباؤ" یا "اثرات کا استعمال" نہیں کہا جا سکتا۔

۴۔ یہ کہ مہاراشٹر کے چیف منسٹر نے لیجس لیٹو اسمبلی کے ممبروں سے ۵ مئی کو کسی خاص شخص کو ووٹ دینے کی اپیل کی۔ تو یہ کنویسنگ کہی جا سکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر اس طرح کی کنویسنگ کو ناجائز قرار دیا گیا تو جمہوری انداز پر الکشن ہی ناممکن ہو جائے گا۔

۵ یہ کہ نامزدگی کے کاغذات میں عمر اور قومیت وغیرہ کے تصدیقی ثبوت داخل نہیں کیے گئے۔ کورٹ کے خیال میں صدر اور نائب صدر کے الکشن کے قوانین میں اس طرح کے ثبوتوں کی ضرورت نہیں۔

چند تقریریں

صدر چنے جانے کے بعد اہم تقریریں:

۱۴ر اگست ۱۹۶۷ء ۔ یوم آزادی کے موقعے پر ریڈیو سے قوم کو خطاب

۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۷ء ۔ فاؤنڈیشن اسٹون (سنگ بنیاد)

ایرفورس اکیڈیمی حیدرآباد

۱۰ر نومبر ۶۷ء۔ صوبائی گورنروں کی سالانہ کانفرنس، افتتاح اور تقریر نئی دہلی۔

۲۷ر دسمبر ۶۷ء۔ سنگ بنیاد گرو گوبند سنگھ بھون۔ پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ۔

۲۵ر جنوری ۶۸ء۔ ری پبلک ڈے پر براڈ کاسٹ۔

یکم فروری ۶۸ء۔ انک ٹاڈ (UNCTAD) ڈیلی گیٹوں کو استقبالیہ ایڈریس۔ نئی دہلی۔

۱۲ر فروری ۶۸ء۔ پارلیمنٹ کے جوائنٹ سیشن کو ایڈریس۔

۱۴ر فروری ۶۸ء۔ سنگ بنیاد غالب میموریل ہال۔ نئی دہلی۔

۲۸ر اپریل ۶۸ء۔ ہیل سلاسی (شاہِ ایتھوپیا) کی آمد پر پالم اور راشٹرپتی بھون میں تقریر۔

۸ر تا ۱۸ر جولائی ۶۸ء۔ مختلف مقامات پر دوران قیام روس۔

۱۴ر اگست ۶۸ء۔ یوم آزادی پر براڈ کاسٹ۔

۲۴ر ستمبر ۶۸ء۔ سنگ بنیاد خالصہ کالج۔ دہلی یونیورسٹی

یکم اکتوبر ۶۸ء۔ گاندھی جینتی پر ریڈیو سے نشری تقریر

۱۲ر اکتوبر ۶۸ء۔ کاٹھمنڈو (نیپال) کے استقبالیہ جلسے میں تقریر

۲۳ر اکتوبر ۶۸ء۔ سومالیہ کے صدر عبدالرشید شیر مارکے کا سواگت۔ پالم نئی دہلی

۱۵ر نومبر ۶۸ء صدارت اور افتتاح گورنرز کانفرنس۔ نئی دہلی۔

۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء - بھارتیہ ودیا بھون کی تقریب میں صدارت اور تقریر بمبئی
۲ر جنوری ۱۹۶۹ء - شہنشاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کی آمد، پالم اور راشٹرپتی بھون کی ضیافت میں تقریر۔ نئی دہلی۔

دوسرے ملکوں میں بہ حیثیت صدر ہندوستان

۶ر جون ۱۹۶۸ء کو ہنگری کی راجدھانی بوڈاپیسٹ پہنچے۔ ۷ر جون کو ان کے اعزاز میں سرکاری طور پر استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقعے پر ہنگری اور ہندوستان کے صدر نے مختلف معاملوں میں اپنے اپنے ملکوں کے یکساں نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ ۸ر کو بھی ذاکر صاحب نے دونوں ملکوں کے تعاون اور اشتراک پر زور دیا۔ ایوٹس یونیورسٹی کی جانب سے اعزازی ڈگری دی گئی اور ۱۰ر جون کو دونوں حکومتوں کا جوائنٹ کمیونکے جاری ہوا۔ ویٹ نام اور مغربی ایشیا پر اظہار خیال کیا گیا۔
۱۰ر جون کو بوڈاپیسٹ سے بلگریڈ (یوگوسلاویہ) پہنچے۔ اسی دوران بلگریڈ شہری اسمبلی نے استقبال کیا اور تحفہ پیش کیا۔ اسمبلی کے صدر مسٹر برینکو نے ان کو خراج تحسین و عقیدت پیش کیا جس کے بعد ذاکر صاحب نے تقریر کی
۱۱ر جون کو صدر مارشل ٹیٹو نے ان کے اعزاز میں دعوت دی (لنچ) اور اس موقعے پر بولتے ہوئے غیر جانب دار ملکوں کی کانفرنس کا ذکر کیا۔ بعد میں ذاکر صاحب نے بھی تقریر کی۔ بلگریڈ اور بریونی میں ان کے اور صدر ٹیٹو کے درمیان مختلف مسائل پر طویل بات چیت ہوئی۔ جس کے خاتمے پر مارشل ٹیٹو نے اخباری نمایندوں کو بتایا کہ ہم دونوں ۱۹۶۹ء میں غیر جانب دار ملکوں

کی کانفرنس منعقد کرنے پر ایک رائے رکھتے ہیں۔ ۱۴ر جون کو جوائنٹ کمیونکے جاری ہوا۔

۷ر جولائی کو ماسکو کے لیے دس دن کے دورے پر روانہ ہوئے۔ تاشقند میں رکتے ہوئے دوپہر بعد ماسکو پہنچے۔ صدر روس اور کوسی گن سے ملاقاتیں کیں۔ مختلف مقامات مثلاً لینن گراڈ، تبلیسی (جارجیا) سمرقند اور تاشقند وغیرہ گئے۔ ۱۸ر کو جوائنٹ کمیونک جاری ہوا اور روس سے روانہ ہوئے۔ تین گھنٹے کے لیے کابل میں ٹھہرے جہاں شاہ اور ملکۂ افغانستان کے علاوہ خان عبدالغفار خاں سے بھی ملاقات ہوئی (ہوائی اڈے پر) اور اسی دن واپس دہلی پہنچے۔

۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو کھٹمنڈو (نیپال) کا دورہ شروع کیا۔ اسی دن شاہ نیپال کی استقبالیہ دعوت میں اور ۱۳ر اکتوبر کو ایک عام جلسے میں تقریر کی اور ہندوستان کی طرف سے نیپال کی ترقی کے لیے پورے تعاون اور امداد کا یقین دلایا۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو نیپال کونسل آف ورلڈ افیرز میں تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ "ہندوستان یہ طے کر چکا ہے کہ کوئی ایسی بات نہیں کرے گا جس سے نیپال کے مفاد کو نقصان پہنچے اور ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ نیپال بھی ہمارے قومی مفاد کے خلاف کوئی اقدام نہ کرے گا"۔

تربھون یونیورسٹی میں گاندھی میموریل یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا جو کہ ہندوستان کی مدد سے تیار ہوگا، ہندوستانی سفارت خانہ

کی بنیاد رکھی - ۱۴ اکتوبر کو شاہ نیپال کو دعوت کے موقعے پر اور
انڈو نیپال فرینڈشپ سوسائٹی کے جلسے میں تقریر کی - ۱۷ اکتوبر کو
واپس ہوئے -

(*)

باب ۸

سیرت اور کردار

انسانی کردار اور سیرت کو بنانے میں ورثے میں ملی ہوئی خاصیتیں اور مزاجی کیفیتوں کے علاوہ بہت سے واقعات، ماحول، شخصیتیں اور کردار مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی فطرت نے بھی ان تمام اثرات کو قبول کر کے سیرت کی تربیت اور کردار کی تشکیل کی ہے۔ پھر تمام عمر دشواریوں میں کام کرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے سے ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو تابندگی ملی۔ خاندانی ورثے اور روایات کے علاوہ سب سے زیادہ اور گہرا اثر اُن کی سیرت پر حسن شاہ کا پڑا ہے اور غالباً اسی تاثر نے اُن کے کردار کے خاکے میں درویشی، سادہ مزاجی، خدا پرستی اور انسان دوستی کے حسین رنگ بھر دیے۔

دین داری اور خدا پرستی

حسن شاہ، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، اُن کے دادا کے دُور کے عزیز ہوتے تھے۔ جب یہ سب گرمیوں میں قائم گنج آتے تو وہ ذاکر صاحب

کی تربیت پر خصوصی توجہ دیتے۔ چنانچہ اُن کی شخصیت میں سب سے گہرا رنگ دین داری اور خدا پرستی کا رہا ہے لیکن یہ وہ رنگ ہے جو پوری گہرائی سے رچا ہوا اور چھایا ہونے کے باوجود چھپایا جاتا رہا ہے۔ "وہ اپنی دین داری کو چھپاتے ہیں اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی۔ نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی اُنہیں عبادت کرتے ہوئے دیکھے" لیکن

"جس کسی نے اُنہیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنایا دیکھا ہے وہ اُن کے خشوع و خضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا" [1]

مولانا عبدالماجد دریادی لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی کے ہاں میری طرح وہ بھی مہمان تھے۔ میں نے فجر سے قبل اُنہیں مصلّے (جائے نماز) پر بیٹھے ہوئے دیکھا اغلب یہ ہے کہ تہجد پڑھی ہوگی"۔ (صدق ۲۳ جون ۱۹۶۷ء)

خاندانی ورثے سیرت اور مزاج کی اکثر خاصیتیں، جیسا کہ قاعدہ ہے، اُنہیں بزرگوں خصوصاً والدین سے ورثے میں بھی ملی ہیں اور شاید سب سے زیادہ اپنی والدہ (نازنین بیگم) سے، جو اپنی تین بہنوں میں سب سے چھوٹی، صورت و سیرت میں باپ سے مشابہ، انتہائی حلیم، بردبار، حسین اور مستقل مزاج خاتون تھیں [2]۔ ڈاکٹر یوسف حسین

---

[1] 'یادوں کی دنیا' : ۱۲۹ - [2] نازنین بیگم نبی داد خاں کی (باقی اگلے صفحہ پر)

خاں کا کہنا ہے کہ اُن کی نانی (حسینی بیگم) جس طرح والدہ کو کہتی تھیں کہ وہ باپ سے مشابہت رکھتی ہیں اسی طرح یہ بھی کہتیں کہ "اور سب بھائی تو دادا پر گئے ہیں مگر ذاکر نانا پر گیا ہے"۔

مزاج کی نفاست و نرمی، طبیعت میں شرافت و حمیت، حصولِ علم اور تعلیم کی لگن، ارادوں میں پختگی، دردمندی، خودداری اور انکسار، جرأت و ہمت، استقلال و پامردی کی خصوصیات ددیہال کا ورثہ ہیں۔ مزاج میں استقامت اور پامردی کی جھلک تو بچپن ہی میں نظر آتی ہیں، اس کی نشوونما ہو گئی چھوٹے بھائی زاہد حسین خاں کے برتاؤ اور نوک جھونک سے اور اس طرح "بُردباری اور صبر و تحمل کی جو ٹریننگ بچپن میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں ملی وہ آیندہ ان کی سیرت کا جوہر بن کر نکھری اور چمکی اور اس سے انھوں نے قوم و ملت کے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے... ... آیندہ زندگی کی تشکیل میں ان کی نیت اور نیکی کو بڑا دخل ہے۔ ان کی سیرت کا جوہر بڑی ریاضت کے بعد چمکا ہے جس کی تہہ میں زبردست قوتِ ارادی کی کارفرمائی ہے" [1]

۱۹۰۷ء میں جالندھر اسٹیشن کے ماحول میں جس کا ذکر اپنی جگہ

کی بیٹی تھیں۔ وہ کلال خیل میں رہتے، حلیم و بردبار تھے۔ کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا، غصہ کرتے نہیں دیکھا گیا، جھگڑے فساد سے دور اور عام لوگوں میں مقبول تھے۔

[1] 'یادوں کی دنیا'/ ۴۴۔۴۲

گذر چکا ہے مزاج کی پامردی اور استقلال اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے چنانچہ رشید صاحب کا انداز تصور یہ ہے کہ "ڈاکٹر صاحب سوئے مقتل اُسی دل جمعی سے جا رہے ہوں گے جیسے جمہوریہ ہند کے صدر کی حیثیت سے کسی علمی، ثقافتی یا اس طرح کی کسی تقریب کا افتتاح کرنے یا پھر جیسے شادی خانہ آبادی میں بانیانِ تقریب دولہا دلہن کے ساتھ تصویر کھنچوانے ان کو ہاتھوں ہاتھ، اور زیادہ ہوا تو کشاں کشاں لیے جا رہے ہوں"۔ دہلی میں فسادات کے دوران ان کی مستقل مزاجی اور ارادے کی پختگی نے ہزاروں اُکھڑے ہوئے قدم پھر سے جما دیے۔ اور جامعہ کی تو ساری داستان اسی جاں بازی اور دل جمعی کی امر کہانی ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

شرافت اور شائستگی

مزاج میں شرافت اور شائستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ تحریروں میں بھی اس کی جھلک نمایاں ہے اور اکثر تعلیمی اداروں میں جو خطبے دیے گئے اُن میں اپنے نظریات کو واضح کیا ہے۔ وہ نوجوانوں کی صحیح اور سیدھی سچی لائنوں پر تنظیم چاہتے ہیں چنانچہ علی گڈھ کے طلبا میں زیادہ سے زیادہ اسپورٹس مین اسپرٹ پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ مختلف موقعوں پر اُنہیں اپنی تقریروں میں نصیحت کرتے، اپنے چھوٹے چھوٹے روزمرّہ کے کاموں میں سلیقہ اور اصول برتنے کی ضرورت جتلاتے کہ چھوٹے کام درست ہو جائیں تو بڑے کام خود بخود درست ہو جائیں گے اور کبھی کھیل کے میدان میں اخلاق، شرافت اور انسانیت کا یہ اعلیٰ درس دیتے کہ:

"عزیزو۔ یہ بات اچھی نہیں کہ کھیلوں کے میدان، بالخصوص علی گڑھ
میں تمہارے اچھے کھیلنے پر تمہارے ساتھی تمہاری تحسین کریں اور فریق
مخالف کے اچھے کھیلنے پر خاموش رہیں یا اس کی کسی معذوری یا نارسائی
پر اس کا مضحکہ اُڑائیں۔ یہ کھیل اور شائستگی دونوں کے آداب سے
خلاف ہے"۔

ہمیشہ نہ صرف اپنی تقریروں میں بلکہ عمل سے بھی اچھے اور بڑے کام کو خود
اپنا انعام جاننے اور ماننے پر زور دیا اور اسے عزت نفس اور اطمینان قلب
حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا، تعصب اور تنگ نظری کے اندھیروں میں شرافت
اور انسانیت کی شمعیں جلانے کا درس دیا، جہالت اور گمراہی کا علاج تعلیم
اور تہذیب سے سکھایا "ذاکر صاحب جرائم کی اصلاح کر سکتے ہیں۔
جرائم پیشہ کا استیصال نہیں کر سکتے۔ اِسے اچھے اور بڑے آدمی کی بڑائی
بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کی معذوری بھی!" [۵]

شخصیات کا اثر کردار پر

پیر حسن شاہ کے علاوہ جن شخصیتوں نے ذاکر صاحب کو متاثر کیا ان میں
اٹاوہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین بھی سرفہرست ہیں جن کی
خوبیوں نے وہاں طلبا پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ ذاکر صاحب کی ذہنی اور
اخلاقی صلاحیتوں کو سنوارنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی صحبت

---

[۵] 'نذرِ ذاکر'۔ مضمون رشید احمد صدیقی۔

اور فیض سے اخلاق وکردار کا سدھار ہی نہیں، دین ودنیا کی آگاہی بھی میسر آئی۔ یہ زمانہ جب وہ نویں دسویں کے طالب علم تھے جنگ طرابلس و بلقان کے ہنگاموں کا دور تھا چنانچہ مولانا آزادؒ کی تحریروں نے اُن کے قومی جذبات و احساسات کو جگانے کا فرض انجام دیا اور پُر جوش قومی تقریروں کے موقعے سب سے پہلے یہیں مہیا ہوئے یہاں اُن کا شعور اور فطرت مولانا سے متاثر ہوتی چلی گئی اور "الہلال" اور "البلاغ" نے دماغ کی گہری تہوں تک روشنی پہنچائی۔

تحریکِ خلافت کے زمانے میں ان کی طبیعت مولانا آزاد کے علاوہ مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی اعلیٰ شخصیتوں اور بلند کردار سے متاثر ہوئی "گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنایا تو حکیم اجمل خاں کے خلق و مروّت، صبر و حلم نے اس پر جلا کر دی"۔ [۵]

کردار اور سیرت پر کچھ رائیں

غلام السیدین صاحب کے الفاظ:

"ان کی انسانیت اس قدر وسیع ہے کہ اس میں چھوٹے اور بڑے کا کوئی امتیاز نہیں، خواہ وہ جامعہ کے کسی بڑھئی یا معمار سے گفتگو کر رہے ہوں یا وائسرائے کی کونسل کے کسی ممبر سے مخاطب ہوں یا

---

[۵] "نقوش" شخصیات نمبر۔

مدرسے کے بچوں کو کوئی بات سمجھاتے ہوں یا کسی قومی مجمع کے سامنے خطبہ دے رہے ہوں، ہر موقعے پر اُن کی شخصیت میں ایک مخصوص سادگی اور خلوص، معقولیت اور خود اعتمادی، سچائی اور شرافت کا جلوہ نظر آتا ہے جو مخاطب کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا ..... ذاکر صاحب کو قدرت نے جس سانچے میں ڈھالا ہے اور اُن کو جن ذہنی اور اخلاقی صفات سے مالا مال کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ اگر ایک شخص بہترین مقرر بھی ہے اور مصنف بھی، ماہر تعلیم بھی ہو اور ماہر اقتصادیات بھی، شفیق دوست بھی اور راہبر بھی، اگر وہ میر کارواں کی "نگہ بلند سخن دل نواز، جاں پُرسوز" رکھتا ہو لیکن لیڈری کی تنگ نظر اور خود پسندی سے پاک ہو۔ اگر اس کی اصول پسندی اس کی انسانیت کے گداز اور دردمندی کو کند نہ کر سکے اور اس کی مروّت اور دوستی، اس کی اصول پسندی کے راستے میں حارج نہ ہو، اگر وہ اپنی بیشتر زندگی فقر و ایثار کی حالت میں گذار دے اور قوم کو اس کی سزا نہ دے، قوم پر اس کا احسان نہ رکھے۔ اگر ایک شخص میں یہ تمام باتیں جمع ہو جائیں تو تنقید کیا کرے؟ جب اقبالؔ کے وہ اشعار پڑھتا ہوں جس میں اُنہوں نے مرد مومن کی شان بیان کی ہے تو ان کی ذہنی تفسیر ذاکر صاحب کے خد و خال سے کرتا ہوں، یہ بہت بڑی تعریف ہے لیکن ان کے استحقاق سے بڑھ کر نہیں:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز اُسکے دنوں کی تپش، اسکی شبوں کا گداز

اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم — اُس کا سُر، اس کا شوق، اس کا نیاز، اُسکا ناز
اُس کی امیدیں قلیل، اسکے مقاصد جلیل — اُس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز

رشید صاحب کی رائے:

"وہ طالب علمی سے آجتک کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو کوئی پہلو مجہول یا مبہم نظر نہیں آتا۔ انہوں نے کبھی کوئی بات۔ اضطراراً یا تفریحاً ایسی نہیں کی جو شرافت وشائستگی کے آئین کے خلاف ہو...... اپنی کسی برتری کا بھولے سے بھی کبھی اظہار نہیں کیا کسی کی ہتک یا دل آزاری نہیں کی۔ مخالفوں ہی سے نہیں، دشمنوں سے بھی تحمل اور تواضع سے پیش آئے۔ اپنی بات منوانے کے لیے نہ گلے پر زور دیا نہ زبان کو آلودہ کیا بلکہ سنجیدگی اور مساوات کی فضا کو ہر طرح سے برقرار رکھا"۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے تاثرات:

"یہ شخصیت کس کی ہے؟ ایک نیک دل اور نیک نیت انسان کی جو بیک وقت دین دار اور وطن دوست ہے، خوش معاملہ ہے، راست باز ہے، جس کی ریاضت اور صداقت پر آج تک کسی نے انگشت نمائی نہیں کی۔ خدا نے جسے دل اور دماغ دونوں کے اعلیٰ اوصاف سے نوازا ہے۔ یہ اوصاف فطری بھی ہیں اور اکتسابی بھی۔ جس کا ذکر ہے وہ بڑا ہی عالی ظرف ہے، بڑا مال اندیش، بڑا منکسر مزاج اور متواضع، بڑا متحمل اور صابر ہے۔ مزاج میں چشم پوشی، درگذر اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ہر معاملے میں قطعی رائے

رکھتے ہوئے اس کے اظہار میں اس کا خیال رہتا ہے کہ کسی کے دل
کو چوٹ نہ لگے کسی کی ذلت و توہین نہ ہو۔ اگر کسی کی رائے سے
اختلاف ہو تو اس کی تالیف قلب کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے کہ
سننے والے کو ناگواری کم سے کم ہو۔ حق گوئی کی جرأت اور انکسار
پہلو بہ پہلو رہتے ہیں"۔

مسز سعیدہ خورشید عالم (ذاکر صاحب کی صاحبزادی):
"اپنے اعمال کی بڑی سخت نگرانی کرتے ہیں لیکن دوسروں کی
بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتے ہیں۔ کئی واقعات تو ایسے
ہیں جن میں اُنہوں نے لوگوں کے بڑے بڑے اخلاقی گناہوں
پر پردہ ڈال دیا ہے۔ بلکہ دوسروں کی غلطی کو اپنے اوپر اوڑھ
لیا ہے یہاں تک کہ اُن کے عقیدت مند بھی اُن سے بدظن ہو گئے
ہیں لیکن انہوں نے اپنی یہ روش ترک نہیں کی ۔۔۔۔ وہ
نہ زیادہ زور سے ہنستے ہیں نہ زیادہ زور سے بولتے ہیں میں نے
کبھی اُنہیں قہقہہ مار کر ہنستے نہیں دیکھا۔ ملازمین سے بہت
نرمی سے بات کرتے ہیں اور عام طور پر نام کے ساتھ 'میاں'
یا 'صاحب' ضرور لگا لیتے ہیں"۔ [۱]

حق گوئی | ذاکر صاحب کی سیرت میں بے باکی اور جرأت مندی

---

[۱] 'پیام تعلیم' ذاکر نمبر - ۲۱

کی کمی ہے لیکن موقعہ آئے تو حق بات کہنے سے گریز نہیں کرتے۔ کاشی
ودّیا پیٹھ کے خطبے میں اُنہوں نے جس جرأت اور صفائی سے مسلمانوں
کی نمایندگی کی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند
موقعے ایسے ہیں۔ غلام السیّدین صاحب لکھتے ہیں :

" میں نے اُنہیں مسلمانوں کے مجمع میں وہ سچی اور کڑوی باتیں
کہتے سُنا ہے جن سے ہر دل عزیزی کے بھوکے لیڈر جان بوجھ کر
پرہیز کرتے ہیں " ۔

چند سال ہوئے (۱۹۶۲ء) پنڈت نہرو نے قومی ایکتا کانفرنس منعقد
کی۔ ذاکر صاحب تقریر کے لیے اُٹھے تو کہا :

" ہماری قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ذات
پات کا نظام ہے جس کی جڑیں ہماری زندگی میں اتنی گہری پیوست
ہیں کہ آزادی حاصل ہو جانے کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے
مَس نہیں ہوتیں۔ ہمارا دستور اسے مانے یا نہ مانے وہ بھی ان
رسم و رواج کو یکایک نہیں بدل سکتا جو ہزارہا سال سے سماجی
زندگی پر چھائے ہوئے ہیں " ۔ [1]

کُشادہ دِلی

وسعتِ قلب اور کشادہ دِلی کا ایک نظارہ۔
رشید صاحب کے الفاظ میں :

---

[1] ' یادوں کی دنیا ' ۔ ۱۱۶

"ایک دن صبح کو میں اور ذاکر صاحب ناشتہ کر کے کمرے سے باہر نکلے تھے کہ اچانک مجھے خیال آیا، میں نے کہا "ذاکر صاحب آپ فلاں صاحب سے صلح کیوں نہیں کر لیتے مجھے بڑی خوشی ہوگی"۔ ذاکر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا "سبحان اللہ کیا مصرع موزوں فرمایا ہے۔ آخر آپ کو سوجھی کیا"؟

میں نے کہا "اس کو کیا کیجئے مجھے تو ایسی ہی سوجھتی ہے"
کہنے لگے "تو یہ کون بڑی بات ہے آپ کہتے ہیں تو ہو جائیگا"
میں نے کہا "ابھی چلیے"۔ فوراً تیار ہو گئے اور ہم دونوں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ صاحب موجود نہیں ہیں بات آئی گئی ہو گئی - یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، جن صاحب سے میں صلح کرانے گیا تھا وہ ذاکر صاحب کے جب بھی سب سے بڑے دشمن تھے اور اب بھی ہیں!

اب جب کبھی اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی شرافت، وسعتِ قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"[1]

شوق اور دلچسپیاں | حصول علم اور تعلیم سے ذاکر صاحب

---

[1] "ذاکر صاحب - ۳۸، ۲۹

کو گہرا لگاؤ اور ذوق رہا ہے۔ غالبًا اسی رجحان کی وجہ تھی کہ اپنے لیے تعلیمی میدان کو پسند کیا۔ کوئی دوسرا بھی اگر خلوص سے علمی کام کرنا چاہتا ہے تو اُنہیں دل سے عزیز ہوتا ہے۔ لکھنے کے معاملے میں البتہ وہ ضرور کاہل ہیں، ایسا کام جبھی کیا جاتا ہے جب وہ سر پر ہی آ پڑے اور کوئی چارہ نہ رہے۔

جامعہ اور علی گڑھ کے دور میں ان کے علمی شغف کی بے شمار مثالیں ملینگی۔ کتب بینی کا اُنہیں بیحد شوق ہے۔ یہاں تک کہ علالت میں سلسلہ چلتا رہتا ہے البتہ قصے کہانیاں کم پڑھتے ہیں علی گڑھ میں " ایک بار معالج نے مرض کی طرف سے بہت کچھ ڈرا دھمکا کر کئی ہفتے مسلسل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورے پر عمل اس طرح کیا گیا کہ موصوف نے تصوف پر فارسی، اُردو کی کوئی درجن بھر ضخیم کرم خوردہ کتابیں جو بادامی سے زیادہ بادامی اور بودے کاغذ پر نول کشور پریس کے شاید ابتدائی دور میں شائع ہوئی تھیں اور کسی بڑے ہی اناڑی دفتری نے اُن کی جلد باندھی تھی، یونیورسٹی لائبریری سے منگا کر رات کے تین بجے تک پڑھ کر ختم کردیں"[1] موسیقی اور مصوری کے وہ دلدادہ ہیں۔ پکے گانے، یورپین موسیقی، اور ماڈرن آرٹ کے بھی بڑے قدردان ہیں۔ بہت سے گراموفون ریکارڈ اور تصویریں وغیرہ انہوں نے جمع کی ہیں۔ علی گڑھ میں اکثر کہا کرتے کہ

---

[1] یونیورسٹی گزٹ ذاکر نمبر (مضمون رشید احمد صدیقی)

"کاوش ہندوستانی ساز اور موسیقی کے ماہر منتخب روزگار علی گڑھ میں اکٹھا کیے جا سکتے"۔

اُردو، فارسی، انگریزی اور جرمن شاعری سے اُنہیں گہرا ذوق ہے مگر سب سے زیادہ لطف فارسی شاعری، خصوصاً اقبال کے فارسی کلام سے محسوس کرتے ہیں چنانچہ "ذاکر صاحب کو جھوم جھوم کر دل کش لحن (ترنم) میں اقبال کے شعر پڑھتے سنیے تو آپ کو یاد آ جائے گا کہ اقبال مفکر، معلم اور مصلح ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے" [1] انہوں نے ایک بیاض بھی بنا رکھی ہے جس میں اپنی پسند کے فارسی اشعار درج کرتے جاتے ہیں۔ ان شعروں کی تعداد اب ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔

باغبانی کا بھی اُنہیں بے حد شوق ہے۔ چنانچہ پرانے پودوں، درختوں اور پھلوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات ہیں۔ ایک مرتبہ ٹیونس گئے تو ایک جلوس کے ساتھ جا رہے تھے۔ راستے میں دونوں طرف انار کے چھوٹے درختوں کا حاشیہ دیکھا تو فوراً رک گئے اور جب تک معلوم نہ کر لیا کہ انار کی یہ قسم کیسے پیدا کی جاتی ہے اور کیسے پھیلائی جاتی ہے، آگے نہیں بڑھے۔ گلاب خاص طور پر پسند ہے، تمام دنیا سے عمدہ اور خوش رنگ گلاب ہندوستان میں منگوا کر اگانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اسی شوق کی بدولت ماہرین گلاب نے ایک نئے خوب صورت گلاب کے

---

[1] 'نقوش'، شخصیات نمبر

پھول کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے۔ حال ہی میں ویسٹ جرمنی سے ایک عجیب غریب گلاب منگا کر لگایا گیا جس کا پہلا پھول ملکہ ایران فرح دیبا کی آمد (۲ر جنوری ۱۹۶۹ء) پر ذاکر صاحب کی طرف سے اُنہیں پیش کیا گیا اور اس کا نام اسی مناسبت سے انہوں نے "قیصریں فرح" تجویز کیا۔ علی گڑھ میں گلابوں کی نمائش اُنہی کے زمانے میں شروع ہوئی ۔بوگن ولیا کی بیل کا رواج کثرت سے ہوا۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن نے بوگن ولیا کے مختلف رنگ بنائے اور ایک کا نام "ذاکریانہ" رکھا۔ بہار کی گورنری کے زمانے میں دیو گڑھ کے مسٹر بھٹا چاریہ جی پٹنہ کے راج بھون میں آئے اور ذاکر صاحب کے شوق سے متاثر ہو کر اپنی نئی تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا۔ اسی طرح راجہ صاحب بھدری نے جو پہلے ہماچل پردیش کے گورنر تھے۔ اپنی ایک تخلیق کو اُن کے نام سے موسوم کیا [1] رشید صاحب نے اپنی کوٹھی کے مختصر خوب صورت باغ کا نام بھی "ذاکر باغ" رکھا ہے۔

پُرانے اور خوب صورت پتھر اور فوسل جمع کرنے کا انہیں بے حد شوق ہے الجیریا گئے تو وہاں سے گلاب کی شکل کا ایک پتھر لائے۔ آسٹریلیا کے گورنر جنرل نے ایک دودھیا پتھر بطور تحفہ بھیجا جو ہلکے نیلے رنگ کا ہے۔ اسی طرح روسی ماہروں نے وہاں کے یورال پہاڑوں کے بلوری پتھروں کا ایک سٹ بھیجا۔ شاہ یونان نے ان کا ذوق وشوق دیکھا تو ایک خوش نما ڈبے میں یونان کے سنگ مرمر کے نمونے بھیجے۔

---

[1] یادوں کی دنیا ۔ ۱۳۵

کھانے پینے کی چیزوں میں ذاکر صاحب کو قسم قسم کے کھانے کھانے کا بڑا شوق ہے خصوصاً مچھلی اور کباب پسندیدہ ڈشیں ہیں لیکن ایسی بھی مثالیں بہت ہیں جب اُنہوں نے بہت ہی معمولی کھانا مزہ لے لے کر اور خوش ہو کر کھالیا ہے۔ عام طور پر وہ اپنے پسندیدہ کھانوں سے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ صحت کی خرابی اور مختلف امراض خصوصاً مرض قلب اور ذیابطیس کی وجہ سے ڈاکٹر ہمیشہ بڑی سختی سے پرہیز کراتے رہے ہیں یوں وہ زبردستی یا گھر والوں کی چوری چھپے (اکثر ایسا ہوا ہے) کچھ کھا پی لیں تو بات اور ہے۔ آموں کے بھی بے حد شوقین ہیں۔ آم کی قسمیں، توڑنے کے طریقے، باغ کی پرورش اور آرائش وغیرہ پر بڑی وسیع معلومات بھی رکھتے ہیں کھانے پر باتیں کرنے میں اُنہیں بڑا لطف آتا ہے اور اس کے لیے اکثر اپنا آرام بھی تج دیتے ہیں۔ کھانا کھاتے جاتے ہیں اور لطیفے سناتے جاتے ہیں۔ [۱]

---

[۱] پیام تعلیم ذاکر نمبر۔ ۲۰

گو آں نگارِ ناز کہ اوّل دلم ربُود
عمرت دراز باد ہماں تیرم آرزوست

اقبال

ذاکر صاحب کے قلم سے

(زمانے کے لحاظ سے ترتیب وار)

کتابیں :

مبادی معاشیات - ایڈون کینن کی کتاب 'ایلمنٹری پولٹیکل اکانومی' کا ترجمہ، ۱۹۲۲ء

ریاست - پلاٹو کی 'ری پبلک' کا ترجمہ - انجمن ترقی اُردو سلسلہ ۵۳ ۱۹۳۲ء، تازہ ایڈیشن ساہتیہ اکیڈیمی اور یونیسکو، ۱۹۶۷ء

معاشیات، مقصد اور منہاج - ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد میں ۵/۶/۷ مارچ ۱۹۳۲ء کو لکچرز کا سلسلہ -

بنیادی قومی تعلیم - وار دھا کمیٹی کی رپورٹ - آل انڈیا ایجوکیشن بورڈ، ۱۹۳۸ء

حالی محب وطن۔ (پمفلٹ)۔ اردو کتاب گھر دہلی، ۱۹۴۳ء
ذکر حسینؑ۔ (پمفلٹ)..... کتابی صورت میں امامیہ مشن لکھنؤ نے بھی شائع کیا
تعلیمی خطبات۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۴۳ء۔ ۱۹۶۴ء (چھ ایڈیشن)
جامعہ کیا ہے؟ (پمفلٹ) ۱۹۴۶ء
معاشیات قومی۔ فریڈرش لسٹ کی کتاب نیشنل اکانومی کا ترجمہ، ۱۹۴۶ء
ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم (مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین) پٹیل میموریل لکچرز جو ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۴ دسمبر ۵۸ء کو دیے گئے۔ پبلکیشنز ڈویژن دہلی، ۱۹۶۲ء
شکھشا (ہندی)۔
ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۶۳ء
مرغی اجیر چلی۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

مضامین:

مکتوبات جرمنی (نرخ مبادلہ، صنعتی تعلیم)۔ 'جامعہ' جنوری ۱۹۲۳ء
راہِ عمل۔ برٹرنڈ رسل کی کتاب کے ایک باب کا ترجمہ 'جامعہ' اپریل ۲۳ء
السٹر کا خواب۔ 'جامعہ' مئی ۲۳ء
تعلیم اور آزادیٔ فکر۔ رسل کی کتاب سے ترجمہ۔ 'جامعہ' جولائی ۲۳ء
خالدہ ادیب خانم سے انٹرویو۔ 'جامعہ' ستمبر ۲۳ء
معاشیات۔ 'جامعہ' اپریل ۲۶ء
ہزار سالہ جرمن ادب۔ 'جامعہ' مئی ۲۶ء

چین میں اعلیٰ تعلیم ۔ 'جامعہ' مئی ۲۶ء

بردولی اور رعیت داری بند و بست ۔ 'جامعہ' جولائی ۲۶ء

مشرق و مغرب ۔ 'جامعہ' مارچ ۲۷ء

ترکی قوم پرستی اور اتحادِ تورانی ۔ 'جامعہ' مارچ ۲۸ء

آزادی ۔ 'جامعہ' جون ۲۸ء

قومی تعلیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ 'تعلیم و تربیت' (علی گڑھ)
جلد ۱ (۴) اکتوبر ۲۸ء

اشتراک ۔ 'جامعہ' فروری ۲۹ء

مذہب اشتراک کے بانی ۔ 'جامعہ' مارچ ۳۰ء

برطانیہ ۔ آئرستان ۔ جرمنی ۔ چین و جاپان ۔ 'جامعہ' اپریل ۳۲ء

چین اور منچوریا ۔ جاپان ۔ فرانس ۔ ...... 'جامعہ' مئی ۳۲ء

انگلستان، ایک اہم تقریر ۔ 'جامعہ' جنوری ۳۳ء

بین الاقوامی قرض ۔ جرمنی اور انقلاب ۔ 'جامعہ' مارچ ۳۳ء

انگلستان ۔ امریکہ اور معاشیاتِ عالم، ہٹلر کا پروگرام ۔ 'جامعہ' اپریل ۳۳ء

یوروپ اور آنے والی جنگ ۔ جرمنی ۔ اٹلی ...... 'جامعہ' اپریل ۳۳ء

دنیا کی رفتار ۔ ہندوستان ۔ جاپان اور ہندوستان ۔ انتقالِ غزن ۔ 'جامعہ'
جولائی ۳۳ء

معاشی کانفرنس ۔ روس اور سرمایہ دار ممالک ۔ 'جامعہ' جولائی ۳۳ء

معاشی کانفرنس ۔ جرمنی و آسٹریا ۔ جاپان ۔ 'جامعہ' ستمبر ۳۳ء

روس۔ تخفیفِ اسلحہ۔ 'جامعہ' دسمبر ۳۳ء

کساد بازاری۔ 'جامعہ' فروری ۳۴ء (اُردو اکیڈیمی میں ۹ دسمبر ۳۳ء کو ایڈریس)

امریکہ، روس اور جاپان۔ 'جامعہ' فروری ۳۴ء

جاپان۔ فرانس۔ آسٹریا۔ جرمنی۔ 'جامعہ' اگست ۳۴ء

جاپان، ایک دلچسپ دستاویز۔ 'جامعہ' جولائی ۳۵ء

حبش۔ عقابہ۔ ترکی ...... 'جامعہ' اگست ۳۵ء

حبش اور اٹلی۔ اسپین۔ یوگوسلاویہ ..... 'جامعہ' ستمبر ۳۵ء

قومی تعلیم کا نصب العین۔ 'جامعہ' ستمبر ۳۵ء (کاشی ودیا پیٹھ کا خطبۂ صدارت)

علم سیاست اور اجتماعی تباہی۔ 'جامعہ' اکتوبر ۳۵ء

فیسزم۔ 'جامعہ' اکتوبر ۳۵ء

جمعیت اقوام اور جنگِ حبش۔ نہر سوئز ..... 'جامعہ' اکتوبر ۳۵ء

جنگِ حبش۔ 'جامعہ' نومبر ۳۵ء

برطانیہ اور اٹلی وغیرہ۔ 'جامعہ' دسمبر ۳۵ء

اسپین۔ 'جامعہ' اپریل ۳۷ء

اٹلی، برطانیہ اور بحیرۂ روم۔ 'جامعہ' اپریل ۳۷ء

برطانوی وزارت میں تبدیلی۔ جاپان۔ سیاسی ملاقاتیں اور وسطی یورپ کی تنظیم 'جامعہ' جولائی ۳۷ء

کانگریسی وزارتیں ۔ 'جامعہ' ستمبر ۳۷ء
شمالی یوروپ ۔ 'جامعہ' ستمبر ۳۷ء
چین اور جاپان ۔ منگولیا کی خودمختاری ۔ روس اور چین کا معاہدہ ۔
'جامعہ' اکتوبر ۳۷ء
جامعہ ملیہ کیا ہے ؟ مقاصد اور پروگرام ۔ 'جامعہ' دسمبر ۳۸ء
یادگار حسینؑ (ریڈیو سے تقریر) ۔ 'جامعہ' اپریل ۴۲ء
ایک خطبہ (آگرہ یونیورسٹی ۔ ترجمہ) ماہ نامہ 'کتاب' (لاہور)
جولائی ۴۲ء
جنگ میں ایک برطانیہ کی غذا ۔ 'ہمدرد صحت' غذائیات نمبر (دہلی)
جولائی ۴۳ء
حکیم صاحب (حکیم اجمل خاں پر تعزیتی مضمون) ۔ 'جوہر' جوبلی نمبر ۴۶ء
ڈاکٹر انصاری (ریڈیو تقریر) ۔ 'جوہر' جوبلی نمبر ۴۶ء
حسینؑ اور انسانیت (ریڈیو سے تقریر) ۔ 'انجام' ویکلی (دہلی) ۴ر
دسمبر ۴۶ء
ہندو کشمیر کا ناطہ ۔ 'آج کل' (دہلی) دسمبر ۴۶ء
ہند کی مشترک زبان اردو ۔ 'تحریک' (دہلی) اکتوبر ۵۳ء
سعودی عربیہ (ترجمہ از اسٹیٹس مین ۲۶ر ستمبر ۵۶ء) 'مدینہ' بجنور
یکم اکتوبر ۵۶ء ۔
شخصیت کی تعمیر ۔ 'علیگ' (علی گڈھ) ۱۰ر جنوری ۵۷ء

علی گڈھ ۱۹۰۳ء کے بعد۔ ’علیگ‘ ۲۵ر جنوری ۵۸ء

ذکرِ حسینؑ۔ ’علیگ‘ ۵ر اگست ۵۸ء

مولانا ابوالکلام آزادؒ۔ ’آج کل‘ آزاد نمبر ۵۸ء ’نیا خواب‘
(رام پور) ۱۶ر فروری ۶۳ء (تقریر جلسۂ تعزیت
رام لیلا گراؤنڈ نئی دہلی ۲۳ر فروری ۵۸ء)

محبت، خدمت اور اقدار روحانی کی چاکری۔ ’نیا خواب‘ (رام پور)
۱۶ر فروری ۶۳ء (تقریر بموقعہ عرس حضرت نظام الدینؒ
دہلی ۱۷ر ستمبر ۶۲ء

تعلیم اور روایتی قدریں (مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین)۔ ’جامعہ‘ نومبر ۶۲ء

بہادر شاہ ظفر (مترجم ڈاکٹر عابد حسین)۔ ’جامعہ‘ دسمبر ۶۲ء

سیرت کی تعمیر۔ ’نگار‘ (رام پور) جنوری ۶۳ء

دل کے خون سے لکھی ہوئی تحریریں (مختلف پرانی تحریروں کے اقتباسات)
’نیا خواب‘ علی گڈھ نمبر

قومی جنگ کا ادبی محاذ۔ ’صبح‘ (دہلی) حصہ ۲-۱ ۶۳ء

جگرؔ کو خراج عقیدت (تقریر افتتاح گوشۂ جگر)۔ ’جامعہ‘ نومبر ۶۳ء

خطبۂ صدارت شبلی اکیڈیمی بموقعہ جوبلی۔ ’الجمعیۃ‘ دہلی ۲۳ر فروری ۶۵ء

گاندھی جی کا راستہ (خطبۂ گجرات ودیا پیٹھ)۔ ’جامعہ‘ نومبر ۶۷ء

سیرت اور کردار کی تشکیل۔ کتابی دنیا (کراچی) اگست ستمبر ۶۷ء

پیش لفظ و تعارف وغیرہ

تقریب رسالہ "جوہر" عبدالحق نمبر، مارچ ۴۰ء

تقریب "تعلیم اور سماج از سعید انصاری"، ۴۴ء

پیش لفظ "تاریخ مشائخ چشت از خلیق احمد نظامی"، ۵۳ء، ندوۃ المصنفین دہلی

حرف آخر "تعلیم کی نئی بنیادیں" از رودولف فریز مترجم شیخ غلام حسین، ۵۸ء مکتبہ جدید لاہور

دیباچہ "حسرت موہانی" از عبداللہ ولی بخش۔

پیش لفظ "گاندھی و نہرو کی راہ" از سید عابد حسین، ۶۱ء

خطبۂ افتتاحیہ نظام اُردو خطبات۔ ۶۶ء۔ دہلی یونیورسٹی

تعارف "ترجمان القرآن" از مولانا ابوالکلام آزادؒ، ۶۶ء ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی

پیش لفظ "نہرو نامہ" از ساغر نظامی ۶۷ء

WRITINGS OF Dr. ZAKIR HUSAIN
(Chronologically arranged)

Books :

Die Botachaft des Mahatma Gandhi, Voksrezeiher Verlag, Elfred Ehrentreich, 1924 (German)

Capitalism—Essays in Understanding (Lectures), Delhi University 1944, Asia Pub., Bombay. 1967.

Educational Reconstruction in India (Patel Memorial lectures delivered in Dec. 1958), Publications Division, 1959.

Ethics and the State (Mavlanker Memorial lectures) 1960.

Dynamic University, Asia Pub., Bombay, 1965.

Articles etc. :

Basic National Education—(Syllabus prepared by Zakir Husain Com., Wardha) All India Educ. Board 1938.

Are We Politically Disintegrating—a Symposium, 'Bhavan's Journal' No. 6, Oct. 9, 1966.

Thoughts on Education 'Bhavan's Jol.' No. 22, May 21, 1967

Enshrine Eternal Values in our Educatic
'Bhavan's Jol.' No. 16, Feb. 26, 1967.

Adult Education must be one of the Function of Universities, 'Indian Jol. of Adult Educ.' 28 (9), Sept. 67.

Education in a Democracy, 'Indian and Foreign Review' 3 (9), 4 (9) - 1967.

Strong & Beautiful Indian Home (Speech after assuing Presidency) 'Socialist Congressman' May 15, 1967.

Guest Editorial. 'Gandhi Marg' New Delhi, Vol. 12 (4) P. 321. 1968.

Pitfalls of Democracy, 'Bhavan's Jol.' No. 14, Vol. 14, Feb. 11, 1968.

Moral Awareness *in* "Mahatma Gandhi—100 years" ed. by Dr. Radha Krishnan, Gandhi Peace Foundation, New Delhi, 'Women on the March' Vol. 12 (10), Oct. 68, 'Socialist Congressman' New Delhi, Gandhi Centanary No., 15th Oct., 1968.

Nehru's Heritage 'Socialist Congressman' New Delhi, Nov. 19, 1968 (Indra Gandhi No.) P. 17.

کتابیات (ببلوگرافی)

(BIBLIOGRAPHY)

وہ کتابیں اور تحریریں جن سے
اس کتاب کی تیاری میں مدد لی گئی
یا جو ذاکر صاحب پر لکھی گئیں۔

کتابیں:

اشرف (ڈاکٹر کنور محمد) : ہندوستانی مسلم سیاست۔ نئی روشنی پرکاشن۔ نئی دہلی ۱۹۶۳ء

آل احمد سرور وغیرہ : شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا۔

اعظمی (عبد اللطیف) مرتب : ڈاکٹر ذاکر حسین، سیرت و شخصیت (مضامین کا مجموعہ جس میں پروفیسر مجیب، آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ کے مضامین شامل ہیں)

آزادؔ (مولانا ابو الکلام) : ہماری آزادی (ترجمہ انڈیا ونس فریڈم)

اکرام (شیخ محمد) : موجِ کوثر۔ فیروز سنز کراچی، ۱۹۵۸ء

بیدار (عابد رضا) مُرتب : نثر کا حُسن - میرے عہد کے صاحب طرز نثر نگار - ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۵۴ (تحریروں کے اقتباسات) رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز" ۶۸ء

بنیادی قومی تعلیم - رپورٹ واردھا کمیٹی. مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۳۸ء

پاٹھک (رادھے شیام) : آپ راشٹرپتی ذاکر حسین (ہندی)

جعفر حسین : ہندوستانی سماجیات - انجمن ترقی اُردو ۵۵ء

خانم (خالدہ ادیب) : اندرونِ ہند (ترجمہ اِن سائڈ انڈیا از ہاشمی) انجمن ترقی اُردو

صدیقی (رشید احمد) : مضامین رشید - مکتبۂ اُردو دہلی

______ : ذاکر صاحب - کتابی دنیا، دہلی

______ : آشفتہ بیانی میری. مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

______ : ہم نفسانِ رفتہ

______ : سہیل کی سرگذشت - نفیس اکیڈیمی حیدرآباد، ۴۷ء

عابد حسین (ڈاکٹر سید) : ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی

عبدالغفار (قاضی) : حیات اجمل

غلام السیدین (خواجہ) : آندھی میں چراغ

محمد سرور مرتب : مضامین محمد علی رح - مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۳۸ء

مدھولی (عبدالغفار) : جامعہ کی کہانی - مکتبہ جامعہ، ۶۶ء

مجلسِ نذرِ ذاکر : نذرِ ذاکر (مجموعۂ مضامین)، ۶۸ء

یوسف حسین خاں (ڈاکٹر) : یادوں کی دنیا - دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۶۷ء

مضامین :

احمد ضیاء : ڈاکٹر ذاکر حسین کا ادبی مرتبہ، 'کتاب' لاہور۔ جنوری ۱۹۶۲ء

ایڈیٹر (رسالہ 'علیگ' علی گڈھ) : ذاکر صاحب - رفتید و لے نہ از دلِ ما، ۱۰ ارستمبر ۱۹۵۸ء

احسن علی : ڈاکٹر ذاکر حسین 'ارشاد' حیدرآباد - مئی/جون ۱۹۶۷ء

امامی (محمد امام) : نقوش و تاثرات (مجموعہ مضامین) مضمون "ڈاکٹر ذاکر حسین" - انجمن ترقی اُردو بنگلور ۱۹۵۸ء

آل احمد سرور وغیرہ : شخصیات و واقعات .... مضمون آل احمد سرور

——— : ذاکر صاحب کی ادبی خدمات (در کتاب 'ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت') مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۱۹۶۷ء)

اعظمی (عبداللطیف) : صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین 'جامعہ' جون ۱۹۶۷ء

انصاری (سعید) : جامعہ کی ابتدائی زندگی - 'پیام تعلیم' نئی دہلی ذاکر نمبر، ستمبر ۱۹۶۷ء

اختر (ڈاکٹر ش) : صدر جمہوریہ کے نام کھلی چھٹی - 'مورچہ' گیا (بہار) ۲۳ نومبر ۱۹۶۸ء

تارا چند (ڈاکٹر) : ڈاکٹر ذاکر حسین - نذر عقیدت (در کتاب نذرِ ذاکر)

جاوید (سلیمان) : رشید احمد صدیقی کی مرقع نگاری - 'کتاب'

لکھنؤ دسمبر ۶۷ء
جی۔ایم۔خاں : ڈاکٹر ذاکر حسین پریسیڈنٹ آف انڈیا، ہندستانی
ادب، حیدرآباد۔ اپریل، مئی۔جون ۶۷ء۔
ذاکر صاحب بہ حیثیت معلم...... 'جوہر' دہلی ۳۵ء
ط۔پ۔ن۔س : شخصیات اپنے آئینے میں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔
'فروغ اردو لکھنؤ' اپریل ۶۸ء
صدیقی (رشید احمد) : یا دِ یار مہرباں آید ہمی 'مسلم یونیورسٹی گزٹ' ذاکر نمبر فروری ۵۷ء
——— : ذاکر صاحب 'جوہر' دہلی، جوبلی نمبر ۴۶ء۔
——— : موجۂ گل سے چراغاں ہے گذر گاہِ خیال۔ در کتاب
"نذرِ ذاکر" ۶۸ء 'نثر کا حسن' مرتب
عابد رضا بیدار ۶۸ء
——— : مرشد، در کتاب "مضامین رشید" (مجموعہ
مضامین) ص ۵۔ مکتبۂ اردو دہلی
——— : سیاحتِ برما۔ 'علی گڈھ منتھلی اگست ستمبر اکتوبر ۱۹۱۸ء
——— : خصوصیات گل منزل (کچی بارک)۔ 'علی گڈھ
منتھلی'... ۱۸-۱۹۱۷ء
صدر ذاکر حسین کا دورۂ سویت یونین (باتصویر فیچر) 'سودیٹ جائزہ
نئی دہلی ۲۰ر اگست ۶۵ء
عبدالماجد دریابادی: ذاکر صاحب کیسے بچے 'صدق جدید' لکھنؤ

'نیا خواب' رام پور۔ ۱۴ر مارچ ۱۹۶۳ء

عابد حسین (ڈاکٹر سید) : ذاکر صاحب 'نقوش' لاہور شخصیات نمبر ۱۹۶۳ء

———— : جامعہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک۔ 'جامعہ' دسمبر ۱۹۶۳ء

———— : ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ سے صدر جمہوریہ تک 'صبح' دہلی مارچ ۱۹۶۷ء

عبدالقیوم (شاہ) : ذاکر صاحب اور علی گڈھ۔ علی گڈھ میگزین، مجاز نمبر ۱۹۵۵-۵۶ء

قدوائی (عبدالسلام) : جامعہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک 'جامعہ' دسمبر ۱۹۶۳ء

قادری (عبداللہ ولی بخش) : جامعہ اور گاندھی جی 'جامعہ' اکتوبر ۱۹۶۵ء

———— : گاندھی جی بنیادی تعلیم اور ہم 'جامعہ' مارچ ۱۹۶۶ء

کیول دھیر : ایک عظیم شخصیت۔ 'پیام تعلیم' ذاکر نمبر

منظور حسن برنی : علی گڈھ نئے ہندوستان میں۔ 'علی گڈھ میگزین' مجاز نمبر ۱۹۵۵-۵۶ء

مجیب (پروفیسر محمد) : ذاکر صاحب اور تعمیر جامعہ در کتاب "نذرِ ذاکر" ص ۵۵، 'کتاب نما' نئی دہلی نومبر ۱۹۶۸ء

———— : ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ایک خاکہ۔ 'جامعہ' جون ۱۹۶۷ء

مالک رام : ڈاکٹر ذاکر حسین 'صبح' دہلی۔ اگست ۱۹۶۵ء

مجیب (آصفہ) : ذاکر صاحب 'پیام تعلیم' ذاکر نمبر ستمبر ۱۹۶۷ء

مجیب احمد خاں : جہاں ذاکر صاحب رہتے ہیں۔ 'پیام تعلیم' ذاکر نمبر۔

نقوی (غلام حیدر) : ہڈی کی پلیٹ "پیامِ تعلیم" ذاکر نمبر

یوسف حسین خاں (ڈاکٹر) : ذاکر میاں در کتاب "نذرِ ذاکر"

رسالے اور اخبارات :

'جامعہ' نئی دہلی - مکمل فائل

'جوہر' نئی دہلی - جوبلی نمبر ۳۵ء

'نقوش' لاہور - شخصیات نمبر

'سروج' دہلی - جون ۶۷ء

'کتاب نما' نئی دہلی - مکمل فائل

'ہماری زبان' علی گڑھ ۵۲ء تا ۵۷ء

'فروغِ اُردو' لکھنؤ۔

'علی گڑھ میگزین' علی گڑھ ۵۲ء تا ۶۲ء

'صدق جدید' لکھنؤ مکمل فائل از ۵۰ء تا ۶۵ء

'پیامِ تعلیم' نئی دہلی - ذاکر نمبر - ستمبر ۶۷ء

'مسلم یونیورسٹی گزٹ' ذاکر نمبر - فروری ۵۷ء

'علیگ' علی گڑھ - ۵۷-۱۹۵۶ء

'نیا خواب' رام پور ۶۳-۱۹۶۲ء

'علی گڑھ منتلی' علی گڑھ ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۹ء

'روزنامہ' 'الجمعیۃ' دہلی - مکمل فائل

'دعوت' دہلی - ۶۰ء

'ترجمان' علی گڈھ ۱۹۵۶ء

'پرتاپ' نئی دہلی ۔ مکمل فائل

'ہندوستان' (ہندی) نئی دہلی ۔ ۱۰ مئی ۱۹۶۷ء

'ملاپ' نئی دہلی ۔ مکمل فائل

بھارت ٹائمز (ہندی) نئی دہلی ۔ ۱۰ مئی ۱۹۶۷ء

Indian Jol. of Adult Education, June 1967.

Indian Express, N. Delhi, 1965–68.

Indian and Foreign Review, Delhi, 1963–68.

Indian Architect, New Delhi, July-Aug. '67.

Link, N. Delhi, 1959–68.

Main Stream, N. Delhi, 1963–68.

Muslim World, Hartford (U. S. A), 1957–68.

National Diary, Calcutta, 1963–68.

National Herald, Lucknow, 1967.

News Week, New York (U. S. A.), 1967–68.

Orbis, Philadelphia (U. S. A.), 1966–68.

Organiser, N. Delhi 1967–68.

Pacific Affairs, Univ. of British Columbia, Canada 1966–68.

Round Table, London, 1962–68.

South Asian Studies, Jaipur, 1967–68.

Thought, Delhi, 1965–68.

Times of India, New Delhi, 1965–68.

Times, London, 1965–68.

Time Magazine, New York, 1912–68.

Week end Review, New Delhi, 1967–68.

Periodicals and Newspapers :

Asian Recorder, New Delhi, 1962 – 68.

Asian Almnac, Johre Bahru, 1966 – 67.

Asia and Africa Review, London, 1967 – 68.

Asian Review, London, 1965 – 68.

Bhavan's Journal, Bombay, 1962 – 68.

Bombay Civic Journal, Bombay, 1962 – 68.

Cairo Review, New Delhi, April to June 1967.

Dawn, Karachi, May 1967.

Economic Times, Bombay.

Enlite, Baroda, 1967 – 68.

Foreign Affairs, New York, 1965 – 68.

German News Weekly, N. Delhi, 1967—68.

Guide to Indian Periodical Literature, Prabhu Book Service Gurgaon, Vol. 4, 1967.

Hlndu, Madras, 1967 – 68.

Hindustan Times, N. Delhi, 1962 – 68.

India Indexed, 1967 – 68.

Indian Press, Index, Delhi, 1968.

——————: Muslim Education in India at the Cross-roads ; The Case of Aligarh, 'Pacific Affairs' V. 39 (1-2), Spring-Summer, 1966.

——————: Muslim Legislators in India, 'Jol. of Asian Studies' V. 23 (2), Feb. 64.

ZAIDI (BH) : Quest for Excellence, 'Hindustan Times' 6 . 5 . 67.

SARKAR (Chanchal); Growth towards Secularism, (Paper in Symposium on Secularism ed. by G. S. Sharma 1966). 'Conspectus' N. Delhi. V. 2 (1), 1966.

SAIYDAIN (KG): Zakir Husain, 'Indian and Foreign Review' Delhi, 15 . 5 . 67, 'Hitwada' Nagpur, 5 . 5 . 67.

——————: The Thinker in Zakir Husain 'Patriot' New Delhi...Apl. '67.

SHELVANKAR (KS): Dr. Husain's Election Hailed in U K., 'Hindu' Madras, 11 . 5 . 67.

SMITH (WC): Ulema in Indian Politics, *in* "Politics and Society in India" Allen and Unwin, ed. by C.H. Philips, 1963.

SPEAR (IG): Position of Muslims in India, *in* "India and Ceylon" ed. by P. Mason, Oxford, 1967.

TARAPORE (Khurshid): Dr. Zakir Husain, 'Indian Express' New Delhi, 16 . 3 . 67.

VEROHEESE (BG): Muslims in India. Times of India' 12 . 8 . 65.

WRIGHT (Theodore P. Jr.): Effectiveness of Muslim Representation in India *in* "South Asian Politics and Religion" ed. by D. E. Smith, 1966.

KAMALI (SA) : Muslims in India Since Partition, 'Muslim World' 45 (1) Jan. 1955.

K. C. S. : President and his powers, 'Indian Express' 1 . 6 . 67.

LAKSHMI NARAIN : India's New President, 'Asia Student' 20 . 5 . 67.

MORRIS–JONES (WH) : The Indian Election, Round Table, No. 227, July 67.

MUJEEB (Prof. M) ; President Zakir Husain, 'Illustrated Weekly' New Delhi, 88 (28), 13 . 8 . 67.

NOORANI (AG) : The Aligarh Affairs, 'Indian Express' 4 . 9 . 65.

PARASURAM (TV) : Husain's Election Adds to India's Stature, 'Indian Express' New Delhi, 23 . 5 . 67, 'Indian Marxist' New Delhi, June '67.

RAMASWAMI (EK) : Humble Servant in New President 'Hindu' Madras, 15 . 5 . 67.

RANGASWAMI (K) : Zakir Husain May be Elected with a Fair Majority, 'Hindu' Madras, 2 . 5 . 67.

————. Another Great Gentleman in Rashtrapati Bhavan, 'Thought' Delhi. 13.5.67

EDITORIALS of 'Statesman' 10 . 5 . 67.
'Public Cooperative Jol.' June 67,
'Hindustan Times' 10 . 5 . 67,
'Indian Express' 10 . 5 . 67.

GARG (RK) : Independent President. 'Free Press Jol.' Bombay, 6 . 5 . 67.

GHOSH (A) : Zakir Husain should never had been Elected V. President. 'Organiser' 21 . 5 . 67.

GUPTA (Sisir) : Muslims in Indian Politics 1947-60, India Qly.' New Delhi, Oct.-Dec. 1962, P. 359.

HAFEEZ MALIK : Islam in Politics, 'Muslim World' 56 (4), 1966. P. 246—49.

HARISON (Salig S) : Troubled India and her Neighbours 'Foreign Affairs' New York, Jan. 1965.

HIRANYAPPA (GS) : New President's Opportunity, 'Hindu Weekly Rev.' 29 . 5 . 67.

IQBAL NARAIN : Fourth General Elections and the Indian Political System, 'South Asian Studies' July 67.

———————; Wishing New President Well, 'New Age' 15 (20), 14 . 5 . 67.

———————; Some thoughts on the New President and Vice President, 'Organiser' N. Delhi, 21 . 5 . 67.

———————: Beware of Zakir Husain. 'Organiser' 20 (38), 7 . 5 . 67.

———————: Congress—J. S. Correspondence on Organiser and Dr. Zakir Husain; text of Letters, 'Organiser' 20 (38). 7 . 5 . 67.

———————: Consequences of Dr. Husain's Election, 'Organiser, 20 (38), 7. 5 . 67.

———————: Country will not be safe in Zakir Husain's Hands, 'Organiser' 20 (38).

———————: Crushing Reply to Zakir Husain, 'Organiser' 20 (37), 30 . 4 . 67.

———————: Dr. Joshi's Murder Case, 'Organiser' 20 (36), 23 . 4 . 67.

———————: Moving Fingers Write, 'Organiser' 20 (36), 23 . 4 . 67.

———————: Cassandras Beware, 'Thought' Delhi Vol. 19 (17), 19 . 4 . 67.

———: U.A.R. Hails the New Indian President 'Cairo Review' New Delhi, May 67.

———: New Era of Communal Harmony, 'Capital' 158 (3961), 18 . 5 . 67.

———: New President, 'Economic Times' Bombay, 10 . 5 . 67.

———: The President's Complaint, 'Hindu' Madras, 4 . 9 . 67.

———: Adult Educator Became President, 'Indian Jol. of Adult Education' 28 (6), June 67.

———: President Zakir Husain, 'Illustrated Weekly' 4 . 6 . 67.

———: President—an Eminent Educationist, 'Indian Worker' 15 . 5 . 67.

———: Nomination Story, 'Link' New Delhi, 9 (36), 16 . 4 . 67.

———: Presidential Candidates, 'Link' New Delhi, 9 (38), 30 . 4 . 67.

———: Presidential Contest, 'Link' 9 (37), 23 . 4 . 67.

———; Reshuffle, 'National Herald' Lucknow, 12 . 5 . 67.

Articles :

ASA : Zakir Husain, 'Times of India' N. Delhi, 9 . 4 . 67

ALTBACH (Philips G) : Indian Political Scene on the Eve of 1967 Elections, 'Orbis' Vol. 10 (3), Fall 1966.

CHAKRAVARTY (N) : Turn in the Tide for Indra, 'Main Stream' New Delhi, 20 . 5 . 67.

CHAWLA (SK) : India's Next President, 'Statesman' 15 . 2 . 67.

CHANDA (Ashok) : Implications of Non Congress Regimes in Some States—Contest for Presidency, 'Statesman' 27 . 4 . 67.

CHOKSI (Prabod) : India's Next President, 'Statesman' 15 . 2 . 67.

CHANDA (A) : President's Dynamic Role in Nation's Life, 'Hindustan Times' 6 . 5 . 67.

DIWAKAR (RR) : Dr. Zakir Saheb, 'Bhavan's Journal' Feb. 11, 1968.

DURGA DAS : Resounding Victory for Democratic Ideas, 'Tribune' Ambala, 16 . 5 . 67.

EDITOR: India's Choice, 'Asia and Africa Review' London, June 67.

SAIYDAIN (KG) : Humanist Traditions in Indian Education, Asia, 1966.

SHARMA (GS) Ed. : Secularism, its Implications for Law and Life in India—A Symposium. Tripathi and Co., Bombay, 1966.

SHARMA (J) : Indias' Struggle for Freedom (Annotated arrangement of source material), Vol. 2, 1962.

SIQUEIRA (TN) : Education of India, 1962.

SITARAMAYYA (BP): History of Indian National Congress, 2 Vols. 1947.

SMITH (DE) Ed. : South Asian Politics and Religion, Princton University, 1966 (Article of Theodore P. Wright Jr. "Effectiveness of Muslim representation in India").

——————— : India as a Secular State, Princton, 1963.

SMITH (WC) : Islam in Modern History.

SRI PRAKASH : State Governors in India, Meenakoli, Delhi, 1969.

TENDULKAR (DG) : Mahatma, 8 Vols. 1951.

WILLIAMS (LFR) : India in 1920—A Report Prepared for Presentation to Parliament, 1921.

ZAKI ALI : Islam in the World, 1938.

ZAKIR HUSAIN PRESENTATION VOL. on his 71st. Birthday, 1968.

MASON (P) Ed. : India and Ceylon, Oxford, 1967. (Article of I. G. Spear "Position of Muslims").

MOTT (JR) : Muslim World of to-day, 1925.

MUJEEB (M) : Indian Muslims, Allen and Unwin, London, 1967.

MUKERJI (SN) : Education in India in 20th Century, 1945.

NOORANI (AG) : President Zakir Husain ——Quest for Excellence, Hind Pocket Books, Delhi, 1967.

PARS RAM : A UNESCO Study of Social Tensions in Aligarh 1950-51, New Order Book Co., Ahmedabad, 1955.

PHILIPS (CH) Ed : Politics and Society in India, Allen and Unwin, 1963. (Article of W. C. Smith "Ulema in Indian Politics").

PRESIDENT ZAKIR HUSAIN IN USSR 'Soviet Rev.' Vol. 5 (56), 10 . 8 . 68.

PYARE LAL : Mahatma Gandhi, 2 Vols., Navjeevan, Ahmedabad, 1956.

QURESHI (IH) : Muslim Community of Indo-Pak Subcontinent, 1962.

RAJINDRAPAL SINGH : Zakir Husain—Dynamics of Indigenous Education, Sterling, Delhi, 1968.

BIBLIOGRAPHY AND REFERENCES

Books :

ABDUL AZIZ : Islamic Modernism in India and Pakistan 1857-1964, Oxford Univ. Press, 1967.

ABID HUSAIN (Dr, S) : Destiny of Indian Muslims, Asia Pub., Bombay, 1965.

ALIGARH M. U. ENQUIRY COMMITTEE Report, M. U. Press, Aligarh, 1961.

ASHE (Geoffrey): Gandhi—A Study in Revolution, Asia Pub., 1968.

CHISHTI (Anees) : President Zakir Husain——A Study, Rachna Prakashan, New Delhi, 1967.

EDIB (Halide) : Inside India, Allen and Unwin, London, 1937.

HAFEEZ MALIK : Muslim Nationalism in India and Pakistan, 1963.

HASSNAIN (SE) : Indian Muslims—Challenge and Opportunity, Lalvoni Pubr., Bombay, 1968.

LUTHERA (V. P.) : Concept of Secularism and India, 1964.

انڈیکس (اشاریہ)

نوٹ: اس انڈیکس میں ذاکر صاحب کا نام شامل نہیں ہے، اس کے علاوہ نسبتاً غیر ضروری نام چھوڑ دیئے گئے ہیں۔